اقرار کا موسم

رخسانہ نگار عدنان

اقرار کا موسم

''شرم نہیں آتی تم لوگوں کو یہاں پھسکڑا مارے بیٹھی ہو اور ادھر واش رومز کا حال دیکھا ہے بدبو اور گندگی، اس بات کی تنخواہ ملتی ہے تمہیں۔

صبح کو آکر سرسری سا جھاڑو پونچھا کرو اور پھر سارا دن بیٹھ کر گپیں ہانکو۔ حلال کر کے کھانا سیکھو، حرام مت کھاؤ۔ ایک ایک کو کان سے پکڑ کر باہر کردوں گی۔ یہاں یہ ہڈحرامیاں نہیں چلیں گی۔ آدھے گھنٹے میں مجھے سارے ٹوائلٹ، واش روم، چمکتے ہوئے ملنے چاہئیں ورنہ میرے پاس آنے کی ضرورت نہیں۔ سیدھا کیشیر کے پاس جا کر اپنا حساب لینا اور یہ باہر کا رستہ ہے۔ انڈراسٹینڈ۔'' وہ غصے میں لال بھبھو کا چہرہ لیے بولتی چلی گئیں۔

اور وہ تینوں جو صبح سے مسلسل کام کے بعد دو گھڑی ستانے اور اپنے ساتھ لائی ایک ایک روٹی کی پوٹلی کھولے پیٹ کی آگ بجھانے ہی لگی تھیں کہ ڈاکٹر ندرت عزرائیل بنی ان کے سر پر آموجود ہوئیں۔

''مذاق بنایا ہوا ہے کام کو۔ مجال ہے جو یہاں ایک بھی شخص اپنے فرض یا ذمہ داری کے بارے میں سنجیدہ ہو۔ کچھ ہی خوف فرض کی انجام دہی کا رکھتا ہو۔ سب کو مردار کھانے کی لت لگی ہے۔ ہاتھ پیر ہلیں نہ اور تنخواہ پوری ملے ہونہہ!'' وہ اسی طرح منہ میں بڑبڑاتیں چھوٹی سی ہیل والی براؤن جوتی بجاتی آگے نکل گئیں۔

اور یہ سارا شاخسانہ اس نامراد جوتی کا ہی تھا۔

ڈاکٹر ندرت ہمیشہ مردانہ سینڈل ٹائپ یا لیڈیز فلیٹ نرم لیدر کے بغیر ہیل والے جوتے پہنتی تھیں اگرچہ ان جوتوں کی خباثت بھی کچھ کم ان کے سٹاف پر قیامت بن کر نہ ٹوٹتی تھی پتا ہی نہیں چلتا تھا کب وہ ان کے سر آ موجود ہوتیں۔ نہ قدموں کی آہٹ نہ لباس کی کوئی سرسراہٹ، دور سے ان کی آمد کا اعلان کرتی مسحور کن خوشبو، کچھ بھی تو ایسا نہ تھا جو ان کے عملے کو چوکنا کرنے میں ان کی مدد کرتا وہ تو کسی موت کے فرشتے کی طرح عین اس کی گدی یا شہ رگ کے قریب نازل ہوتیں اور اس کے بعد...... اس کے بعد جو ہوتا وہ واقعی دل میں دعا کرتے کہ اس گھڑی موت کا فرشتہ ہی ان کی مدد کو لپک آتا وائے قسمت غریب کی ہر دعا بلکہ کوئی بھی دعا کب پوری ہوتی ہے۔

اور آج ان کی چھوٹی سی ہیل والی یہ تقریباً فلیٹ جوتی شیراں اور اس کے گروپ کے لیے مصیبت بن گئی بائے چانس ان تینوں میں سے صرف نصیباں کا سامنا صبح ڈاکٹر ندرت سے ہوا تھا وہ بھی جب وہ اپنے آفس بیٹھی تھیں اس نے بھی نہیں دیکھا کہ وہ آج ایک بالکل مختلف جوتی پہن کر آئی ہیں ورنہ وہ اپنی ساتھیوں کو مطلع ہی کر ڈالتی قدموں کی ہلکی چاپ پر وہ تینوں یہ سمجھیں کہ کسی پیشنٹ کی کوئی اٹینڈنٹ ہوگی یا کوئی نرس مگر۔

''تو یہ اس عورت کے سینے میں دل کی جگہ شاید پتھر ہے وہ بھی چاروں طرف سے نوک دار جس طرف بھی رخ کرے اگلے کو چھلنی کر ڈالے۔''

وہ کاریڈور کی طرف مڑ چکی تھیں اور قدموں کی آہٹ دور جاتی ہوئی محسوس ہوئی تو رفیقہ بے ساختہ بولی تھی۔

اور ان دونوں نے دوبارہ ''بالکل بالکل'' کہہ کر اس کی پرزور تائید کی تھی۔

اور انہیں نہیں معلوم تھا کہ ڈاکٹر ندرت آگے نہیں گئیں سامنے سے آتے وارڈ بوائے طلعت کی کلاس لینے کے لیے وہیں لمحہ بھر کو رکی تھیں۔

''اس عورت کے سینے میں دل کی جگہ شاید پتھر ہے، پتھر ہے...... پتھر ہے۔''......

انہیں کسی بت کی طرح ساکت وہاں کھڑے یونہی لگا ان کے اردگرد پتھر ہی تو برسنے لگے ہیں۔ نوکیلے تیکھے چھید دینے والے پتھر...... اور ان کی ہر ضرب سے ایک ہی آواز نکل رہی ہو۔

''اس عورت کے سینے میں دل کی جگہ پتھر ہے...... پتھر ہے۔''

وارڈ بوائے طلعت کب چوروں کی طرح سر جھکائے آنکھیں اپنے قدموں پہ

گاڑے بے آواز مگر سبک رفتاری سے گزر بھی گیا اور انہوں نے جو اس کو ٹھیک ٹھاک وارڈ کی صفائی پر لیکچر پلانا تھا سب کہیں ان مٹ سا ہو گیا۔

بس ایک ہی سنگسار کر دینے والے جملے نے ان کو اسی جگہ باندھ کر جیسے لہولہان کر ڈالا۔

وہ وہاں کھڑے کھڑے ڈاکٹر ندرت نہ رہیں ایک مجروح؟ مضروب، مجبور، محروم عجیب قابل رحم، خودترس سی عورت بن گئیں شاید وہ اپنی حالت کا احساس کر کے وہیں پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیتیں کہ کوئی ان کے پاس آ کر چپکے سے کھڑا ہو گیا تھا انہوں نے جیسے ایک زمانے کے بعد اپنی بھاری بوجھل پلکیں اٹھائیں۔

''چلیں ڈاکٹر! کیس ریڈی ہے، ہمارے پاس ٹائم کم ہے۔'' ڈاکٹر نیلم نے انہیں دیکھتے ہوئے پروفیشنل لہجے میں کہا تو انہوں نے یوں چونک کر دیکھا جیسے پہلی بار دیکھ رہی ہوں ان کے اردگرد دودھیا سنگی برآمدہ اور دیواریں بالکل شفاف تھیں کہیں بھی ان کے لہو کا ایک قطرہ نہیں تھا۔

اور جو ابھی وہ لہولہان ہو رہی تھیں ان نوکیلے پتھروں کی سنگساری سے وہ کیا ہوا؟

وہ واقعتاً حیران نظروں سے اِدھر اُدھر اپنے ہی لہو کو تلاش کر رہی تھیں، نامحسوس طریقے سے انہوں نے اپنے دونوں کندھوں اور سینے کو چھوا۔

''کیا ہوا ڈاکٹر...... آر یو آل رائٹ؟'' ڈاکٹر نیلم دو قدم چل کر پلٹیں ڈاکٹر ندرت وہیں کچھ عجیب سے تاثرات چہرے پر لیے کھڑی تھیں۔

''ہوں چلو۔'' وہ جیسے ہوش میں آ گئیں۔

''میرے سینے میں تو دل کی جگہ پتھر ہے تو پھر پتھر سے خون کیسے نکل سکتا ہے میں بھی احمق ہوں بالکل نادان بھلا پتھروں سے بھی خون نکل سکتا ہے۔'' وہ خفیف سی استہزائیہ مسکراہٹ سے سر جھٹک کر آگے بڑھ گئیں۔

مگر پہلا قدم اٹھاتے ہی انہیں محسوس ہوا ان کے لیے اب آگے چلنا اتنا آسان نہیں رہا پچھلے رکے ہوئے قدم نے ان کے بدن کی ساری توانائیاں نچوڑ لی ہیں اب جو چل رہا ہے، وہ زندہ ڈاکٹر ندرت نہیں بلکہ ڈاکٹر ندرت کی لاش ہے۔

اور لاش کو گھسیٹنا آسان تو نہیں ہوتا یہ انہیں پہلا قدم اٹھانے کے بعد احساس ہوا تھا ان سے یہ لاش گھسیٹی نہیں جا رہی تھی۔

☆

''اپنی صحت دیکھی ہے تم نے؟'' پیڈ پین آگے رکھے کچھ بھی لکھے بغیر ڈاکٹر ندرت نے سامنے بیٹھی کمزور چہرے اور بد وضع جسم والی عورت کو دیکھا جس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے تھے اور پورے چہرے پر گہری چھائیاں ہونٹوں کا رنگ کہیں کہیں سے سیاہ اور کہیں سے جامنی سا تھا سرخی کی بوند نہ اس کے ہونٹوں کی رنگت میں دکھائی دے رہی تھی نہ چہرے یا جسم کے کسی اور حصے میں، عورت نے قدرے شرمندہ سا ہوکر بے بسی سے گردن جھکا لی۔

''کیا اس طرح سر جھکا کر مسکین سی بے بسی کا اعتراف کرلینا کافی ہے۔'' اس کے سر جھکا دینے پر وہ اور بھی چراغ پاسی ہوگئیں۔

''تو کیا کروں ڈاکٹر صاحب کھاتی تو ہوں جو ملتا ہے۔'' وہ کوفت بھرے لہجے میں بولی۔

''ہاں کھاتی ہوگی میں کب کہتی ہوں فاقے کرتی ہو پر ایسی ناقص اور ناکافی خوراک کھانے سے اچھا ہے تم فاقے کر کے اپنی جان اور اس آنے والی جان پر رحم کھا کر پھانسی چڑھ جاؤ غضب خدا کا ایچ بی لیول دیکھو اپنا، کہاں سے خوراک ملے گی اسے اور تمہارے اپنے جسم کو، ارے جو اس نئی جان کو پیدا کرنے کا ذمہ دار ہے اس کے دنیا میں آنے سے پہلے ہی ہر فرض سے بری الذمہ ہوگیا۔ محض اپنی وقتی خوشی کے نتیجے سے اسے کوئی غرض نہیں اور تم مجھے بتاؤ روبینہ بی بی پہلے اللہ نے تمہیں چار جی دے رکھے ہیں ان کی سب ضرریات ساری خواہشات پوری کرلیتی ہو جو اس پانچویں کی ذمہ داری بخوشی اٹھانے پر تیار ہوگئیں۔''

وہ اب قطعاً بھی اسے بخش دینے کے موڈ میں نہیں تھیں اس نے بچاؤ کے لیے اِدھر اُدھر سر گھمایا بائیں طرف کھڑی اس کا بی پی نوٹ کرتی نرس لبوں پر آئی خفیف سے مسکراہٹ دبا کر اس کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھنے لگی۔

''اب کیا کریں ڈاکٹر صاحب! بندے کے آگے تو زور نہیں چلتا نا۔''

وہ اسی مسکین سے لہجے میں سر جھکا کر بے بسی بھرا اعتراف کرتے ہوئے بولی۔

''ماشاء اللہ کیا دلیل ہے اپنی جہالت اور نادانی پر پردہ ڈالنے کی، کچھ تو آئیں گی اور بڑے بھولپن سے فرمائیں گی ڈاکٹر صاحبہ کیا کریں پتا ہی نہیں چلا اور آخر میں ایک ہی رٹا رٹایا جملہ، جی اللہ کی دین ہے اور جس روح کو وہ دنیا میں لانے کا فیصلہ کرلیتا ہے اس سے کوئی کیسے بچے۔''

وہ اشتعال بھرے لہجے میں میز پر ہلکا سا مکا مار کر بولیں۔

''ارے اللہ کی بندیوں خود پر نہ سہی اس ملک پر رحم کرو یہ اتنا بوجھ اتنی خوف ناک ہوش ربا انداز میں بڑھتی ہوئی آبادی کو زمین، خوراک، چھت دینے کے قابل نہیں ہے کیوں اسے بھرے جہان میں عبرت گاہ بنانے پر تم سب جاہلوں نے کمر باندھ لی ہے اور روبینہ بی بی دیکھا ہے تم نے اتنا لو ہے کسی دن بس یونہی منہ سے بھاپ نکالے بغیر چل پڑو گی تو ان چاروں کو دیکھنے بھالنے والا کون رہے گا وہی بندہ جس کے آگے تمہارا زور نہیں چلتا تم مر گئیں تو وہ کیا کچھ نہیں کر ڈالے گا۔ کبھی سوچا تم نے۔''

ان کا بس نہیں چل رہا تھا اپنے سامنے بیٹھی اس کمزور مدقوق اور بے بس سی عورت کو اٹھا کر باہر پھینک دیں۔

''ہر روز نئے سے نیا طریقہ مارکیٹ میں متعارف ہو رہا ہے چلو تعداد کم کرنے پر راضی نہیں کچھ وقفہ تو پیدا کرو کچھ اپنی جان پر رحم کرو تم بچو گی زندہ تو اور بچے پیدا کرو گی بہرحال میں تو تم سے گزشتہ دو سالوں سے سر پھوڑ رہی ہوں چلو پہلے ایک دوبار ہوتا ہے بندہ نادان ناسمجھ ہوتا ہے اگرچہ میں اس مصنوعی ناسمجھی کو بھی نہیں مانتی پر دو بچوں کے بعد تو ہوش کرنا چاہیے تم خود بتاتی ہو کہ تمہارے میاں کی آمدنی اتنی نہیں کہ تم دو جی تو کیا فقط ایک بچے کی ہی ڈھنگ سے پرورش کرسکو۔ کہاں پانچ۔ اب بتاؤ کیا کروں تمہارے اندر خون کی شدید کمی ہے اور جیسی کنڈیشن ہے اگر عین وقت پر آکر آپریٹ کرنا پڑ گیا تو تم سوچ نہیں سکتیں۔

تمہارا یا تمہارے بچے کا بچنا کسی معجزے سے کم نہیں ہوگا کیلشیم وہ نہ تمہارے جسم میں ہے نہ ہڈیوں میں بچے کو کیا دو گی اب کس کس کمی کے لیے میں وٹامن اور سپلیمنٹس لکھ کر دوں خوراک، اچھی خوراک کا نعم البدل ہزار طرح کے وٹامنز میں بھی نہیں ہے۔ تمہارے والدین ہیں؟'' وہ اب تھکے تھکے نڈھال سے لہجے میں بول رہی تھیں۔

''جی والدہ ہیں۔''

''چند ہفتوں کے لیے ان کے پاس چلی جاؤ تھوڑا آرام اور اچھی خوراک اگر تمہیں مل جائے تو صورت حال کچھ بہتر ہوسکتی ہے۔

وہ اب ڈھیلے ڈھالے انداز میں پیڈ پر دوائیاں لکھ رہی تھیں۔

''جی کیسے جاسکتی ہوں ادھر بچوں کی دیکھ بھال کون کرے گا پھر میری والدہ......''

''دیکھا نصرت حال تم نے ان شوہروں کا'' وہ ہاتھ روک کر پاس کھڑی نرس سے جلے کٹے انداز میں بولیں ''بچے پیدا کرنے میں ان سے بڑا مہربان کوئی نہیں اور سنبھالنے کی

بات آئے تو ان سے زیادہ انجان معصوم اور بے بہرہ کوئی نہیں، بھلا بتاؤ کیا یہ بچے اکیلی عورت کے ہوتے ہیں پیدا کرتے ہوئے بھی اپنی اکیلی جان پر سو عذاب جھیلے نو مہینوں کا ایک بھی کڑا دن ان مردوں کے حصے میں آجائے تو ان کے ہوش ٹھکانے لگ جائیں کہ کوئی بچے پیدا کرنے کیا، سوچنے کی بھی جرأت نہ کرے۔

عورت پیدا کرے سنبھالے اور جب خدانخواستہ ......نسل کی بقا کی حفاظت کے دوران اگر اس بے چاری عورت کی جان تختہ مشق بننے لگے تو ان مردوں سے بڑھ کر کوئی طوطا چشم نہیں۔ چھوڑ جاؤ بچوں کو میاں کے پاس اور خود ماں کے پاس دو چار ہفتے رہ آؤ تمہارے میاں کو شاید تمہاری جان سستی لگے پر یقین کرو ماں تمہاری بہت پروا کرے گی۔ تمہارے بچے کی ڈلیوری کے لیے نہیں صرف تمہاری ذات کی غرض کے لیے، ماں سے بڑھ کر کوئی ہمدردی نہیں کرسکتا زندہ رہنا چاہتی ہو تو میرے مشورے پر سوچنا ہی نہیں عمل بھی کرنا۔"

اب کے انہوں نے تیز تیز بولتے ہوئے پیڈ پر تین چار دوائیوں کے نام گھسیٹے اور نسخہ اس کی طرف بڑھا دیا۔

"وہ نہیں مانیں گے جی۔" وہ مری ہوئی آواز میں بولی۔

"ظاہر ہے جسے چوبیس گھنٹے کے لیے مفت کی نوکرانی ملی ہو وہ کیوں مانے گا میرا کام تمہیں سمجھانا مشورہ دینا اور خطرے سے آگاہ کرنا تھا آگے تمہاری مرضی اور دیکھو یہ دوائیاں کچھ نہیں کریں گی۔ جب تک ان کے ساتھ مناسب خوراک دودھ، گوشت بالخصوص پھل، تازہ سبزیاں سلاد کی شکل میں نہیں لوگی، زندگی ایک بار ملتی ہے اور ہمارے ہاں تو عام دستور ہے بلکہ روایت، لوگ آخری عمر میں جا کر اپنے گناہ بخشوانے کا سوچتے ہیں یوں بھری جوانی میں بھرا پڑا میلہ چھوڑ کر جانے کو کسی کا بھی دل نہیں کرتا اپنے دل کی کم از کم اس خواہش کی پروا ضرور کرنا کہ تمہارے بچوں کو صرف تمہاری ضرورت ہے پالنے والی کسی بھی عورت کی نہیں۔"

انہوں نے کرسی سے سر لگاتے ہوئے آہستہ آہستہ دھیمی سی آواز میں کہتے ہوئے گویا اسے جانے کا اشارہ دیا۔ اسی وقت دوسری پیشنٹ اندر داخل ہوئی۔

روبینہ سر نہوڑائے کمر کو ہاتھ کا سہارا دیتی گہرے گہرے سانس لیتی آہستہ آہستہ باہر کی طرف چل دی۔

"کیا کہا ڈاکٹر صاحبہ نے؟" سسٹر نئی پیشنٹ کو سائیڈ روم میں چیک اپ کرانے

کے لیے بیڈ پر لٹا رہی تھیں۔ دروازہ ذرا سا کھلا رہ گیا تھا ڈاکٹر ندرت پیشنٹ کو چیک کرنے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"کہتی ہیں، کمزور بہت ہو۔ بچوں کو چھوڑ کر کچھ دنوں کے لیے امی کی طرف چلی جاؤ آرام اور اچھی خوراک کی ضرورت ہے۔" معلوم نہیں روبینہ کے ساتھ اس کا میاں تھا کہ ساس جسے وہ یہ سب بتا رہی تھی۔

"ارے یہ ڈاکٹر تھوڑی ہے پتھر ہے جیسا سنا ویسا پایا والا حال ہے اب بھلا بتاؤ ایک ماں کیسے بے دردی سے اپنے بچوں کو یوں خدانخواستہ لاوارثوں کی طرح چھوڑ کر اپنی جان بنانے ماں کی طرف چل پڑے توبہ توبہ ان کے مشوروں پر عمل کرنے لگیں تو ساری دنیا تھو تھو کرے گی نہ ماں ایسی شقی القلب پتھر دل ہوسکتی ہے اور جو آنے والا جی ہے اگر اللہ کو اس کی زندگی منظور ہوئی تو یہ ڈاکٹر اور اس کے مشورے کیا چیز ہیں جانے دو تم کیوں خود کو بے کار کی فکروں میں ہلکان کرتی ہو میں تو تمہیں ادھر اس لیے لے کر آئی تھی شہر کی اس وقت سب سے مشہور اور قابل گائنا کالوجسٹ ہے۔

تمہاری دن بدن گرتی اس صحت کے لیے کوئی اچھا ٹانک یا دوا لکھ دے گی ورنہ پہلے بھی تو چار پیدا کیے ہیں کون سا انوکھا کام کرنے جا رہی ہو چلو اب گھر جا کر بھائی جان سے دوائیاں منگوالیں گے۔ یہاں تو بھئی وہی بات ہے اونچی دکان پھیکا پکوان۔"

وہ بڑبڑاتے ہوئے روبینہ کو اپنے پیچھے کمر پکڑ کر رینگتی چال سے آتے ہوئے دیکھ کر آگے چل دی۔

"ڈاکٹر تھوڑی ہے پتھر ہے جیسا سنا ویسا پایا۔"

ڈاکٹر ندرت کو دو دونوں میں دوسری بار اس جملے نے پتھر کا کردیا تھا انہوں نے میز کے کونے کا سہارا لے کر خود کو سنبھالا دیا۔

"کیا میں واقعی پتھر ہوں۔ پتھر کی ہوگئی ہوں۔

وہ سب بھی تو یہی کہتے تھے۔ میں پتھر ہوں پتھر دل۔" ان کی آنکھوں کے آگے گھمبیر اندھیرے سے چھا رہے تھے اور کان سائیں سائیں کر رہے تھے۔

"ڈاکٹر صاحب آجائیں۔" نرس نے سائیڈ روم سے باہر آتے ہوئے کہا تو وہ کسی روبوٹ کی طرح اس کے پیچھے چل دیں۔

☆

"کیا خیال ہے۔ آج لنچ اکٹھے نہ کیا جائے کہیں باہر؟"

وہ جیسے ہی فارغ ہو کر اپنے آفس میں آئیں سامنے بیٹھے ڈاکٹر حارث نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"ابھی تو میری سیون اور ٹوینٹی نائن نمبر والی دونوں پیشنٹ ان سیریس کنڈیشن میں ہیں ان کو فی الحال چھوڑ کر میں کہیں نہیں جاسکتی۔" انہوں نے واش روم کا رخ کرتے ہوئے وضاحت کی تو حارث نے جواباً کچھ نہیں کہا۔

وہ تھوڑی دیر بعد فریش ہو کر باہر آئیں تو ڈاکٹر حارث اس طرح بیٹھے کسی نئی دوا کا انٹروڈکٹری پر فارما پڑھ رہے تھے۔

"ابھی سسٹر ماریہ اور ڈاکٹر فرحانہ آئی تھیں۔ آپ کی دونوں سیریس پیشنٹ اسٹیبل ہیں۔ فی الحال کوئی پرابلم بھی نہیں تو میرے خیال میں چلنے میں کوئی حرج نہیں۔" وہ گویا طے کر کے بیٹھے تھے آج انہیں باہر لے کر ہی جائیں گے۔

"آئی ایم سوری۔ مگر مجھے تو بالکل بھوک نہیں صبح ناشتا ڈٹ کر کر کے آئی تھی اور دوبار چائے اور کافی کے ساتھ اسنیکس بھی لے چکی ہوں اور میں نے سوچ رکھا تھا پہلے سے پلیز مائنڈ مت کیجیے گا۔ میں آج لنچ نہیں کروں گی۔" انہوں نے اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا اور بیل بجا کر ساتھ والے کمرے سے ہیڈ نرس کو بلانے لگیں۔

"میں بالکل مائنڈ نہیں کروں گا بلکہ آج تک جو کچھ بھی آپ کہتی رہتی ہیں یقین جانیے میں نے کبھی مائنڈ نہیں کیا۔" وہ جتانے والے انداز میں بولے تو ڈاکٹر ندرت نے انہیں ترچھی نظروں سے دیکھا۔

"طنز کر رہے ہیں۔"

"قطعاً نہیں۔" وہ لبوں میں مسکراہٹ دبا کر بولے۔

اسی وقت سسٹر رضوانہ اندر داخل ہوئی۔

"ان دونوں پیشنٹ کی مفصل رپورٹ ہر آدھے گھنٹے بعد مجھے آکر دو اور کوئی بھی مسئلہ ہو۔ مجھے فوراً ادھر آکر بتانا میں آفس میں ہی ہوں۔" انہوں نے نرس کے ساتھ ڈاکٹر حارث کو بھی شاید جتایا تھا۔

نرس سر ہلاتے ہوئے اجازت لے کر باہر چلی گئی۔

"تو اس کا مطلب ہے۔ لنچ ادھر ہی منگوا لیا جائے۔" اس کے جاتے ہی ڈاکٹر

حارث بولے۔

"ڈاکٹر حارث پلیز، آپ لنچ پر کیوں بضد ہیں؟" وہ جیسے زچ ہو کر بولیں۔

"اور آپ نہ کرنے پر بضد ہیں؟" وہ بھی جواباً بولے تو وہ کندھے اچکا کر انہیں دیکھنے لگیں۔

"میں وجہ پہلے بھی بتا چکی ہوں، قطعاً موڈ نہیں ہاں اگر آپ چائے یا کافی منگوالیں تو ساتھ دے سکتی ہوں۔" آخر مروت اور ساتھ کام کرنے والوں کے ساتھ کچھ وضع داری نبھانا بھی ضروری تھی انہیں کہنا ہی پڑا۔

"پکی بات ہے آپ ساتھ دیں گی؟" ڈاکٹر حارث ان کے جملے کی دم گویا ہاتھ میں لے کر بولے کہ وہ ٹپٹا سی گئیں۔

"کم آن، کہا نا بالکل ساتھ دوں گی مگر صرف چائے یا کافی کی حد تک۔" اگلے ہی لمحے وہ سنبھل کر اپنے مخصوص لہجے میں بولیں۔

"وضاحت کرنے کی ضرورت نہیں ڈاکٹر ندرت! مجھے معلوم ہے آپ صرف چائے یا کافی کی حد تک ہی ساتھ دے سکتی ہیں۔" وہ ایک دم سے اترے ہوئے چہرے کے ساتھ بولے تو ڈاکٹر ندرت اِدھر اُدھر دیکھنے لگیں۔

"ایک بات پوچھوں؟"

"ضرور۔" انہیں بالآخر کھیلنے کے لیے پیپر ویٹ مل ہی گیا۔ "آخر آپ اس قدر پتھر دل کیوں ہیں۔ ہم دونوں پانچ سالوں سے ساتھ ہیں اور......"

ڈاکٹر ندرت نے ڈاکٹر حارث کی اگلی بات تو سنی ہی نہیں تھی، فقط پہلے جملے کی زنجیر نے ان کی ساعتوں کو جکڑ لیا تھا۔

"پتھر دل! آپ اس قدر پتھر دل کیوں ہیں؟" ایک ہی جملہ...... تین دنوں میں تین بار تین مختلف اشخاص کے منہ سے کہ ان تینوں سے ان کے تعلق کی نوعیت بالکل مختلف تھی مگر ان تینوں کی رائے ان کے بارے میں ایک تھی بالکل مشترک یہ کیسے ممکن تھا۔

انہوں نے خالی خالی نظروں سے سامنے بیٹھے ڈاکٹر حارث کو دیکھا جن کے ہونٹ ابھی بھی ہل رہے تھے گویا وہ کچھ اور بھی کہہ رہے تھے کیا؟ انہیں قطعاً سنائی نہیں دیا سوائے آواز کی بے معنی سی گونج کے......

"کیا وہ واقعی پتھر دل ہیں؟ ان کے سینے میں دل نہیں پتھر ہے۔ وہ بھی نوکیلا۔

اگر یہ بات سچ ہے، صحیح ہے اور وہ جو کہتے ہیں زبانِ خلق کو نقارہ خدا سمجھو...... تو کیا میں واقعی ایسی ہوں پتھر دل تو پھر یہ سب کیا ہے ڈھکوسلہ ہے کیا بکھیڑا ہے میں اگر پتھر دل ہوں تو یہ ساری دنیا کی ہمدرد، بہی خواہ، ان کی تکلیف دور کرنے کی خاطر رات دن کی مشقت تکلیف کی پروا کیے بغیر ایک ہی لگن لیے ایک ہی جستجو۔

خدمت! انسانیت کی خدمت اپنے لوگوں کی خدمت...... ان کے کام آنے کی لگن اپنے وجود کی فعالیت کی جستجو ایک عضو کارآمد کہلانے کی دیوانگی اپنے کام اپنے ہنر میں پرفیکشن کا پاگل پن کیا ہے...... کیا ہے یہ سب......؟ اگر میں پتھر دل ہوں تو پھر یہ سب کیا ہے؟"

ان کا سر بری طرح چکرانے لگا انہوں نے دونوں ہاتھوں میں سر تھام لیا۔

"ڈاکٹر ندرت آر یو آل رائٹ؟ کیا ہوا ٹھیک ہیں آپ۔"

ڈاکٹر حارث ان کے بالکل پاس کھڑے فکر مندی سے ان کا شانہ ہلاتے ہوئے پوچھ رہے تھے۔

اور ڈاکٹر ندرت کو ان کی آواز کسی اندھیرے غار سے آتی...... محسوس ہو رہی تھی۔

"میں ٹھیک ہوں پلیز۔" انہوں نے خود کو سنبھالتے ہوئے بدقت ان کا ہاتھ اپنے شانے سے ہٹاتے ہوئے ذرا روکھے پن سے جھٹکا تھا کہ ایک پل کو ڈاکٹر حارث شرمندہ سا ہو کر رہ گئے۔

"کیا ہوا تھا طبیعت تو ٹھیک ہے؟" وہ اپنی نشست کی طرف پلٹتے ہوئے سابقہ ہمدردانہ لہجے میں بولے۔

"بس یونہی چکر سا آ گیا تھا۔" جواباً انہیں کچھ تو کہنا تھا۔

"اور پھر بھی لنچ نہیں کرنا چاہ رہیں آپ۔ خود سے، اپنی صحت سے کتنی غفلت برت رہی ہیں۔ اس کا اندازہ تو کوئی انجان شخص دیکھ کر بھی لگا سکتا ہے۔ ندرت کیا ہے یہ سب۔ آخر اتنے عرصے کا ہمارا ساتھ ہے اپنا اتنا خیال تو مجھے کرنے دیں۔ آنٹی کے بعد آپ نے خود کو بالکل ہی نظر انداز کرنا شروع کر دیا ہے۔ کیا میں دیکھ نہیں رہا، کولیگ ہونے کے علاوہ بھی والدین کے تعلق کے لحاظ سے ہمارا کوئی رشتہ بنتا ہے؟"

"میں نے کب انکار کیا ہے بھئی؟" وہ ٹیبل کے نیچے جھکتے ہوئے مصروف سے لہجے میں بولیں۔

"مجھے اکثر وہ بیچ کے دس سال کس قدر پچھتاوے میں مبتلا کرتے ہیں جب پاپا

ہمیں لے کر نیروبی چلے گئے تھے اور ہمارا رابطہ محض مہینوں میں لکھے جانے والے دو چار خطوط یا پھر کوئی فون کال رہ گئی تھی اور اس بے خبری میں مجھے پتا بھی نہیں چلا" سسی اے تیرا لٹیا شہر بھنبھور" وہ پھیکی سی ہنس ہنس کر بولا۔

"کم آن حارث! یہ لڑکیوں کی طرح آہیں بھرنا کم از کم تم جیسے اتنے کمپلیٹ اسپیشلسٹ کو زیب نہیں دیتا جو بیت گیا اس کا ملال کیا رکھنا۔"

بالآخر انہیں اپنی مطلوبہ کتاب نچلے دراز سے مل ہی گئی کتاب اپنے آگے رکھتے ہوئے وہ ہلکے پھلکے انداز میں بولیں۔

"اور اس کے باوجود تمہیں یوں اکیلا دن رات کسی مشین کی طرح کام میں جتے دیکھ کر میرے اس ملال میں کچھ اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے شاید تمہیں احساس ہو جائے کسی دن میرے اس ملال کا۔" ڈاکٹر حارث کا لہجہ اور انداز ہنوز پر ملال تھے۔

"ڈاکٹر حارث آپ کو رنجیدہ یا دکھی ہونے کی ضرورت نہیں اور جو یہ میں مشین کی طرح جتی رہتی ہوں تو میں آپ کو حلفیہ بیان دے سکتی ہوں جس طرح چاہیں لے لیں کہ اس طرح کام کرنا اتنی تندہی اور شدت سے میرا جنون ہے اور مجھے اپنے اس مشن سے عشق ہے اور آپ یہ نہ سمجھیں کہ اس طرح تندہی سے کام کر کے میرے اندر کمزوری یا نقاہت پیدا ہو رہی ہے ہرگز نہیں یہ پوری ڈیوشن سے کام کرنا میری توانائیوں میں ہزار گنا اضافہ کرتا ہے۔ یہ محنتی زندگی لوگوں کی خدمت تو میرا خواب تھا اور میں اس خواب میں کتنی خوشی، کتنی مسرت سے جی رہی ہوں شاید چاہوں بھی تو آپ کو بتا نہ سکوں۔ یہ کام سے عشق میری زندگی ہے۔ میرا جنون ہے۔ اس عشق، اس توانائی سے بھرپور خواب سے بچھڑی تو شاید جی نہ سکوں۔ اب آپ کو میرے جذبات کا کچھ علم ہو گیا ہوگا تو پلیز۔ آئندہ میرے کام پر اعتراض نہ کیجیے گا ورنہ، ورنہ...... شاید نیکسٹ ٹائم میں اتنی برداشت کا مظاہرہ نہ کر سکوں۔"

وہ بولتے بولتے جس طرح سختی اختیار کرتی گئیں ڈاکٹر حارث کے پاس جیسے آگے کچھ کہنے کے لیے رہ ہی نہیں گیا۔

"کیا ایک انسان کی زندگی پر صرف اس کا اپنا حق ہوتا ہے کسی اور کا نہیں ہوتا؟"

نہ جانے کون سا جذبہ تھا جس نے انہیں یہ سوال کرنے پر مجبور کر ڈالا وہ جواب میں چپ سی رہ گئیں یونہی آگے پڑی کتاب کی ورق گردانی کرتی رہیں۔

"آپ نے جواب نہیں دیا یا اس کا جواب آپ دینا نہیں چاہتیں۔" وہ لمحہ بھر

توقف کے بعد جتانے والے انداز میں بولے۔

"کسی کا بھرم رہ جائے۔ کیا اچھا نہیں، میں جواب دینا نہیں چاہتی تھی مگر آپ کے مجبور کرنے پر ڈاکٹر حارث میرے خیال میں کسی بھی انسان کی زندگی پر پہلا حق پہلا مسلمہ حق صرف اس انسان کا ہوتا ہے وہ اپنی مرضی سے جیسے ہاں اگر اس کا دل چاہے تو وہ کسی دوسرے کو اس حق کا کچھ حصہ دے سکتا ہے مگر اپنی مرضی اور خوشی سے۔" وہ مرضی اور خوشی پر زور دے کر بولیں۔

"اور اس مرضی اور خوشی سے اپنی ذات پر کچھ حق دے کر پھر واپس لے لیا جائے۔ اسے آپ کیا کہیں گی۔"

ڈاکٹر ندرت کو امید نہیں تھی۔ وہ جواب میں یہ کہہ ڈالیں گے۔

"یا اس کا جواب بھی آپ نہیں دینا چاہتیں۔" وہ اس طنزیہ انداز میں بولے۔

"کیا اس طرح کے سوال کسی کی ذاتیات میں ڈائریکٹ مداخلت نہیں؟" وہ قدرے شکستہ سے لہجے میں بولیں ایک ہاری ان کے کھلے ہوئے چہرے پر تاریک سائے کی طرح چھا رہی تھی۔

"اگر کسی دوسرے کے اتنے گریز اور خود پرستی سے اس کے ارگرد کا کوئی انسان اتنا متاثر ہو رہا ہو کہ اسے اپنی ذات پر ہر قسم کا اختیار منفی ہوتا نظر آ رہا ہو تو اتنا دخل دینے کا حق تو ہے اسے دوسرے کی زندگی میں۔" اب تو کوئی ڈھکی چھپی بات تھیں نہ کوئی ان ڈائریکٹ انداز جو ڈاکٹر ندرت بچنے کی کوشش کرتیں مگر صاف پوچھ بھی تو نہیں سکتی تھیں۔

"آپ شاید لنچ کے لیے جانے والے تھے؟" انہوں نے جبراً چہرے پر مسکراہٹ لانے کی کوشش کرتے ہوئے موضوع بدلنا چاہا۔

"مما بہت بضد ہیں آج کل میری شادی کے سلسلے میں۔" وہ ان کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے بولے۔

"تو کر لیجیے۔" انہوں نے کتاب سے مطلوبہ صفحہ نکالا۔

"کیا کسی دیوار سے شادی کر لوں یا کسی پتھر سے؟" وہ جھلا کر بولے۔

"اگر ایسی شادی ہو سکتی ہے تو کر لیں۔" انہوں نے کتاب سے نظریں ہٹائے بغیر کہا۔

"پھر بھی آپ ہی سے رابطہ کرنا پڑے گا۔ آپ سے بڑا پتھر دل اور کون ہوگا۔"

وہ اتنی بے خوفی سے ان کے منہ پر یہ سب کہہ ڈالیں گے، اس کی انہیں امید نہیں

تھی ان کے چہرے کا رنگ بدلتا چلا گیا۔ تاریکی سے سفیدی اور سفیدی سے سرخی کے سائے چھا گئے۔

"ڈاکٹر حارث پلیز مائنڈ یور اون بزنس اس طرح کی بے تکلفی کی اجازت نہ میں آپ کو دوں گی اور نہ کسی ......"

"آپ کسی کو دے بھی کیا سکتی ہیں ایسی اجازت دیں گی بھی تو پھر اس سے بے دردی سے چھین لیں گی اور دوسروں کی زندگی برباد کر کے کہیں گی۔ مائنڈ یور اون بزنس کیوں؟ کیوں نہ میں احتجاج کروں جب میری زندگی کا بربادی کا براہ راست تعلق آپ سے بنتا ہو۔"

وہ کسی شیشے کی طرح چیخ کر بولے تھے ان کے چہرے پر بھی کئی رنگ ایک ساتھ ابھر کر ڈوبے تھے۔

"میں نے آپ کی زندگی برباد نہیں کی۔ آپ کو یوں مجھ پر چلانے کا کوئی حق نہیں۔" انہوں نے زور سے کتاب بند کرتے ہوئے قدرے طیش میں آ کر کہا۔

"آپ کسی کو دے بھی کیا سکتی ہیں اور حق وہ بھی اپنی ذات پر ناممکن۔" وہ استہزائیہ انداز میں ہنسے "اور یوں انجان مت بنیے میری زندگی کی بربادی کی ذمہ داری آپ ہی پر آئے گی کہ مسلسل چھ سالوں سے اشاروں کنایوں میں مَیں بہت بار آپ کو یہ سب بتا چکا ہوں اور آپ کسی سخت دل انسان کی اداکاری کرتے ہوئے اس احساس کو جھٹلاتی رہی ہیں۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں۔ میں کیوں اس پتھر سے سر پھوڑ رہا ہوں مجھے کیا حاصل ہوگا اور اگر حاصل ہو بھی گیا تو ایک اور پتھریلا دل ساتھ میں ملے گا پھر میرے پاس فرار کی کوئی راہ نہ ہوگی۔ آپ کے دل پر جس محبت نے جونک لگائی۔ آپ تو اس کی نہیں بن سکیں۔ Passion عشق اور جنون کی آڑ میں آپ نے اس محبت کو لات مار کر راہ سے ہٹا دیا اور اپنی ہی ذات کے حصے کو...... تو میں کیا چیز ہوں آپ کی نظر میں ...... ڈاکٹر ندرت! ایک مخلصانہ مشورہ دوں اگر آپ کی ذاتیات کے پندار کو ٹھیس نہ لگے۔" وہ جذباتی انداز میں بولتے بولتے رک کر بولے۔

ڈاکٹر ندرت لب بھینچے خود پر ضبط کے ہزار بند باندھے سرخ چہرہ لیے بیٹھی تھیں۔

"خلع لے لیں آپ کم سے کم آپ کے ہاتھوں ہونے والی جانوں کے ضیاع میں کچھ کمی کی امید ہو جائے گی ورنہ ...... اور آپ یونہی انجان بن کر اپنے پیشے سے عشق کا

ڈھول پیٹتی رہیں گی۔ چلتا ہوں میں۔"

وہ ٹھنڈے ٹھار لہجے میں انہیں وہ مخلصانہ مشورہ دے کر ایک جتاتی ہوئی آخری نگاہ ان پر ڈال کر دروازہ کھولتے باہر نکل گئے۔

"جانوں کا ضیاع میرے ہاتھوں۔" ان کے لیے تو یہ خوفناک انکشاف ہی جان لیوا تھا۔

انہوں نے بے اختیار چونک کر اپنے مسیحا ہاتھوں کو دیکھا ان ہاتھوں میں روز کئی نئی زندگیاں وجود میں آئی تھیں۔

ہر نئی پہلی چیخ انہیں کسی طمانیت کسی خوشی کے ناقابل بیان احساس سے دو چار کرتی تھی کہ ان کی اپنے کام اپنے ہنر مند ہاتھوں سے عقیدت و عشق میں اور بھی کئی گنا اضافہ ہو جاتا تھا۔

"اور یہ کہہ رہا ہے میرے ہاتھوں جانوں کا ضیاع ...... کون سی جانوں کا ضیاع ...... پورا شہر جانتا ہے آج تک .... کیس چاہے کتنا ہی پیچیدہ کتنا ہی گمبھیر کیوں نہ ہو موت کی دہلیز سے کھینچ کھینچ کر نئی زندگی کی نوید دیتے یہ میرے ہاتھ سارے شہر میں مسیحا کے نام سے جانے جاتے ہیں آج تک ایک بھی موت کا سیاہ ٹیگ میں نے کسی نئے وجود میں آنے والی زندگی کے ماتھے پر نہیں لگنے دیا۔

میں نہیں لوگ کہتے ہیں میرے ہاتھوں میں یسوع مسیح جیسی شفا ہے کہ مرے ہوئے وجود میں زندگی پھونک دیتے ہیں ان لمحات میں نہیں رہتی کوئی الہامی قوت میرے وجود کو اپنے حصار میں لے لیتی ہے اور فقط زندگی...... زندگی میرے لبوں سے نکلتا ہے اور نئی زندگی وجود میں آتی ہے تو پھر یہ کیسے ایسی بکواس میرے بارے میں کر سکتا ہے اپنی فضول محبت کی ناکامی کا غصہ میرے ہنر مند مسیحا پیشے پر تھوپنا چاہتا ہے اور کوئی بات نہیں یہ کوئی دوسرے مردوں سے الگ تھوڑی ہے۔

اس کی بھی ایگو ہرٹ ہوتی ہے کہ اس کی موجودگی میں ایک عورت کی مسیحائی کے چرچے ہوں اور وہ کیسے برداشت کرے وہ مجھے اپنی اس بدنام زمانہ محبت کی زنجیر میں باندھ کر ایک بے کار ناکام زندگی دینا چاہتا ہے میرے ان ہنر مند ہاتھوں میں پیاز لہسن کی ٹوکری تھما کر مجھے، میرے ہنر کو زنگ لگانا چاہتا ہے ایک وفا شعار محبت کرنے والی بیوی کا رتبہ عطا کر کے۔

بے وقوف سمجھتا ہے مجھے۔ نادان، کم عقل، ہرگز نہیں میں نے تو...... میں نے

ایسے ہر رشتے کو جو میرے Passion کی راہ میں رکاوٹ بنے ...... ہٹا دیا تو کیا وہ سچ کہہ گیا۔ میں اپنی مسیحائی کا ڈھنڈورا پیٹتی ہوں اور خود پرستی میں مبتلا ہوں اور وہ جو......

نہیں نہیں جھوٹ ہے یہ..........

یہ مردوں کے ہتھکنڈے ہیں۔ ان کی چالیں عورت کو ہرانے کی اسے ناکام بنانے کی جیسے ...... جیسے ممی ...... میری لائق قابل ڈاکٹر ماں ...... جس نے ساری زندگی گھر کی چار دیواری میں ایک وفا شعار بیوی کے روپ میں گزار دی۔ ویسی زندگی میں گزار دوں ...... کوشش کی تھی میں نے ...... مگر میرے اندر کا ہنر، میرا پوٹینشل ...... اف کس قدر منہ زور جذبہ ہے یہ کام کرنے کا ...... میں اس سے کیسے منہ موڑ سکتی ہوں بالکل بھی نہیں۔

یہ ڈاکٹر حارث مجھے ٹریپ کرنا چاہتا ہے۔ محبت کے نام پر اس کے دلفریب سنہری جال میں ...... بار بار اگر مجھے میری تنہائی اکیلے پن کا احساس دلا کر ...... اپنے جھوٹے ساتھ کا یقین دلا کر ...... وہ مجھے سولہ سال کی کوئی بے وقوف، لالہ بالی دوشیزہ سمجھتا ہے جو اس محبت کے دام میں آ جائے گی۔

ارے نادان اگر میں نے محبت کے جال میں ہی پھنسنا تھا محبتیں ہی نبھانی تھیں تو۔"

"تو......؟" اتنا بڑا سوالیہ نشان پیپر ویٹ کی شفاف سطح کے اندر باہر سے جھلکنے لگا۔

وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئیں۔

انہیں امید تھی کہ ڈاکٹر حارث دن میں اتنی تلخ گفتگو کے بعد دوبارہ اتنی جلدی ان کو فیس کریں گے۔

وہ رات گئے گھر پہنچی تھیں اور یہی ان کا معمول کا وقت تھا روزانہ اتنی ہی دیر سے آنا۔

ممی کی زندگی میں پھر بھی وہ کوشش کرتیں کہ ڈنر ٹائم میں ان کا ساتھ دینے ذرا جلدی گھر پہنچ جائیں مگر ان کی دو ماہ قبل اچانک ہونے والی موت کے بعد جیسے ڈاکٹر ندرت نے گھر جلدی آنے یا اپنا خیال رکھنا اور کچھ نہیں تو کھانے پینے کے اوقات کی پروا کرنا جیسی ترجیحات سے آزاد کر دیا تھا خود کو۔

اب وہ اکثر دوپہر یا رات کا کھانا گول کر جایا کرتی تھیں اگرچہ ملازم پرانے تھے اور ان کو کھانا دینے کے خیال سے رات گئے تک جاگ کر انتظار بھی کیا کرتے تھے مگر وہ ہر روز انہیں یوں جاگنے اور انتظار کرنے سے منع کرنا نہیں بھولتی تھیں مگر وہ بھی شاید نمک حلال تھے روز ہی ان کے گھر آنے پر کھانے پر مجبور کر دیا کرتے تھے تقریباً سبھی ملازم پایا کے

زمانے کے تھے سوانہیں اپنے بچوں کی طرح عزیز رکھتے تھے اگرچہ وہ بھی ان کا خیال رکھتی تھیں مگر جس طرح ممی کے جانے کے بعد وہ سب ان کے بارے میں فکر مند رہنے لگے تھے انہیں کبھی کبھی ناگوار سا بھی گزرنے لگتا پتا نہیں کیسی آدم بے زاری طبیعت ہو چلی تھی کسی کی اتنی محبت فکر بھی طبیعت پر گراں گزرتی تھی۔

ابھی وہ رضیہ کو کھانے سے انکار کر کے بمشکل لاؤنج کے صوفے پر ڈھیر ہو کر سونے کے بارے میں سوچ ہی رہی تھیں کہ رضیہ نے ڈاکٹر حارث اور ان کی والدہ کی آمد کی اطلاع دی ”اوہ مائی گاڈ آج یہ شخص اتنا ڈھیٹ کیوں ہو چلا ہے اب پھر وہی بک بک اور سردرد آخر یہ چاہتا کیا ہے اور آنٹی فیروزہ انہیں ٹالنا اور جھڑکنا تو ممکن ہی نہیں اور اس وقت مجھے صرف ایک آرام دہ بستر اور اچھی نیند کی ضرورت ہے۔“ انہوں نے کوفت بھرے انداز میں وال کلاک کی طرف دیکھا جہاں گیارہ بج رہے تھے۔

”بھئی میں نے سوچا نہ تو تم نے خود آنے کی زحمت کرنی ہے اور نہ غلطی سے ہمیں دعوت دو گی اس لیے ڈھیٹ بن کر خود ہی چلے چلو اور کچھ نہ بھی سمجھو ہمسائے سمجھ کر تو تھوڑی دیر برداشت کر ہی لو گی۔“ ابھی وہ سوچ رہی تھیں کہ انہیں بلوائے یا نہیں کہ وہ خود ہی بے تکلف انداز میں بولتی اندر چلی آئیں۔

”السلام علیکم آنٹی سوری میں خود سوچ رہی تھی آنے کے بارے میں فرصت ہی نہیں ملتی۔“ وہ مروتاً اٹھ کر سلام کرتے ہوئے بولیں اور ذرا سا آگے ہو کر ان سے گلے ملتے پیچھے کھڑے خفا سے ڈاکٹر حارث کو دیکھا جو ان کی طرف دیکھنے کی بجائے اِدھر اُدھر یوں دیکھ رہے تھے جیسے پہلی بار ان کے گھر آئے ہوں خفا خفا سا پھولا ہوا منہ ڈاکٹر ندرت کو مسکرانے پر مجبور کر گیا۔

”بھئی آپ کو فرصت نہیں ملے گی حشر تک اور ہماری عمر کے خانے میں اتنے دن ہیں نہ گھڑیاں کہ بیٹھیں آپ کی آمد کا وقت شمار کرتے رہیں سو خود ہی چلے آئے ابھی آئی ہو نا۔“ وہ اس کو گلے لگا کر سر اور ماتھا چومتے ہوئے محبت سے بولیں کیسی ممتا بھری میٹھی گرم مسکان اٹھ رہی تھی ان کے گداز سینے اور محبت بھرے لمس میں ندرت کا دل ایک آہ بھر کر رہ گیا۔

دو ماہ قبل تک انہیں اس ممتا بھری آغوش کی کبھی ضرورت ہی محسوس نہ ہوئی تھی ممی ہی اس کے انتظار میں جاگتیں اس کے آنے پر بے قراری ہو کر کبھی کبھار اسے اپنے ساتھ لگا لیا کرتی تھیں ورنہ انہیں تو ہمیشہ یہ گمان ہی رہا کہ ممتا کی یہ نرم گرم مہربان چھاؤں ہمیشہ ان

کے سر پر یونہی سایہ فگن رہے گی۔

چیزیں اور نعمتیں پاس ہوں تو ہمیں ان کے انمول ہونے کا احساس بہت کم ہوتا ہے۔ ہر چیز ہر نعمت کی قدر اس کے دور ہونے یا گم ہو جانے پر بیش قیمت ہو جاتی ہے شاید، انہوں نے ایک آہ بھر کر سوچا ”آیئے ڈاکٹر حارث بیٹھیں نا“ وہ گھر چل کر آئے تھے سو مروت تو نبھانی تھی۔

”نو تھینکس میں چلتا ہوں اس وقت ذرا بیٹھنے کا موڈ نہیں سخت تھکاوٹ ہو رہی ہے کل ملاقات ہو گی گڈ نائٹ۔“ وہ اسی طرح جتانے والی نگاہوں سے انہیں تکتے بظاہر سرسری انداز میں کہتے باہر نکل گئے تو ڈاکٹر ندرت سر ہلا کر رہ گئیں حارث بیٹھے نہیں یہی احساس کافی تسلی بخش تھا۔

”کھانا کھا لیا تم نے۔“ انہوں نے ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے پاس ہی بٹھا لیا یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کسی خاص مقصد کے تحت اس وقت آئی ہوں۔

یونہی ڈاکٹر ندرت کی چھٹی حس نے گھنٹی سی بجائی۔

”جی کھا چکی۔“ اس وقت یہ چھوٹا سا جھوٹ انہیں ایک لمبی نصیحت بھری بحث سے بچا سکتا تھا سو بول دیا۔

”اتنی جلدی ابھی تو تمہاری گاڑی اندر آئی تھی“ وہ لگ رہا تھا گیٹ سے کھڑی انہیں ہی دیکھ رہی تھیں۔

”بھوک کچھ خاص تو تھی نہیں بس دو چار لقمے لیے ہیں آپ کہیں تو آپ کے لیے لگواؤں۔“

”ارے نہیں ہم تو ہر صورت نو بجے سے پہلے کھانا کھا لیتے ہیں معلوم تو ہے تمہارے انکل نے چند سال آرمی میں کیا گزارے ہیں ہماری ساری زندگی گھڑی کی سوئیوں کی محتاج ہو کر رہ گئی ہر کام مقررہ وقت پر نہ ایک منٹ کی دیر نہ جلدی بس اس ایک کام میں کوشش کے باوجود دیر ہوئی جا رہی ہے۔“ وہ کہتے کہتے ایک دم سے بولیں تو ڈاکٹر ندرت کے اندر کی چوکنی گھڑی فوراً ٹک ٹک کرنے لگی۔

اب اگر وہ سوال کرتیں تو مزید پکڑ میں آتیں سو یونہی انہیں تکتے ہوئے مسکرائے گئیں۔

”دیکھو بہت سر مارا اس لڑکے کے ساتھ شادی ہو یا زندگی کا اور بھی کوئی اہم معاملہ وقت پر نپٹا ہی اچھا لگتا ہے اب میری عمر کی عورت جا کر اسکول میں داخلہ لے تو

دوسرے ہنسی اڑائے سو اڑائیں خود اپنے بوڑھے حافظے میں کچھ نہ جم سکے یعنی ہر چیز کی ایک عمر ایک وقت ہوتا ہے پھل بھی موسم کا اچھا لگتا ہے بے موسمی سبزی لاکھ اچھے طریقے سے پکاؤ عموماً مزا نہیں دیتی۔

شادی بھی وقت اور خاص عمر کے دوران ہو جائے تو اچھی لگتی ہے پہلے تو یہ بولتا ہی نہیں تھا ایک ہی رٹ کہ شادی نہیں کرنی دن رات منت سماجت کر کے آخر اس ضد کا پیچھا چھوڑا کہ نہیں، اب کہاں کرنی ہے کس سے کرنی ہے یہی طے نہیں ہو پا رہا تھا۔

پہلے دونوں بچوں کی مناسب عمر میں شادیاں کردیں اب ماشاء اللہ ان کے بچے بھی ہیں اور وہ دونوں اپنی زندگی میں سیٹ بھی ہیں بس ان کی ٹینشن ......

اب اگر بولا ہے تو ......" وہ کہتے کہتے چپ ہوگئیں اور یوں ندرت کی صورت دیکھنے لگیں جیسے کچھ اخذ کرنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ ندرت نے بے ساختہ نگاہیں چرائیں۔

"آنٹی پہلے تو یہ بتائیں کیا لیں گی ٹھنڈا گرم، کافی منگواؤں یا چائے یا کولڈ ڈرنک" اس وقت موضوع بدلنے سے بہتر اور کوئی جائے پناہ نہ تھی۔

"کچھ بھی نہیں چائے کافی اس وقت لوں گی تو رات بھر کروٹیں بدلتی رہوں گی کولڈ ڈرنک بھی نہیں ...... کاش اگر یہ دو چار ماہ پہلے بول دیتا ......" وہ پھر اس ٹاپک کی طرف آگئیں۔

"دیکھو بیٹا تم مجھے اپنی عائشہ کی طرح ہی عزیز ہو پھر تمہارا بچپن، جوانی سب ہماری نظروں کے سامنے، چلو جب تک والدین حیات تھے ہم تم کوئی نہ تھے بات کرنے والے یا خوامخواہ ہمدردی جتانے والے وہ کیا کہتے ہیں سیانے کہ ماں سے زیادہ چاہے پھاپھا کٹنی کہلائے اگرچہ بہن عشرت سے کئی بار اس موضوع پر بات ہوئی مگر نہ وہ کچھ حل نکال پائیں نہ میں کسی طرح اپنا مدعا بیان کر پاتی اب وہ تو یونہی تشنہ چل دیں یقیناً تمہیں یوں اتنے بڑے گھر میں اکیلا تنہا پھرتے دیکھ کر ان کی روح بھی بے چین ہوتی ہوگی روح کو بھلا کب چین ملتا ہے اگر ......

اور بیٹی سچ کہوں تو عمریں یوں تنہا بسر ہوتی بھی نہیں لاکھ تم مصروف سہی کام دھندے والی مگر شام کو گھر آؤ تو کسی دوسرے کے ہونے کی طلب لازماً ہوتی ہے پھر قدرت نے ایسی کشش رکھی ہے کہ ایک خاص عمر کو پہنچ کر دل بے اختیار ان کی آوازیں سننے کو ہمکتا ہے اور

ہم جیتے کس لیے، اس دل کی خواہشیں پوری کرنے کو تو جیتے ہیں۔

پھر ایسا نہ ہو کہ پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی گزر جائے پلٹنا نہ پلٹنا برابر ہو جائے بہتر ہے کوئی حل نکالو، کوئی فیصلہ کر ڈالو۔

سوچو میری بیٹی اس مسئلے پر سوچو محض ڈاکٹری کے عشق کے سہارے زندگی بسر نہیں ہوتی۔" اسے یوں چپ دیکھ کر شاید ان کا حوصلہ بڑھا تھا۔ "آنٹی اگر میں نہ سوچنا چاہوں اور یہ میرے دل کی خواہش ہو کہ جس طرح چل رہا ہے اس طرح چلتا رہے تو پھر ......" اس نے کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے سر اٹھا کر اعتماد بھرے لہجے میں کہا تو وہ نفی میں سر ہلانے لگیں۔

"نہ تو یہ تمہارے دل کی آرزو ہوگی نہ اس کی خوشی اور اس طرح چلتا رہتا تو بالکل بھی مناسب نہیں تم آج رات خود کو کچھ وقت دو اور سوچو جو کچھ تم کر رہی ہو کیا درست ہے میں یہ نہیں کہتی کہ تم پرانی راہوں کے بارے میں سوچو یہ زندگی ہے میری بیٹی اور زندگی نام ہی ...... نئے انوکھے اتفاقات کا ہے ہوسکتا ہے زندگی نے تمہارے لیے ابھی بہت خوب صورت انمول تحفے سنبھال رکھے ہوں محض تمہارے اس پتھریلے سرد اور کٹھور رویے کی وجہ سے زندگی یہ تحفے مایوسی میں سمیٹ کر کہیں اور چل دے اس سے پہلے آگے بڑھ کر اپنے حصے کے یہ خوشیوں بھرے تحائف سمیٹ لو۔" ان کا اشارہ کن تحائف کی طرف تھا اسے بخوبی اندازہ تھا۔

مگر دل ...... دل کا کیا کرتی اسے تو اس طرح کے تحائف کیا کسی بھی تحفے سے کوئی غرض نہیں رہی تھی یہ پتھریلا سرد کٹھور رویہ اس کے دل پر گراں نہیں گزر رہا تھا اس کی طبیعت کا حصہ بنتا جا رہا تھا بلکہ بن چکا تھا۔ اس نے بے بس نگاہوں سے انہیں دیکھا۔

"اگر اب بھی تم یونہی انجان بنی رہو گی میری باتوں کو محض سرسری انداز میں لو گی کہ میں اٹھ جاؤں اور تم فراموش کردو تو میری بیٹی یہ ممکن نہیں تمہیں اب سوچنا ہی ہوگا۔ حارث نے ...... تم سے شادی کی خواہش ظاہر کی ہے اور ہمارے لیے اس کی خوشی سے بڑھ کر کچھ بھی مقدم نہیں اور تم تو سب کو ہی پیاری ہو ہمیں انکار کرنے کا کوئی بھی جواز نظر نہیں آتا سوائے تمہاری رضا مندی کے۔"

"میری رضا مندی آنٹی آپ کو۔" وہ اچنبھے سے بولی اور انگلیاں چٹخا کر رہ گئی۔

"سب رستے موجود ہیں تم سوچو تو سہی کوشش تو کرو کیا اس مختصر سی زندگی کی

خوشیوں پر کیا تمہارا کوئی حق نہیں تم جو شہر بھر کی عورتوں میں زندگی کی سب سے انمول خوشی کا تحفہ تقسیم کرتی ہو کیا ان خوب صورت تحفوں پر تمہارا کوئی حق نہیں۔'' وہ بھی حارث کی طرح حق کی بات کر رہی تھیں اور وہ خود سے اپنی ذات پر کسی کو کوئی حق دینا نہیں چاہتی تھی۔

بس خالی خالی نگاہوں سے انہیں تکے گئی۔ زندگی لینے اور دینے کا نام ہے تم پہ دوسروں کا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا تمہارا دوسروں کی ذات پر اور میری بیٹی یہ تو نظام قدرت ہے زندگی کے بنیادی اصول لینے اور دینے کے، خوشیاں بانٹنے سے بڑھتی ہیں اور دکھ بانٹنے سے کم ہوتے ہیں اب ہمارے گھر کی خوشیوں کا انحصار تمہاری ہاں پر ہے اور تم اتنی اچھی اتنی سمجھدار ہو مجھے یقین ہے تم بہت دیر نہیں لگاؤ گی وقت میں پہلے تمہیں کہہ چکی ہوں جتنا لینا چاہو لے لو مگر فیصلہ میرے بیٹے کے حق میں ہونا چاہیے بس اتنا سوچ لینا کبھی کبھی ہم سوچتے ہیں وقت ہماری مٹھی میں ہے اور حقیقتاً ہم وقت کی گرفت میں ہوتے ہیں بس اس حقیقت کو فیس نہیں کرنا چاہتے۔''

وہ اس کا کندھا تھپکتے ہوئے سمجھا رہی تھیں۔

''سوچو گی نا۔'' انہیں اب کچھ تو یہاں سے لے کر جانا ہی تھا خواہ کوئی وعدہ ہی کیوں نہیں وہ انہیں دیکھنے لگی۔

''ندرت میں کچھ پوچھ رہی ہوں۔''

''کوشش کروں گی۔'' وہ بھاری آواز میں بولیں یکدم اپنے تنہا ہونے کا شدید احساس ہوا تھا۔ وہ احساس جس سے بچنے کے لیے وہ ہمہ وقت خود کو مصروف رکھتی تھیں۔

''کوشش ہی سہی مگر کرو ضرور میں اگلے ماہ اسی تاریخ کو تمہارا جواب لینے آؤں گی اپنا خیال رکھو بیٹا یہ زندگی ایک بار ملتی ہے بار بار نہیں کہ ہم اگلی بار کے لیے بہت سے ارادوں کو اٹھا رکھیں اب تم آرام کرو رات کافی ہو چکی ہے چلتی ہوں میں اللہ حافظ۔'' وہ ایک بار پھر جھک کر اس کا سر چومتے ہوئے باہر نکل گئیں۔

''کیا اب میں آرام کر سکوں گی آپ کے خیال میں جس راکھ کو کرید کر آپ چنگاریاں اڑا کر گئی ہیں کیا اس کے بعد بھی میں چین کی نیند سو سکوں گی ہرگز نہیں۔

اور میں اس پر سوچنے کی کوشش بھی نہیں کروں گی میں اپنی زندگی کو اب کسی ایڈونچر، کسی تجربے کی نذر نہیں کروں گی رہ گیا ڈاکٹر حارث کا معاملہ اس پر میرے دل میں ایک ذرے کے برابر بھی نہ الفت ہے نہ لگاوٹ تو میں کیوں سوچوں جہاں تک بات اکیلے

رہنے کی ہے تو میں اکیلی ہرگز نہیں، اپنے کام کے ساتھ جس طرح کی کمٹمنٹ میری ہے وہ مجھے کبھی تنہا نہیں ہونے دے گی۔

اور اس ساری بک بک کا ایک ہی حل ہے کہ میں یہاں سے کہیں دور شفٹ کر جاؤں کہیں اور گھر لے کر۔''

ڈاکٹر ندرت نے دل میں فیصلہ کیا اور اٹھ کر اپنے بیڈ روم کی طرف بڑھ گئیں۔

☆

اگلے دو دن انہیں ڈاکٹر حارث کہیں نظر نہیں آئے۔

وہ چھٹی پر تھے ایک ہفتے کی، معلوم نہیں کیوں مگر ڈاکٹر ندرت کو بہت گہرے سکون کا احساس ہوا تھا پھر اگلے چار دن ان کے کیمپنگ کے تھے جس میں وہ شہر سے باہر کے دور دراز کے مضافات میں فری کیمپنگ کرتے تھے۔

ان کے ہسپتال کے سبھی ڈاکٹرز فری الاؤنسز کے بغیر اس ...... میں حصہ لیتے تھے اور ڈاکٹر ندرت کے تجربے میں یہ بات بھی آئی تھی کہ چند ہفتے یا مہینوں کے بعد زیادہ تر ڈاکٹرز اس ایڈونچر سے توبہ کر لیتے تھے یا کوئی نہ کوئی عذر یا بہانہ کر کے چھٹی پر چلے جاتے۔

اور ڈاکٹر حارث کا شمار بھی انہیں ڈاکٹرز میں ہونے لگا تھا انہوں نے پچھلے دونوں کیمپس میں شرکت نہیں کی تھی وجہ اس فضول کی حقیقت سے جان چھڑانا تھی یا کچھ اور یا شاید یہ ڈاکٹر ندرت کا وہم تھا کیونکہ کیمپ ختم ہونے میں ابھی دو دن باقی تھے جب ڈاکٹر حارث نے انہیں جوائن کر لیا تھا۔

اور وہ تلاش کرتی رہیں کہ کہیں ان کے رویے میں کوئی تکلف ناراضی یا کٹھور پن کا عنصر ہو مگر ایسا کچھ نہیں تھا وہ پہلے کے سے انداز میں ہی ان سے بات کرتے اور یہ باتیں ظاہر ہے ان کے پروفیشن سے متعلقہ ہی ہوتی تھیں۔

جس دن سے فیروزہ آنٹی انہیں سوچو اور نہیں تو سوچنے کی کوشش کرو کی دعوت دے کر گئی تھیں وہ نہ چاہتے ہوئے بھی جب بھی ذرا سی فرصت ملتی سوچنے لگتیں اس ایک موضوع پر جس سے وہ اجتناب کرتی آئی تھیں۔

''کیا مصیبت ہے۔'' کئی بار جھنجھلائیں بھی مگر اس خیال کا آکٹوپس انہیں جکڑ چکا تھا۔

''ڈاکٹر صاحبہ اس کو دیکھیں اس کا بخار نہیں اتر رہا آپ سے کل بھی دوا لے کر گئی تھی اور اس سے ایک دن پہلے بھی مگر افاقہ نہیں ہو رہا اور اسکول جانے کا اتنا شوق ہے اس کو

ایک دن چھٹی نہیں کرتی اسکول سے آتی ہے تو بخار تیز ہو جاتا ہے۔'' وہ دیہاتی حلیے والی مگر اچھی شائستہ اردو میں بات کرتی کچھ پڑھی لکھی عورت لگ رہی تھی چھ سات سال کی کمزور سی گھبرائے گندمی رنگت والی بڑی بڑی آنکھوں کے ساتھ انہیں دیکھتی بچی کے ساتھ ان کے سامنے بیٹھی تھی۔

''کیا عمر ہے اس کی۔''

''اس نومبر میں پورے چھ سال کی ہو جائے گی سولہ نومبر کو۔'' وہ عورت پیار سے اس کالی بھجنگ ہڈیوں کی ڈھانچہ سی بچی کو اپنے ساتھ لپٹائے ہوئے بولی تو ڈاکٹر ندرت نے بے ساختہ چونک کر اس بچی کی طرف دیکھا۔

''کب...... سولہ نومبر کو...... چھ سال کی۔'' وہ لبوں میں بڑبڑائی تھیں ایک بھولا ہوا خیال ایک فراموش یاد کا جھونکا کہیں سے لپکا تھا۔

''نام کیا ہے اس کا'' انہوں نے سر جھٹک کر پیڈ آگے کیا آج...... ادھر آخری دن تھا۔

''مومنہ مزمل جی۔''

اس کا اگلا جملہ بھی انہیں ہلا دینے والا تھا وہ کسی شاک کے زیر اثر بیٹھی کی بیٹھی رہ گئیں۔

''مومنہ مزمل جی'' عورت سمجھی شاید ڈاکٹر نے سنا نہیں دوبارہ دہرا کر بولی۔

''ہوں۔'' بدقت ان کے لبوں سے نکلا۔

''کون سی کلاس میں پڑھتی ہو۔'' نظریں جھکا کر پیڈ پر قلم گھسیٹتے انہوں نے بھاری آ ز میں پوچھا۔

''ٹو کلاس میں۔'' بچی جھٹ سے بولی تو انہوں نے بے اختیار نگاہیں اٹھا کر اس پُر جو بے حد کمزور سی بچی کو دیکھا۔

''کیا وہ بھی ایسی ہوگی۔'' ان کے اندر کوئی پرانی یاد کرلا رہی تھی۔ وہ بس یک ٹک اسے دیکھے گئیں۔

''ڈاکٹر صاحبہ اس کا بخار کیوں نہیں اتر رہا دیکھیں تو کتنی کمزور ہوگئی ہے کھاتی تو کچھ بھی نہیں اور اسے سمجھائیں ابھی اسکول نہ جائے دو چار دن چھٹی کر لے۔''

اس کی ماں عاجزی سے بولی۔

''نہیں ڈاکٹر صاحب میں چھٹی نہیں کروں گی ورنہ میری کلاس کے بچے آگے نکل جائیں گے۔'' وہ ایک دم سے بولی تو پہلی بار ڈاکٹر ندرت کو اس پر اچانک پیار آیا کبھی وہ بھی ایسی دیوانی ہوتی تھیں اسکول جانے کے لیے کبھی چھٹی نہیں کرتی تھیں۔

''کیا وہ بھی اس طرح اس شوق اور لگن سے اسکول جاتی ہوگی اف پھر وہی بھولی بسری آواز۔'' ان کے لبوں پر مسکراہٹ آتے آتے دم توڑ گئی۔ ''بیٹا ایک دو دن چھٹی کر لوگی تو طبیعت ٹھیک ہو جائے گی پھر تم زیادہ اچھے طریقے سے پڑھ سکو گی ورنہ روز بیمار پڑنے سے پھر خدانخواستہ تمہیں اسکول سے بہت سارے ناغے کرنے پڑ جائیں گے اور ساری کلاس آگے نکل جائے گی بہتر نہیں کہ تم بس دو چھٹیاں کر لو تمہاری امی اسکول جا کر تمہارا ہوم ورک لے آئیں گی ٹھیک ہو جاؤ تو پھر خوب پڑھنا۔ کیا بنو گی بڑی ہو کر۔''

''ڈاکٹر جی مجھے بہت شوق ہے ڈاکٹر بننے کا آپ کی طرح۔'' بچی فوراً بولی تو انہوں نے ہاتھ بڑھا کر اس کے سر پر پھیرا اور باکس سے ایک پیکٹ بسکٹ اور دو سوئیٹس نکال کر دیں۔

''وعدہ کرو ٹھیک ہو کر خوب پڑھو گی اور ڈاکٹر بنو گی ابھی ہمارے ملک میں ڈاکٹرز کی کمی ہے خاص طور پر دیہاتی علاقوں میں وعدہ۔''

''وعدہ پکا۔'' بچی ان کا ہاتھ تھام کر جوش سے بولی تو وہ مسکرا کر دوسرے پیشنٹ کی طرف متوجہ ہوگئیں۔ پھر شام تک ان کے پاس مریضوں کا رش ہی رہا ایک پل کی فرصت نہیں مل سکی مگر اس قدر مصروفیت کے دوران بھی بار بار اس بچی کی کمزور صورت بڑی بڑی آنکھیں اور پرجوش انداز انہیں ڈسٹرب کرتا رہا بار بار ان کا دھیان بٹ جاتا کوئی تھا جو انہیں پکار رہا تھا کہ میری طرف دھیان دو توجہ کرو کون؟ وہ سوچ کر بھی نہیں سوچنا چاہتی تھیں۔

''میری گاڑی خراب ہوگئی ہے آپ کے ساتھ بیٹھ سکتا ہوں۔'' وہ روانگی کے وقت اپنی گاڑی اسٹارٹ کرنے ہی لگی تھیں کہ ڈاکٹر حارث نے ان کی طرف ذرا جھک کر کہا۔

''وائے ناٹ شیور۔'' انہوں نے بڑی بے دلی سے جواب دیا اگرچہ الفاظ سے ظاہر نہیں ہونے دیا کہ اس وقت ڈاکٹر حارث کو لفٹ دینا ان کے لیے کتنا تکلیف دہ ہے۔

''میں تو حیران ہوتا ہوں کہ اتنے ڈاکٹرز کے باوجود ابھی تک ہمارے دیہاتی علاقے کس قدر پسماندگی کا شکار ہیں کئی کئی دیہات میں ایک ڈاکٹر یا کہیں ایک بھی نہیں اور زیادہ سے زیادہ ہیلتھ وزیٹر وہ بھی اپنی ڈیوٹی سے غیر حاضر لوگ بے چارے حکیموں کے پاس

پیروں فقیروں اور دھاگا گنڈا کرنے والوں کے پاس نہ جائیں تو اور کیا کریں آخر گورنمنٹ اس سلسلے میں ٹھوس اقدامات کیوں نہیں کرتی۔'' ڈاکٹر حارث نے گفتگو شروع کی تو ڈاکٹر ندرت کو تسلی ہوئی کہ سفر کچھ بہتر گزرے گا۔

''بس یہی تو خرابی ہے حکومت ہماری آج تک کوئی ڈھنگ کی آئی نہیں اگر آئی ہے تو اسے ٹک کر کام نہیں کرنے دیا جاتا ابھی حکومت کے قدم بھی نہیں جمتے کہ اکھاڑ دی جاتی ہے ایسے میں ہمیں حکومت کے جمنے اکھڑنے کا انتظار کیے بغیر خود سے کچھ اضافی ذمہ داریاں اپنے کندھوں پر لے لینی چاہئیں اور یہ کیمپنگ اس کی ایک کڑی ہے اور میری کوشش تو ہے کہ اس کی ریچ کو اور بڑھایا جائے دور افتادہ علاقوں تک ابھی بھی ہماری رسائی نہیں اور پھر آپ کے سامنے کی بات ہے جتنے بھی ڈاکٹرز ہمارے اسٹاف میں ہوتے ہیں وہ ایسے مواقع پر عموماً کوئی معقول عذر گھڑ لیتے ہیں میں کسی کو مجبور تو نہیں کر سکتی سوائے کوشش کے۔''

وہ بڑی مہارت سے گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے مفصل انداز میں جواب دینے لگیں ڈاکٹر حارث نے ایک ترچھی نگاہ ڈاکٹر ندرت کے چہرے پر ڈالی۔

اس عورت کے سینے میں کام کے علاوہ اور کوئی جذبہ ہے ہی نہیں۔

''کوشش بھی اچھی چیز ہے اگر خلوص دل سے کی جائے تو۔'' وہ جتانے والے انداز میں بولے تو ڈاکٹر ندرت نے چونک کر انہیں دیکھا اور فوراً ہی نگاہیں پھیر لیں۔

''درست کہا آپ نے بندے کو حکم صرف کوشش کا ہے نتائج کی ذمہ داری اس کی نہیں یہ اللہ کے کرنے کے کام ہیں اور آپ کا شکریہ دو دن بعد سہی آپ نے جوائن تو کیا ورنہ تین ڈاکٹرز کے ساتھ اتنے وسیع علاقے کو کور کرنا خاصا مشکل تھا۔''

''طنز کر رہی ہیں۔''

''ہرگز نہیں شکریہ ادا کر رہی کیونکہ یہ کیمپنگ کوئی لازمی نہیں اس کی چوائس آپشنل ہے میں اس کے لیے کسی کو بھی مجبور نہیں کر سکتی جو شامل ہو جائے اس کا شکریہ ادا کرنا مجھ پر واجب ہو جاتا ہے۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولیں۔

''یہ آپ کا ذاتی کام تو نہیں کہ آپ فرداً فرداً شکریہ ادا کرتی ہیں۔'' وہ جتا کر بولے۔

''کوئی میرے مشن میں میری مدد کرے گا تو گویا میری ذاتی مدد ہوئی شکریہ تو پھر بنتا ہے نا۔'' وہ مسکرا کر بولیں تو ڈاکٹر حارث بھی مسکرانے لگے۔

''ایک بات پوچھوں۔''

''نہیں۔'' وہ فوراً بولیں۔

''کیوں؟''

''اس وقت نہیں بہت تھکی ہوئی ہوں کوئی سوال جواب نہیں کر سکوں گی۔''

''تو میں ڈرائیو کر لوں۔''

''شیور آپ کو زحمت نہ ہو تو۔'' وہ فوراً بریک لگاتے ہوئے بولیں تو ڈاکٹر حارث سر ہلا کر اپنی طرف والا دروازہ کھولنے لگے۔

اس وقت ڈاکٹر حارث کے استفہام سے بچنے کا اور کوئی محفوظ طریقہ نہیں تھا۔

☆

''ماما ماما میں رات کو کیسے سوؤں گی مجھے ڈر لگے گا آپ کے بغیر۔'' وہ وارڈ میں تھیں جب انہوں نے اپنے عقب سے یہ معصوم آواز سنی۔

''میری جان بس دو چار دنوں کی بات ہے آپ کے پاس پاپا ہوں گے نا آپ پاپا کے ساتھ سو جانا۔'' بچی کی ماں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''پاپا زور زور سے خراٹے لیتے ہیں مجھے اور ڈر لگتا ہے۔'' وہ فوراً منہ بسور کر بولی۔

''بری بات بیٹا پاپا تھکے ہوئے ہیں نا اس لیے، اچھا میں زلیخا سے کہوں گی رات کو تمہارے کمرے میں سو جائے۔''

''نہیں ماما زلیخا کے کپڑوں سے سمیل آتی ہے۔''

بچی فوراً بولی۔

''تو پھر میرے بیٹے اس کا کیا حل ہو ماما کو تو اب کچھ دن ادھر رہنا پڑے گا ہاں اگرچہ یہ حادثہ نہ ہو جاتا تو شاید دو چار دن بعد میں ادھر آتی مگر اب تو مجبوری ہے اور میری بچی تو بہادر ہے بالکل نہیں ڈرے گی پرامس اپنے ٹیڈی بیئر اور باربی کو ساتھ سلا لینا۔'' ماں اسے تسلی دیتے ہوئے بولی۔

''ماما بھائی کب آئے گا۔'' بچی اچھی خاصی باتونی لگتی تھی۔

''جلد ہی۔'' ماں شاید ٹالنا چاہ رہی تھی۔

ڈاکٹر ندرت نے بے اختیار دو قدم آگے بڑھ کر اس بچی کو دیکھنا چاہا اس کی پشت تھی ان کی طرف البتہ انہوں نے بیڈ پر لیٹی اس کی ماں کو دیکھ لیا جسے کل شام ہی یہاں ایڈمٹ کیا گیا تھا وہ باتھ روم میں سلپ ہو گئی تھی جس کی وجہ سے اچھی خاصی مخدوش حالت

میں اسے یہاں لایا گیا تھا اس کے ایگزٹ ٹائم میں تو ابھی پندرہ بیس دن باقی تھے مگر جیسی اب اس کی حالت تھی اس کے باعث شاید دو ایک دن میں ہی آپریٹ کرنا پڑ جائے عورت اچھی خاصی تکلیف میں تھی پھر بھی بڑے حوصلے اور پیار سے بچی کے مسلسل سوالوں کا جواب دے رہی تھی اس کے تین چار ضروری ٹیسٹ اور الٹرا ساؤنڈ ہونے تھے جن کی رپورٹس کی روشنی میں ہی یہ فیصلہ کیا جانا تھا کہ اس کا آپریشن کب کیا جائے۔

عورت ڈاکٹر ندرت کو دیکھ کر بڑے تکلیف دہ انداز میں مسکرائی تھی۔

"بیٹی ہے آپ کی۔" انہیں مروتاً پوچھنا پڑا۔

"جی ڈاکٹر صاحبہ میری جان سمجھیں اس طوطے میں ہے۔" اس نے بے اختیار محبت سے پاس کھڑی بچی کو ہاتھ بڑھا کر اپنے پاس کر لیا۔

"ہوں۔" وہ ممتا کے اس برملا اظہار پر سر ہلا کر آگے بڑھ گئیں۔

ویسے بھی یہ کیس ڈاکٹر میمونہ کے پاس تھا اس وارڈ میں ان کی تین پیشنٹ تھیں جن کے چیک اپ کے لیے وہ آئی تھیں اور وہ ہو چکا تھا اس لیے وہ باہر جانے والے دروازے کی طرف بڑھیں۔

"ڈاکٹر صاحب، ڈاکٹر صاحب میری ماما کب گھر جائیں گی۔" بچی ایک دم سے ہی لپک کر ان کے پیچھے آئی تھی اور بڑے بے تکلف انداز میں ان کا ہاتھ ہلا کر بولی۔

"جلد ہی ان شاء اللہ آپ اللہ سے دعا کریں اللہ بچوں کی دعا جلد قبول کرتے ہیں۔" ڈاکٹر ندرت نے اس کا گال سہلا کر کہا تو بچی پھر بھی بڑے فکرمندانہ انداز میں انہیں دیکھتی رہی۔

پنک کلر کی شارٹس اور شرٹ میں پنک پنیں لگائے بچی خود بھی اچھی خاصی پنک تھی۔

"ڈونٹ وری فکر نہیں کرتے اللہ آپ کی مدر کو جلد اچھا کر دیں گے آپ دعا کریں۔" انہوں نے ایک بار پھر اس کا گال چھو کر کہا اور آگے بڑھ گئیں۔

"ڈاکٹر صاحبہ میری ماما کو کچھ ہو گا تو نہیں۔" وہ پھر ایک دم سے آگے آئی تھی۔

"کچھ نہیں ہو گا کہا نا آپ دعا کریں۔" وہ پھر سے اسے تسلی دے کر آگے بڑھ گئیں تو وہ تشویش بھرے انداز میں انہیں دیکھتی وہیں کھڑی رہ گئی۔

☆

وہ انہیں آج کل اتنی کیوں یاد آ رہی تھی جسے انہوں نے کبھی یاد رکھنے کے قابل ہی

نہیں سمجھا تھا۔

پہلی بار وہ انہیں کب یاد آئی تھی...... وہ سوچنے لگیں جب پہلی بار گلاسکو میں ٹرین میں سفر کے دوران چھ ماہ کی وہ چھوٹی سی بچی جو اپنے باپ کی گود میں تھی اور اس کی ماں بڑی مہارت سے اس کی نیپی چینج کر رہی تھی اور بچی کلکاریاں مارتے ہوئے تیز تیز ہاتھ پاؤں چلاتے ہوئے ماں کی کوشش کو ناکام کیے دے رہی تھی اور ماں باپ دونوں بچی کی اس حرکت پر ہنس دیے تھے خوش ہو رہے تھے مغرب میں اس طرح کے نظارے کم ہی نظر آتے ہیں مگر قدرت نے شاید اس طرح سے اس نظارے کی ٹائم سیٹنگ کی کہ ڈاکٹر ندرت کے مشاہدے کی گرفت میں یہ منظر ہمیشہ کے لیے جکڑا جائے۔

اور پہلی بار اس کی یاد کی اٹھتی لہر نے ان کے دل میں بھنور سا ڈالا تھا جسے وہ اپنی راہ کی رکاوٹ سمجھ کر بہت پیچھے چھوڑ آئی تھیں۔

پھر کئی دنوں تک یہ منظر انہیں یاد آ آ کر ڈسٹرب کرتا رہا اور اس ڈسٹربنس سے مجبور ہو کر وہ اس گھر کا نمبر ملانے پر مجبور ہو گئیں جس سے نکلتے سمے انہوں نے دل میں عہد کیا تھا کہ پلٹ کر اس گھر سے کبھی کوئی تعلق نہیں رکھیں گی۔

"کون؟ آپ کون۔" دوسری طرف کوئی اجنبی نسوانی آواز تھی۔ وہ اپنا تعارف کروانے کی بجائے اس آواز کا تعارف جاننے کے لیے بے چین ہو گئیں۔

اگرچہ وہ سب کچھ چھوڑ کر اپنے تئیں ساری کشتیاں جلا آئی تھیں مگر نہیں ابھی راکھ کے ڈھیر میں بہت سی چنگاریاں باقی تھیں اس کا احساس انہیں وہ آواز سن کر ہوا تھا۔

اور جب اس اجنبی آواز نے بتایا کہ وہ اس گھر کی نئی مالکن ہے پورے استحکام کے ساتھ تو انہوں نے بے حد خاموشی سے ریسیور رکھ دیا اور پھر اپنے ذہن اور دل کا ہر تعلق اس نمبر سے اس گھر سے اور اس کی یادوں سے منقطع کر دیا۔

پھر اگلے چھ سالوں کی مدت میں انہوں نے ایک پل کو بھی اس منظر کو یاد کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

ہزاروں زندگیوں کو اپنے ہاتھوں سے مسیحائی بخشتے ہوئے ایک پل کو بھی انہیں اس ننھی جان کا خیال نہیں آیا تھا جسے وہ روتے ہوئے اپنے ماضی کے ایک اندھیرے دریچے کے پیچھے چھوڑ آئی تھیں۔

"کیا میں واقعی پتھر دل ہوں یا تھی۔" اس منظر نے جب جب یاد دہانی کروائی

ان کے دل سے یہ سوال ضرور اٹھتا تھا۔

اور آج کل ...... آج کل تو جیسے ہر پل ہر لمحے کے ہاتھ میں یہی پتھر جیسا سوال تھا جو آتے جاتے انہیں سنگسار کیے دے رہا تھا۔

آخر میں کیوں اس کے بارے میں اتنا سوچ رہی ہوں جب انہوں نے مجھے اپنی زندگی سے کسی حرف غلط کی طرح مٹا ڈالا تو میرا ان سے کیا تعلق باقی ہے اور اسے تو میں خود اپنی خوشی سے خود سے جدا کر آئی تھی پھر اب یہ سوچیں۔

لیکن اس کے باوجود یہ حقیقت اپنی جگہ قائم کی ہے کہ وہ میری بیٹی ہے اور اسے میں خود سے کتنا بھی الگ کاٹ کر پھینکوں جدا نہیں کر سکتی اور میری حماقت کہ جب مجھے اس گھر کی نئی مالکن کا علم ہوا تو اپنی بچی کے بارے میں حق جتانے کا وہ سب سے بہترین موقع تھا۔

مگر میں اس موقع سے فائدہ کیوں اٹھاتی جبکہ اس کا وجود میرے لیے کسی راہ کے پتھر کے برابر تھا مجھے ہائر اسٹڈیز کے لیے اسکالر شپ پر باہر جانا تھا پھر اسے میں کیسے اون کر سکتی تھی جس مقصد کے لیے میں نے وہ گھر چھوڑا اس شخص سے ہر تعلق توڑا اس مقصد کو میں کیسے پس پشت ڈال سکتی تھی مگر اب تو وہ کٹھن دور گزر چکا بس جس مقصد کو حاصل کرنا چاہتی تھی اپنے پیشے میں مہارت کی جس بلندی کو چھونا چاہتی تھی وہ حاصل کر چکی تو اب کیا رکاوٹ ہے میں اپنی بیٹی کو اپنے پاس لے آتی ہوں اپنی سگی ماں کے ہوتے ہوئے وہ کسی دوسری عورت کے رحم و کرم پر کیوں رہے اور یہ جو آنٹی فیروزہ کہتی ہیں کہ ایک اکیلی عورت اس معاشرے میں نہیں رہ سکتی تو یہ اس نکتے کا بھی حل ہے۔

کمال ہے مجھے یہ خیال پہلے کیوں نہیں آیا، یہ نادر نکتہ انہیں گھنٹہ بھر کی اس گہری سوچ کے دوران ہی سوجھا تھا جو وہ گھر آ کر سوچتی رہتی تھیں اس بچی کو دیکھ کر انہیں خیال آیا تھا کہ ان کی اپنی بیٹی بھی اس ایج کی ہوگی اور جیسے آج کل ان کی ممتا اپنے جگر کے ٹکڑے کو دیکھنے کے لیے بے تاب ہوئی جا رہی ہے اس سے اچھا وقت اور کون سا ہوگا کہ وہ اپنی بیٹی کے لیے دعویٰ کر دیں۔

اس رات وہ ہسپتال سے اٹھ کر گھر نہیں گئیں ان کی گاڑی شہر کے اس حصے کی طرف رواں دواں تھی جس کی طرف وہ کبھی بھولے سے بھی نہیں گئی تھیں ان کا حافظہ نہ تو اتنا کمزور تھا اور نہ ان کی نظر اس کے باوجود انہیں لگ رہا تھا بیچ میں کچھ ہے کیا؟

شاید رات کے گہرے پڑتے اندھیرے میں انہیں اس کیا کا سراغ نہیں مل رہا تھا۔

وہ دو گھنٹے تک ان سڑکوں اور گلیوں میں گاڑی گھماتی رہی اور اس missing نے انہیں شاید اصل رستے سے بھٹکا دیا تھا۔

بالآخر تھک کر وہ واپس آ گئیں۔

اور اگلا پورا ایک ہفتہ ان کی اسی تلاش میں گزرا فون نمبر شاید بدل چکے تھے آپریٹر بار بار نمبر ملانے پر بیچ میں کود پڑتی۔

"تو کہیں گھر بھی نہ بدلا جا چکا ہو۔" فون نمبر بار بار نہ ملنے پر یہ اچانک نکتہ انہیں سمجھ آیا اور جیسے ان کی تلاش دم توڑ گئی۔

"اب کیا کروں؟ اس کے آفس ...... آفس کا ایڈریس تو ہے میرے پاس۔" اندھیرے میں جگنو سا چمکا تھا۔

"جی وہ تو ادھر سے چار سال ہی استعفیٰ دے گئے تھے۔ معلوم نہیں اس کے بعد کدھر گئے۔" اور ان کے گھر کا ایڈریس وہی تھا جہاں وہ ہفتہ بھر گاڑی دوڑاتی رہی تھیں۔

"اوہ میرے خدایا اب کہاں تلاش کروں میں اسے جس کی لگن اچانک ہی میرے دل کو لگی ہے اور ایسی لگی ہے کہ پل کا چین نہیں وہ کہاں ہوگی؟ کیسی ہوگی؟ میرے پاس کب آئے گی میری بانہوں میں ...... میں اسے کب پیار کروں گی ...... معلوم نہیں اس دوسری عورت نے اس کے ساتھ کیسا سلوک روا رکھا ہو اس کی سائیکی میں کیا انہونی تبدیلیاں آ گئی ہوں میرے اللہ میں اس خسارے سے کیوں بے خبر رہی کیوں؟" انہیں دن رات ایک انوکھے سے ملال نے گھیر لیا تھا۔

☆

"بہت غریب گھرانے میں آنکھ کھولی تھی میں نے جہاں دو وقت کی روٹی تو کیا ایک وقت کی روکھی سوکھی ملنا بھی کمال کی بات تھی۔

چھ بہن بھائی آگے پیچھے اور بیچ میں مَیں، ساتویں نمبر پر تین بڑی بہنیں اور تین چھوٹے بھائی اور والد ہمارے نان چنے کی ریڑھی لگاتے تھے پہلے راج مستری کا کام کرتے پھر ایک عمارت سے گر کر ان کی ایک ٹانگ ٹوٹ گئی تو محنت مزدوری سے بھی گئے ماں کے ہاتھ میں لذت تھی ادھار رقم لے کر نان چنے سڑک کے کنارے لگائے دل میں محنت کی لگن تھی سو چند ہی دنوں میں ان کے نان چنے ہاتھوں ہاتھ بکنے لگے مگر ایسا بھی نہیں تھا کہ

خوب ہن برسنے لگا بس گزارا ہونے لگا۔

پورے گھر میں ایک فقط میں ہی جنونی تھی پڑھنے لکھنے کے معاملے میں ورنہ تو کسی کو معمولی سا پڑھنے کا بھی شوق نہیں تھا بڑی دو بہنوں کو تو ابا نے مڈل کرتے ہی اپنے جیسوں میں بیاہ دیا بھائی تینوں ہی پڑھائی سے بھاگنے والے تھے۔

گھر سے بستے لے کر نکلتے بستے کسی تھڑے کے نیچے رکھتے اور سارا دن گلی ڈنڈا، کنچے اور پتنگ بازی میں گنوا کر دوپہر کو گھر آجاتے ان کے پیچھے اسکول جانے والا بھی کوئی نہیں تھا ابا کو اپنے کام سے فرصت نہیں تھی اور ماں چٹی ان پڑھ۔ ان کی آوارگیوں کا پردہ ان کے نئے سال چڑھنے پر فاش ہوتا جب ابا زبردستی اردگرد کے کسی لڑکے کو ان کا نتیجہ معلوم کرنے اسکول بھیجتا تو پتا چلتا وہ تو سال بھر سے اسکول ہی نہیں آئے۔

پھر ابا کا ڈنڈا ہوتا اور ان تینوں کی چیخیں۔ مگر اس کا بھی کوئی فائدہ نہ ہوا ان میں سے دو گھر سے بھاگ گئے اور تیسرا ابا کے ساتھ نان چنے لگانے لگا میری تعلیم سے عشق کا نتیجہ یہ نکلا کہ میں آٹھویں جماعت سے لے کر ایف ایس سی تک اسکالرشپ لیتی رہی یوں میری پڑھائی کسی پر بھی بوجھ نہ بنی۔ اصل مسئلہ اس وقت کھڑا ہوا جب میرا بالکل اچانک غیر متوقع طور پر میڈیکل میں داخلہ ہوگیا۔

ایک ایسا بریک جو ہمارے خاندان کیا گلی محلے میں دور دور تک کسی خاندان میں نہیں آیا تھا۔

میرے نتیجے کی خبر اخبار میں چھپی تھی اور شہر بھر ہمارے گھر مبارکباد کے لیے ٹوٹ پڑا تھا۔

اماں ابا کا خوشی کے مارے برا حال تھا سارا دن لوگ انہیں آکر مبارکبادیں دیتے اور گلے میں پھولوں کے ہار ڈالتے رہتے یہ واقعی ایک انہونی سی بات تھی کہ جس زمانے میں لڑکیوں کا میٹرک کر جانا ماسٹر کے برابر سمجھا جاتا رہا ہو میں نے اس زمانے میں میڈیکل کے لیے کوالیفائی کرلیا تھا۔

اصل مسئلہ میرے داخلے کا تھا۔

اور جب اللہ کسی انہونا کام کو فرمانے کا ارادہ کرلیتے ہیں تو پھر ایسے ذرائع سے اس کام کو ممکن بناتے ہیں کہ جس کا آپ کے تصور میں بھی گمان نہیں ہوتا محلے کے تو نہیں کہ ہمارا محلہ تھا ہی غریب غربا پر مشتمل شہر کے ایک دو رئیسوں نے ازراہ ہمدردی میرا داخلہ

میڈیکل میں کروا دیا اگرچہ مجھے اسکالرشپ بھی ملا تھا مگر ابھی جاری ہونے میں کچھ ماہ تھے پھر اس کے بعد کیا ہوا شاید میں تمہیں لفظوں میں نہ بتا سکوں جس طرح میرے میڈیکل کے وہ پانچ سال پورے ہوئے اور اس کے اخراجات پورے کرنے کے لیے میں نے پرائیویٹ ہسپتالوں اور ڈاکٹروں کی دکانوں پر کام یا بچوں کو ٹیوشنز پڑھائیں مگر اس زمانے میں ایک تو ٹیوشن کا رجحان کم تھا دوسرے ٹیوشن نہ ہونے کے برابر ہی ہوتی تھی اس کے علاوہ ماں کی محنت مزدوری ابا کی ڈبل ڈیوٹی میرا اسکالرشپ، بس اللہ کے فضل سے کسی نہ کسی طرح میرا ایم بی بی ایس مکمل ہو ہی گیا۔

اب مسئلہ ہاؤس جاب کا تھا۔

سفارش کے بغیر اچھے ہاسپٹل میں جگہ ملنا ناممکن تھی میرے سب کلاس فیلوز نے اپنی اپنی اپروچ کے ذریعے شہر کے بڑے ہاسپٹل میں جگہ بنالی اور میں ...... مت پوچھو اس دن مجھے اپنی کم مائیگی اور غربت سے کیسی نفرت محسوس ہوئی۔ اس دن میں نے دل سے دعا کی کہ میرے اللہ اگر کسی کو غریب پیدا کرنا ہو تو اس کے دل میں اس کی اوقات سے بڑھ کر خوابوں خواہشوں کا جہان نہ آباد کیا کر یا پھر اسے پیدا ہوتے ہی کسی حادثے کا شکار کردیا کر میری طرح لب بام پہنچ کر یوں تشنہ لب رہنے سے تو اچھا ہے کہ مر جاؤں۔

اور شاید میں اپنے اس جذباتی ...... دور میں ایسا کوئی جذباتی قدم اٹھا بھی لیتی کہ ایک دوست کے والد کی توسط سے مجھے ایک مناسب ہاسپٹل میں جگہ مل ہی گئی مگر میرا دل جیسے اندر سے ٹوٹ چکا تھا اور میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ اب غربت کے اس جہان میں میں نے واپس نہیں لوٹنا۔

تیسری بہن کو بھی ابا نے جیسے تیسے بیاہ دیا تھا اماں اس دوران غربت کے دکھوں سے ہار گئیں۔ جب انہیں علاج کی ضرورت تھی تو کوئی ڈاکٹر تھا نہ دوا اور جب انہیں اس کی ضرورت نہ رہی تو میں ڈاکٹر بن گئی۔

اور ابا کو بھی شاید اتنی ہی مہلت تھی کہ مجھے کامیاب کر جائیں میرا ہاؤس جاب مکمل ہونے کے ایک دن بعد وہ اچانک ہی سوتے رہ گئے۔

اور میں ایک ڈاکٹر ہونے کے باوجود اپنے ماں باپ کے کسی درد کا مداوا نہ کرسکی۔ میں ہاسٹل میں آگئی۔

انہیں دنوں سیٹھ جہانگیر دل کے عارضے میں مبتلا ہمارے ہسپتال میں زیر علاج

رہے میں نے جی جان سے ان کی خدمت کی۔

اور پتا ہے تمہیں ایک دل کی بات بتاؤں اپنے دل کے وہ چور گوشے جسے میں خود کو بھی نہیں دکھا سکتی تھی۔

سیٹھ جہانگیر کی بیوی فوت ہو چکی تھی اور وہ لاولد بھی تھے کہ جائیداد اس زمانے میں بھی کروڑوں میں تھی اور میں نے باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت سیٹھ جہانگیر کا دل جیتنے کی کوشش شروع کر دی۔

اور میری قسمت کا کمال دیکھو جو میں نے چاہا وہ پا بھی لیا سیٹھ جہانگیر صحت یاب ہو کر گئے اور اگلے ہی دن میرا ہاتھ طلب کرنے میری اسی دوست کے والد کے پاس چلے آئے۔

بھائی تو تینوں ہی باہر جا چکے تھے اور بہنیں اپنی دنیاؤں میں مگن ...... انکل نے مجھ سے پوچھا اور مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا یہ تو میری دعاؤں کا ثمر تھا میں کیسے ٹال مٹول کرتی۔ اگلے ہی ہفتے بیگم جہانگیر بن کر اس شاندار کوٹھی میں آ گئی۔

مجھے لگا میں نے اپنی زندگی کے ہر مقصد کو پا لیا جو چاہا جیسے چاہا مجھے مل گیا۔

مگر یہ دنیا ہے یہاں ایسا کم ہی ہوتا ہے بلکہ شاید ہوتا ہی نہیں کہ آدمی باکمال بامراد زندگی گزار سکے تمہیں پتا ہے میں نے سیٹھ جہانگیر سے شادی کیوں کی تھی؟'' وہ رکیں۔

''ان کے پاس ڈھیروں ڈھیر پیسہ تھا میں نے سوچا ان کے پیسے کی مدد سے اپنا ایک شاندار کلینک بنواؤں گی ہائر اسٹڈیز کے لیے باہر جاؤں گی اور طب کی دنیا میں مجھ سے بڑا گائناکولوجسٹ اور کوئی نہیں ہوگا اور حیف ان حسرتوں پر اور خواہشوں پر جن کے پیچھے حرص اور طمع ہوتی ہے۔ انہوں نے کہا۔

''عشرت میری ایک بات آج سے ہماری زندگی کی اس اولین ساعت سے اپنے دل کے سب سے محفوظ گوشے میں محفوظ کر لینا کہ ہمارے خاندان میں عورتیں جاب نہیں کرتیں ہم لوگ یہ گوارا کر ہی نہیں سکتے کہ ہماری عورتیں ٹکے ٹکے کی نوکری کے لیے دوسروں کی غلامی کرتی پھریں ہمارے پاس اللہ کا دیا سب کچھ ہے تم نے ڈاکٹری اس لیے پڑھی تھی تا کہ چار پیسے کما کر اپنے ماں باپ کی غربت کو کم کر سکو تو چلو یہ عذر بھی دور ہوا کہ تمہارے ماں باپ ہی نہ رہے اور اگر بالفرض ہوتے بھی تو میں تمہیں ان کے لیے کسی بھی نوکری کی اجازت نہ دیتا اور ......''

''مگر یہ نوکری نہیں یہ تو میرے دل کی خوشی اپنے لوگوں کی خدمت دکھی ......'' میں

نے کہنا چاہا۔

''بس اس سے زیادہ ڈائیلاگ بازی نہ میں سن سکتا ہوں اور نہ آئندہ تمہارے منہ سے سنوں یہ دکھی انسانیت کی خدمت کا ٹوکرا اٹھا کر گھر سے باہر پھینک دو نہیں تو اس کوٹھی کے پچھواڑے میں بہت جگہ ہے کہیں بھی گڑھا کھود کر دفنا دو مگر اب دوبارہ میرے سامنے ان خرافات کا ذکر نہ کرنا میں نے تم سے شادی صرف اپنا گھر بسانے کے لیے کی ہے نہ کہ غیر مردوں کے بیچ تمہیں بے شرمی سے اسٹیتھو اسکوپ لٹکائے بے شرمی سے بڑبڑ بولتے اور گھومتے دیکھنے کے لیے بس آج کے بعد تمہارے دل و دماغ سے اس ڈاکٹری واکٹری کا خیال نکل جانا چاہیے بس۔''

اور میں سمجھی ابھی نیا نیا معاملہ ہے زیادہ ضد کروں گی تو انہیں اور ضد ہوگی ذرا اپنے پیار کے جادو سے زیر اثر کروں گی تو ہر بات منوا سکوں گی مجھے ضبط اور حوصلے سے کام لینا ہوگا، میں نے اپنے دل کو یہ سمجھا کر بہلا لیا مگر یہ میری بھول تھی۔

چند دن کیا چند مہینے کیا سالوں پر سال گزرتے رہے اور میں سیٹھ جہانگیر سے یہ بات ایک واحد اپنی زندگی کی خوشی نہ منوا سکی۔

آہستہ آہستہ میرے اندر کی پرجوش سرگرم متحرک ڈاکٹر عشرت مرتی چلی گئی اور اس کی قبر سے ایک مردہ دل خاتون خانہ عشرت جنم لیتی گئی میں یہ نہیں کہتی کہ ہاؤس وائف بے کار ہوتی ہے اس کے کام کسی گنتی شمار میں آتے مگر ایک پروفیشنل ڈگری رکھنے والی قابل عورت کو گھر کی رسی سے باندھ کر ہاؤس وائف بننے پر مجبور کر دیا جائے تو پھر اس سے بڑا اور کوئی ظلم ہو نہیں سکتا ریاست پر بھی اور لوگوں پر بھی اور خود اس عورت پر بھی اور میں چپ چاپ یہ ظلم سہنے پر مجبور ہو گئی بس یہی سوچ کر کہیں تو سیٹھ جہانگیر کو اپنے دل کی اس اکلوتی خواہش کو ماننے پر مجبور کر سکوں گی میری قابلیت صرف نوکروں کی بیماری ان کے بچوں کے علاج تک محدود ہو کر رہ گئی اور ایک مدت بعد میری دلچسپی اس میں بھی عنقا ہو گئی۔

طب کی دنیا میں روز نئی سے نئی دریافت ہو رہی ہے نئی نئی دوائیاں، بیماریاں ان کے علاج، تو میرا بیس سال پہلے کا سڑا بسا ایم بی بی ایس کیا کام کرتا اور میری جان مجھے نہیں پتا تھا، مگر اس معجزے پر یقین نہیں تھا کہ جینز میوٹیشن کتنا اثر رکھتی ہے میرا ولولہ میرا جنون سارے کا سارا تم میں منتقل ہو گیا۔

اور وہی سیٹھ جہانگیر جسے میرے ڈاکٹر ہونے کے حوالے سے نفرت تھی تمہار۔

شوق اور جنون کا سن کر کیسے فخریہ انداز میں تمہیں دیکھا کرتا تھا۔

"محض رشتوں کے فرق سے سوچیں اتنی بدل جاتی ہیں مجھے علم نہیں تھا۔

میرا شوہر میری ڈگری سے خائف تھا اور وہ تمہارا باپ بن کر تمہیں وہی نوکری وہی قابلیت پانے کے لیے اکساتا تو اس کے باوجود میرے دل میں تمہارے لیے کوئی حسد کوئی رقابت سر نہ اٹھاتی شاید ماں نام اس رشتے کا ہے جو آپ سے کبھی بھی کسی بھی معاملے میں حسد نہیں کرسکتا۔

"اور میری بیٹی بس ایک بات کا خیال رکھنا وہ دور کہ جو ہر انسان پہ آتا ہے محبت کا دور اپنی ذات کے خفیہ بھید کسی من چاہے شخص کے ساتھ شیئر کرنے کا خوب صورت احساس تم پر غالب آئے تو صرف محبت کرنا محبت کے ساتھ غرض اور پلاننگ کو شامل نہ کرنا ورنہ تمہارے ہاتھ کچھ بھی نہیں آئے گا نہ محبت نہ پلاننگ!"

"اور میری بھولی ماں نے واقعی تیری اس نصیحت کو گرہ سے باندھ لیا تھا اور دونوں میں سے ایک ہی کو اپنانے کی کوشش کی تھی اور دیکھ لے آج تیری بیٹی بھی تیری طرح تہی داماں ہے خالی ہاتھ، خالی جھولی۔

نہ اس کے پاس محبت ہے نہ کوئی منصوبہ نہ کوئی خواب بس اس شوق اور جنون کی پرچھائیں جن کے پیچھے وہ سرپٹ بھاگ رہی ہے وہ شوق اور جنون جس کا بیج تو نے اس کی جینز میں بویا تھا آج وہ تناور درخت بن چکا ہے کہ چاہوں بھی تو اپنی ذات سے الگ نہیں کرسکتی۔"

ڈاکٹر ندرت نے بے اختیار آنکھ سے ڈھلکتے اس اکلوتے آنسو کو انگلی کی پور میں سمویا جو ڈاکٹر عشرت کی تصویر کے آگے کھڑے یادوں کے اس بھنور میں ڈوبتے ابھرتے اس کی آنکھ میں اتر آیا تھا۔

وہ ڈاکٹر عشرت جسے انہوں نے ہمیشہ ایک باوفا بیوی خدمت گزار شریک حیات اور دکھ بانٹنے والی ہمدرد ماں کے روپ میں دیکھا تھا اسے تو بہت دیر بعد ہوش سنبھالنے کے بہت دنوں بعد جا کر پتا چلا تھا کہ اس کی ماں ایک قابل عورت ہے ڈگری ہولڈر ذہین ڈاکٹر جو اس کے باپ کی عالیشان کوٹھی میں قیمتی سامان جھاڑنے اور اس کی دیکھ بھال پر مامور ہے، اور کتنے دن وہ اس انکشاف کے شاک میں رہی تھی اور پھر اس کی ہمدرد محبت کرنے والی ماں نے ہی اسے اس شاک سے نکالا تھا۔

"ندرت میری بیٹی میرا کفارہ تمہیں ادا کرنا ہوگا میرے لوگوں کا مجھ پر قرض ہے جو انہوں نے مجھے اس ڈگری اور مہارت کے عوض دیا تھا اور میں چکا نہیں سکی یہ قرض سود در

سود بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے میرے دل پر، تم اس قرض کو میرے دل کے اس بوجھ کو اتارو گی نا۔" اور انہوں نے سچے دل سے پوری ذات کی سچائی کے ساتھ اقرار کیا تھا کہ وہ اپنی ماں کے اس قرض کو ضرور اتاریں گی اور ان کا اللہ گواہ ہے انہوں نے کس طرح اپنی جان لڑا کر اس قرض کو چکانے کی کوشش کی تھی بس صرف ایک غلطی ہوئی اندازے کی غلطی! ان کی ماں سے اس تخمینے میں اندازے کی غلطی کہ محبت یا پلاننگ میں سے ایک کو اپنانا اور انہوں نے تو پوری لگن سے اپنے جسم و جاں اور دل کی سچائیوں سے حزل کو چاہا تھا۔

حزل کی محبت جب ان کے دل میں پیدا ہوئی تو انہیں یوں لگتا تھا جیسے ان کا دل مٹی کا کوزہ ہو اور حزل کی محبت کا پانی اس میں سے چھلکا جا رہا ہو اس پانی کو اس کوزے کی حدوں میں رکھنا ان کے لیے کیسا محال ہو رہا تھا۔

وہ دن کیسے دن تھے؟

اچانک ان کے دماغ کی اسکرین پر منظر بدل گیا ان کی ماں کی دکھی دکھی سی تصویر کی جگہ حزل کی خوب صورت وجیہہ مضبوط سراپے والی شبیہہ نے پورے منظر کو اپنے حصار میں لے لیا تھا۔

☆

اس کا ہاؤس جاب میں آخری سال تھا بلکہ آخری مہینہ جب کچھ زخمی طلبہ کو ان کے ہسپتال کی ایمرجنسی میں لایا گیا۔

کسی طلبہ تنظیم کے دوران ہونے والے جھگڑے کا نتیجہ یہ زخمی طلبہ تھے انہی میں حزل بھی تھا۔

اگرچہ وہ شدید زخمی نہیں تھا کہ گولی اس کے کندھے کا گوشت چیر کر باہر نکل گئی تھی مگر پھر بھی اس کا خون کافی بہہ گیا تھا۔

"ینگ مین جب اس طرح کے تھرل کرو گے تو نتیجہ ایسا ہی نکلے گا ہائے وائے کرنے کا کیا فائدہ۔" ڈاکٹر جمشید نے ندرت کو اس کی ڈریسنگ میں مدد دینے کے دوران کہا "تو ڈاکٹر صاحب میں تو یوں سمجھیں گیہوں کے ساتھ گھن کے حساب میں پیسا گیا۔" وہ کراہ کر فوراً صفائی دیتے ہوئے بولا۔

"گویا یونہی گولیوں کو پٹاخے جان کر تماشا دیکھنے آگے چلے گئے۔" ڈاکٹر جمشید کون سا اس کی بات کو سچ سمجھنے والے تھے۔ "نہیں ڈاکٹر صاحب میں تو اپنی ڈگری نکلوانے

گیا تھا کیمپس بلکہ نکلوا کر نکل رہا تھا کہ اچانک وہاں فائرنگ ہونے لگی اور ہائے۔" ایک زوردار کراہ پھر سے اس کے منہ سے نکلی۔

"اوہو بھئی پھر تو واقعی تم سے ہمدردی کی جاسکتی ہے۔"

وہ افسوس کرتے ہوئے بولے۔ "کرتے کیا ہو؟"

"جاب کرتا ہوں سر۔" وہ اب بینڈیج کرواتے ہوئے قدرے پرسکون سا تھا۔

ڈاکٹر جشید اس سے ایک دو باتیں کرنے کے بعد آگے بڑھ گئے۔ "ڈاکٹر صاحب میرا زخم گہرا تو نہیں آئی مین کوئی سیریس مسئلہ" وہ ڈاکٹر جمشید کے جاتے ہی اس سے بولا۔

"نہیں کوئی سیریس مسئلہ نہیں۔" وہ سنجیدگی سے پٹی لپیٹتی رہی۔

"مجھے چھٹی کب ملے گی میرا مطلب ہے کتنے زور میں۔" وہ اچھا خاصا باتونی لگتا تھا یا جان بوجھ کر بولے جا رہا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر میں۔"

"آئیں یہ کیا بھئی مجھے گولی لگی ہے کوئی مذاق ہے۔" وہ برا سا مان کر بولا۔

"جناب گولی لگی نہیں گولی چھو کر نکل گئی ہے۔" اس نے قینچی سے پٹی کاٹتے ہوئے ناٹ لگائی۔

"تو گویا آپ لوگ چاہتے تھے مجھے گولی لگ جاتی۔"

"بھئی ہم کیوں چاہیں گے بھلا خدانخواستہ آپ کو گولی لگتی۔" وہ چڑ کر بولی۔

"کم از کم آپ کو تو چاہنا چاہیے۔" وہ یکدم اس کے چہرے کے پاس ہو کر بولا وہ پزل سی ہوگئی۔

"کیوں میں کیوں چاہوں گی۔" وہ اب جلدی جلدی ناٹ لگا رہی تھی کہ انگلیوں میں خوامخواہ کپکپاہٹ سی آگئی تھی۔

"کیونکہ میں چاہتا ہوں کہ مجھے گولی لگتی اور میں کچھ دن تو آپ کے ان مسیحا ہاتھوں کی مسیحائی سے فیض یاب ہوسکتا۔" وہ یکدم اس کی کپکپاتی انگلیوں کو اپنے ہاتھ میں لے کر بے باکی سے بولا تو وہ ایک دم سے تپ گئی۔

"شرم نہیں آتی آپ کو یوں چیپ حرکت کرتے ہوئے۔" اس نے اپنی انگلیاں پیچھے کو کھینچیں۔

"کیا دلی جذبات کا اظہار کرنا سچ بولنا چیپ ہوتا ہے۔" اس نے ندرت کی انگلیاں دبا کر چھوڑ دیں اور معصومیت سے پوچھنے لگا تو وہ گڑبڑا سی گئی۔

"اب کل پٹی کروانے تو آسکتا ہوں زخمی تو ہوا ہوں نا کہ وہ بھی نہیں۔" وہ فرسٹ ایڈ ٹرے میں سامان سمیٹ رہی تھی جب وہ بھولپن سے بولا۔

"جی اس کی بھی کوئی خاص ضرورت نہیں ادھر کسی بھی ڈسپنسر سے کروا لیجیے گا۔" وہ رکھائی سے بولی۔

"کمال ہے کیسا ہسپتال ہے کسی زخمی جان سے جاتے انسان کی زندگی کی پرواہ ہی نہیں۔" وہ کوفت سے بولا۔ "خدانخواستہ کوئی جان سے نہیں جا رہے ڈاکٹر جمشید ابھی آپ کو میڈیسن لکھ دیتے ہیں دو چار روز کھا کر ٹھیک ہو جائیں گے۔"

"مشکل لگتا ہے۔"

"کیا مشکل لگتا ہے۔" وہ رک گئی۔

"ٹھیک ہونا۔" وہ آہ بھر کر بولا۔

"ایسا گہرا زخم نہیں لگا آپ کو۔" وہ تسلی دینے والے انداز میں بولی۔

"ذرا میرے سینے پر ہاتھ رکھ کر دیکھیں آپ کو پتا چلے گا دل پر کیسا گہرا گھاؤ لگا ہے آپ کے دست شفا کے سوا نہیں بھرنے والا۔" وہ پکے عاشقوں کی طرح سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کراہ کر بولا تو وہ اپنی مسکراہٹ دباتے آگے بڑھ گئی۔

اور اسے معلوم نہیں تھا کہ یہ مریض عشق اگلے دن بھی پٹی کروانے اس کے سر پر سوار ہو جائے گا جبکہ وہ رات بھر میں اسے فراموش کر چکی تھی۔ "اب مجھے بھولنا ممکن نہیں ڈاکٹر ندرت، صرف آج کی بینڈیج سے کام نہیں چلے گا۔" وہ جو ڈاکٹر جمشید کے کہنے پر بادل نخواستہ اس کی پٹی بدل رہی تھی اس سے سرگوشی میں بولا۔

"آپ آرام سے نہیں بیٹھ سکتے بار بار ہل رہے ہیں۔" وہ اس کے ہلنے پر جھنجھلا کر بولی۔

"جب بار بار درد ہوگا تو ہلوں گا تو ضرور۔" وہ چہرے پر درد کی کیفیت لاتے ہوئے بولا۔

"کہاں درد ہے۔" وہ پوچھنا نہیں چاہتی تھی پھر بھی منہ سے نکل گیا اور پھر پچھتائی۔

"یہاں۔" اس نے جھک کر اپنے سینے پر ہاتھ رکھا۔ "مگر یہ درد لاعلاج ہے۔" وہ اسے گھور کر بولی۔

"معلوم ہے اس لیے تو یہ روگ لگا لیا ہے بس اس کا مسیحا ہر دم ساتھ رہے تو پھر اس کا مریض اتنی جلدی ایکس پائر نہیں ہوتا۔" وہ آہ سی بھر کر بولا تو بے اختیار اس کے لبوں پہ مسکراہٹ آ گئی۔

"ہنسی اور پھنسی۔" وہ اس کی مسکراہٹ دیکھ کر چہک گیا۔

"شٹ اپ میں تو آپ کی یہ فلاپ ایکٹنگ دیکھ کر ہنسی ہوں۔" وہ اپنی مسکراہٹ چھپاتے ہوئے بولی۔

اور یہ اس کی بھی بھول تھی کب وہ ہنسی اور پھنسی! م... کے اس سنہری جال میں وہ کسی مرغ بسمل کی طرح پھنستی چلی گئی۔

محض تیسری ملاقات میں وہ مزمل کی محبت کے آگے اپنا آپ ہار بیٹھی تھی۔

پہلا اعتراض بھی ممی نے کیا۔

"میں نے تمہارے باپ کی دولت دیکھ کر اس سے شادی کی تم کیا دیکھ کر اس پر ریجھ رہی ہو نہ دولت نہ اسٹیٹس اور نہ وہ تمہارے جتنی قابلیت رکھنے والا کیا کرو گی ایسے قلاش سے محبت کر کے۔" اسے ممی کا طعنہ کسی تیر کی مانند دل پر جا کر لگا۔

"جی آپ نے کہا تھا محبت کرنا تو کسی لالچ اور طمع کے بغیر شاید آپ بھول گئیں۔" اس نے انہیں یاد دلایا۔

"مگر میں نے یہ بھی نہیں کہا تھا کہ اس محبت کے ہاتھوں گروی ہو جاؤ اور غربت کی دلدل میں اتر جاؤ۔"

"ممی مزمل نہ تو اتنا قلاش ہے نہ اتنا مفلوک الحال وہ مڈل کلاس سے تعلق رکھتا ہے ماسٹر ڈگری ہولڈر ہے برسر روزگار ابھی اچھی جاب نہیں کل کو مل بھی سکتی ہے پھر بے روزگار تو نہیں اس کوٹھی جیسا نہ سہی اس کے آدھے رقبے کے برابر ان کا اپنا ذاتی گھر ہے گاڑی نہ سہی بائیک تو ہے پھر ہم دونوں مل کر کمائیں گے تو کیا نہیں حاصل کر سکتے۔" اس کے پاس ممی کے ہر اعتراض کا جواب موجود تھا۔

"یہ بھی پتا کر لو کہ وہ تمہیں گھر سے نکلنے بھی دے گا یا نہیں، تمہیں ان مڈل کلاس مردوں کی ذہنیت کا علم نہیں۔"

"اور ممی آپ نے بھی تو اپر کلاس کی ذہنیت کو جانچے بغیر ایک رسک لیا تھا اور محبت ہے ہی ایک جوئے کا نام تو یوں پھونک پھونک کر کھیلیں جب دل جیسی قیمتی شے داؤ پر

لگا ہی دی۔" اور کمال حیرت کی بات اس کے پاپا نے ممی جتنی مخالفت نہیں کی تھی۔

اور اس نے بھی اس محبت کی زعم اور اس کے دھوکے میں یہ جوا کھیل لیا اور کمال تو یہ تھا کہ اس نے ایک بار بھی مزمل سے اپنی جاب کے بارے میں ایک بار بھی ذکر کیا نہ پوچھا، اور سب سے بڑی بات کہ اسے یہ بھی نہیں بتایا کہ وہ اسکالرشپ کے لیے اپلائی کر چکی ہے ابروڈ ہائر اسٹڈیز کے لیے۔

ان دونوں کے لیے تو ایک دوسرے کا ملن ہی کسی معجزے سے کم نہیں تھا۔ چار پانچ ماہ تو محبت کے رسیلے گیتوں پر سر دھننے اور اس نشے میں گم ایک دوسرے کی اسیری میں گزر گئے اسے ہوش تو اس دن آیا جب اسے پتا چلا کہ وہ پریگننٹ ہے اور پریگننسی کا چھٹا مہینہ شروع ہونے کو ہے۔ اس کی لاعلمی اس کے قدموں کی زنجیر بننے کو تھی ابھی وہ اس بے وقت کی مصیبت سے نجات کا کوئی طریقہ سوچ رہی تھی کہ اس کا اسکالرشپ پر ہائر اسٹڈیز کا ویزہ منظور ہو گیا۔

فقط چھ ماہ کے اندر اسے کلاسز جوائن کرنی تھیں۔

"تم فی الحال باہر جانے کو ملتوی کر دو دو تین سال بعد سہی یہاں جاب کرنا چاہتی ہو اپنا کلینک جو بھی کرو مگر ابھی باہر نہ جاؤ۔" مزمل سب سے پہلے اس کی راہ میں حائل ہوا تھا اور وہ تو جیسے ان دنوں بپھری ہوئی تھی اس کے خواب اس کا جنون حقیقت بننے جا رہا تھا اور وہ اس کے پر قینچ کر کے گھر بیٹھنے کا مشورہ دے رہا تھا۔

"بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ ابھی تم فی الحال دو چار سال تک جب تک بچہ چھوٹا ہوگا جاب بھی نہیں کرو اس کے بعد......" وہ مزے سے اس کے پاس لیٹا اس کی پیشانی پر پڑے بالوں سے کھیلتے ہوئے اسے مشورے دیے جا رہا تھا اسے ندرت کی پریشان زلفیں تو نظر آ رہی تھیں اس کی پیشانی کے گہرے بل نظر نہیں آ رہے تھے وہ ایک دم سے بھڑک اٹھی۔

"تم مڈل کلاس ذہنیت کے مرد میری ذہانت میری قابلیت سے جیلس ہو مجھے ماں بنانے کے چکر میں میرے سالوں کے اس جنون کو کریش کرنا چاہتے ہو مجھے گھر میں جاہل عورتوں کی طرح ہانڈی چولہا کرتے دیکھ کر اور یہی مشورہ دن رات مجھے تمہاری ماں دیتی ہے کہ عورت کا اصل مقام اس کا گھر ہے اس کا شوہر اس کے بچے...... کیا تم نے جب مجھ سے شادی کی تمہیں نہیں پتا تھا کہ میں کیا ہوں میرا جنون کیا ہے اور......"

مزمل نے یکدم اس کے لبوں پر ہاتھ رکھ دیا۔

"آہستہ آہستہ بات کر دیوں چیخ چیخ کر اپنی قابلیت کا اعلان کرو گی تو کون یقین کرے گا۔" اس کی نگاہوں میں صاف تمسخر تھا وہ اس نئی مصیبت سے جان چھڑا کر جلد سے جلد باہر جانا چاہ رہی تھی اور خود میڈیکل کی طالب علم ہوتے ہوئے اس حقیقت کو جھٹلانے کی کوشش کر رہی تھی کہ یہ ایسا اب ممکن نہیں پھر مزمل اس کی ماں اور دونوں شادی شدہ بہنوں کا پریشر کہ وہ ایسا کرنے سے باز رہے جب وہ خواہ مخواہ کی ضد پر اڑی رہی تو انہوں نے اس کی کلاس اور پھر اس کی تربیت کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا وہ جو محض اس ضد میں منتظر تھی کہ مزمل اسے ایک بار پیار سے علیحدگی میں سمجھائے تو کم از کم وہ ڈیلیوری تک آرام سے رہ سکتی ہے اور بعد میں وہ مزمل کو بھی اپنے ساتھ باہر لے جائے گی مگر ان لوگوں کی گھٹیا باتوں اور طعنوں سے اس کا دماغ اور خراب ہوتا چلا گیا۔

ممی اس کی ڈھارس تو بندھاتیں کہ تم خوانخواہ اسے ایشو بنا رہی ہو اگلے سال چلی جانا تمہیں اسکالر شپ کی کیا ضرورت ہے تمہارے باپ کی اتنی دولت ہے کہ تم ایسے دس اسکالر شپ افورڈ کر سکتی ہو مگر اس کے دماغ پر تو ایک ہی سودا سوار تھا ڈسٹنکشن کے ساتھ ڈگریوں کا ڈھیر حاصل کرنا وہ چھوٹی سی ہاتھ بھر کی بچی کیسی کمزور روئی کے گالے کی مانند تھی جو اس کے جلنے کڑھنے لڑنے جھگڑنے اور اپنی پراپر دیکھ بھال نہ کرنے کے باعث ٹائم پیریڈ پورا ہونے کے بعد پیدا ہونے والی بچی پری میچورنگ رہی تھی۔

ندرت نے تو اسے ٹھیک سے دیکھا بھی نہیں، پیار کیا کرتی اس کی اس حرکت پر مزمل کو اور غصہ آ گیا پھر دونوں کے درمیان سرد جنگ طویل ہوتی چلی گئی اگر چہ اس نے ایک بار صلح کے لیے دبے دبے لفظوں میں اسے بھی ساتھ چلنے کو کہا وہ غصے میں تن فن کرتا اس کے باپ کی دولت کو گالیاں دیتا باہر نکل گیا۔

اس کا غصہ اس کی گالیاں ندرت کو فیصلہ کرنے پر مجبور کر گئیں اور وہ مشکل فیصلہ جو ابھی بھی مزمل کی محبت کی بیڑی کی صورت اس کے پیروں سے لپٹا جا رہا تھا ایک دم سے آسان ہو گیا اس کی روئی کے گالے سی ہاتھ بھر کی چینی نقوش والی گلابی بچی پہلے دن سے اس کی ساس نے چڑیا کی طرح اپنی آغوش میں سمیٹ لی تھی شاید وہ ممتا کے ہتھیار کے ذریعے اسے ہرانا چاہتی تھی۔ مگر وہ ہارنے کے لیے تیار نہیں تھی۔

"تم میرے ساتھ چلو گے میں پاپا سے کہہ کر تمہارا ویزہ اور پاسپورٹ ......" اس نے آخری کوشش کے طور پر آخری بار صلح جو انداز میں اس سے پوچھا تھا جو پھول ہوا غصیلا

چہرہ لیے بیڈ روم سے اپنے شب خوابی کا لباس لینے آیا تھا۔

"شٹ اپ ول یو شٹ اپ۔" وہ اسی غصیلے چہرے کے ساتھ پلٹ کر چلایا۔

"میں لعنت بھیجتا ہوں تمہاری محبت پر اور تمہارے باپ کی دولت پر اگر تمہیں میرا میری بچی کا اس گھر کا کچھ خیال نہیں۔" ندرت نے بہت سکون سے اس کے جواب کو سنا اور چہرے پر تکیہ رکھ لیا۔

اگر چہ اس رات تکیہ چہرے پر رکھ کر روتی رہی مگر اس کے فیصلے میں دراڑ نہیں پڑی۔ نہ اس معصوم کی رونے کی آواز نے ہی اس کا دل موم کیا اور اس دو ماہ کی بچی کو چھوڑ کر وہ یو کے چلی آئی۔

اور پھر چار سال یو کے اور اسٹیٹس کے دو مختلف میڈیکل کالجز سے ڈسٹنکشن کے ساتھ ڈگریاں لیے وطن لوٹی تو کسی قسم کی پر ملال پچھتاوے بھری یاد اس کے ساتھ نہیں تھی یہ تو ڈاکٹر حارث کی تکرار نے اس کے اندر سوئے ہوئے اس آتش فشاں کو جگایا تھا۔

"اب میں کیسے تلاشوں اپنی بیٹی کو جس کو دیکھنے کے لیے میری ممتا تڑپ رہی ہے میں کیوں اتنی ظالم بن گئی تھی کیوں؟" ٹہل ٹہل کر ان کی ٹانگیں شل ہو گئیں تو بستر پر ڈھیر ہو گئیں۔

☆

"ڈاکٹر صاحب بیڈ نمبر چھ کی حالت ٹھیک نہیں لگ رہی وہ بار بار بے ہوش ہو رہی ہیں۔" سسٹر ماریہ نے آفس میں آ کر بتایا۔

ابھی ڈاکٹر ندرت کو کہیں سے مزمل کے کسی دوست کا ایڈریس ملا تھا اور وہ ادھر جانے کے لیے نکلنے والی تھیں کہ سسٹر ماریہ نے آ کر بتایا۔

بیڈ نمبر چھ ڈاکٹر میمونہ والی پیشنٹ تھی جس کا آج صبح ہی آپریشن کے ذریعے بیٹا ہوا تھا مگر اس کی کنڈیشن سیریس تھی۔

"یہ ڈاکٹر میمونہ کا کیس ہے ان سے کہہ جا کر۔" ڈاکٹر ندرت نے رکھائی سے کہا اور باہر جانے لگیں۔

"ڈاکٹر میمونہ کا تو آف ہو چکا یوں بھی آج ان کے فادر کا بائی پاس ہے وہ آپ کے لیے کہہ گئی تھیں۔" سسٹر ماریہ نے ڈاکٹر ندرت کے سرد چہرے کو دیکھتے ہوئے جھجک کر کہا۔

"سب کی ذمہ داریاں میں کیوں نبھاؤں یہ لوگ کس بات کی پے لیتے ہیں میں

گھنٹے تک آ جاؤں گی تم دیکھ لینا۔" وہ کہہ کر باہر نکل گئیں اور سسٹر ماریہ کو کتنی دیر لگی خود کو یقین دلانے میں کہ یہ سب ڈاکٹر ندرت ہی کہہ کر گئی ہیں۔

اور گھنٹے تو کیا آدھے گھنٹے میں اس مریضہ کی ڈیتھ ہو گئی۔

وہ ہسپتال میں داخل ہوئیں تو مریضہ کے لواحقین نے ایک ہنگامہ مچا رکھا تھا۔

انہوں نے عملے کو مارا پیٹا سامان کی توڑ پھوڑ کی کیونکہ جس وقت مریضہ کی آخری سانسیں چل رہی تھیں تو کوئی بھی سینئر ڈاکٹر ڈیوٹی پر موجود نہیں تھی۔

ڈاکٹر ندرت کے نیک نام ہسپتال کی بدنامی تھی، وہ پریشان سی آفس میں بیٹھی پولیس کو کال کر رہی تھیں جب ایک دھماکے کے ساتھ آفس کا دروازہ کھلا۔

"تم ہو میری بیوی کی قاتلہ اور اب ادھر چھپی بیٹھی ہو میں تو آخر ٹائم تک یہی سمجھتا رہا کہ اس کا کیس ڈاکٹر میمونہ کرے گی اگر مجھے ذرا سا بھی علم ہوتا کہ یہ ہسپتال یہ قتل گاہ تمہاری ہے تو میں اپنی بیوی کو کبھی یہاں ایڈمٹ نہ کرواتا۔" وہ منہ سے کف اڑاتا چیختا چلاتا ان کے سامنے کھڑا تھا۔

جس کی تلاش میں وہ ابھی سارے شہر کی خاک چھان کر آئی تھیں۔

اپنی صفائی میں ان سے ایک لفظ بھی نہیں کہا گیا وقت کے اس اچانک وار نے انہیں مجرم بنا ڈالا تھا۔

"بولو ہے تمہارے پاس اپنی صفائی میں کہنے کے لیے ایک لفظ بھی، تم جان بوجھ کر اسے سیریس حالت میں چھوڑ کر گئیں کہ تم جانتی تھیں کہ وہ میری بیوی ہے۔" وہ کرسیوں کو ٹھوکر مارتا ان کے سامنے بپھر کر کھڑا ہو گیا ڈاکٹر ندرت نے پتھرائی ہوئی نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"اس کے جواب میں میرے پاس صرف ایک دلیل ہے کل نفس ذائقۃ الموت۔"

انہوں نے کہا اور ٹیبل پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں اور وہ جیسے اس ایک دلیل کے آگے ہار گیا۔

وہیں کرسی پر گر گیا اور بے بسی سے انہیں روتا دیکھتا رہا جس کی جدائی میں اس نے ہجر کی کالی راتیں کاٹی تھیں وہ اسے چھوڑ گئی تھی مگر اس کے دل سے نہیں نکل سکی تھی۔

صائمہ اماں کی بھتیجی محض مومنہ کو پالنے کی غرض سے اس کی منکوحہ بنا دی گئی جسے پچھلے پانچ سالوں میں اس نے ایک بار بھی بیوی کا درجہ نہیں دیا کہ جب بھی اس کے پاس جانے کا ارادہ کرتا ندرت چمکتا چہرہ لیے اس کے رستے میں آن کھڑی ہوتی اور وہ شکست

خوردہ پلٹ آتا وہ صائمہ جس نے ایک صابر شاکر بیوی کی طرح اس کی کمزور ناتواں بیٹی کو کسی نازک کلی کی طرح سنبھالا دل سے اس کی پرورش کی کہ وہ اس کا قرضدار ہوتا چلا گیا اس کی بے غرض خدمت تلے دبتا چلا گیا۔

اور بالآخر ایک روز اس قرض اور صائمہ کی شکایتی نگاہوں کے آگے ہار گیا۔

"اللہ مجھے بیٹا دے میں اسے پالوں یا نہ پالوں مگر اپنی کوئی نشانی ضرور آپ کو دے جاؤں کہ آپ مجھے یاد رکھیں۔" وہ ایک دن یونہی بیٹھے بیٹھے بولی تھی تو کئی دن مزمل کا دل برا رہا کہ نومولود بچے کو پالنا سنبھالنا کیسا دشوار کام ہے اسے مومنہ کا تجربہ ہو چکا تھا۔

اور شاید کاتب تقدیر بھی پاس ہی کھڑا تھا جو فوراً ہی اس کے لبوں سے نکلی بات لوح محفوظ میں درج کر لی گئی۔

"اور اب اب تو اماں بھی نہیں جو میرے بیٹے کو سنبھالے گی اور ...... اور مومنہ ...... وہ صائمہ کے بغیر کیسے رہے گی وہ تو اس کے بغیر سوتی نہیں۔" وہ خود سے کہہ رہا تھا کہ ڈاکٹر ندرت نے ایک دم سے سر اٹھایا۔

"کیا مومنہ، تمہارے بیٹے اور تمہاری زندگی میں میری کوئی گنجائش نکل سکتی ہے۔"

سوال اس قدر اچانک تھا کہ مزمل فوری جواب نہیں دے سکا۔

وہ کیسے کہتا کہ وہ ان کی زندگی سے گئی ہی کب ہے جو گنجائش پیدا ہونے کا سوال ہو۔

"اور تمہارا یہ جنون یہ پروفیشن جس کے آگے کوئی بھی رشتہ تمہارے لیے ضروری نہیں" بے اختیار اس کے لبوں سے نکلا تھا۔

"کیا ابھی بھی تم کہو گے کہ میرا یہ جنون میرے دماغ کا خلل ہے کہ جب میں خود کو ماں بننے کے امتحان میں ڈالنا چاہتی ہوں دونوں امتحانوں سے بیک وقت سرخرو ہونے کے لیے، کیا تم میرا ساتھ نہ دو گے، اور پھر مجھے صائمہ کا قرض بھی تو اتارنا ہے جو اس نے میری بیٹی کی پرورش کر کے میرے ذمے لگایا کیا تم اجازت نہ دو گے مجھے کہ میں ان گم گشتہ دنوں لمحوں کو دوبارہ پا سکوں ایک ننھے فرشتے کی پرورش کر کے جو میں نے اپنی ضد میں کھو دیے تھے۔" وہ بڑے ہی مشتاق لہجے میں سینکڑوں حسرتیں لیے پوچھ رہی تھیں۔

"معلوم نہیں مومنہ تمہیں قبول کرے گی یا نہیں۔" وہ نگاہیں چرا کر بولا۔

"شاید تم ہی مجھے قبول کرنا نہیں چاہ رہے۔" وہ تھک کر مایوس سی کرسی پر گر گئیں۔

اسی وقت پولیس کی نفری دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔

''میڈم کیا آپ ان لوگوں کو شناخت کر سکتی ہیں جنہوں نے یہاں ہنگامہ کیا اور توڑ پھوڑ کی۔'' ڈی ایس پی پوچھ رہا تھا۔

''نہیں ڈی ایس پی صاحب میں ان لوگوں کو شناخت نہیں کر سکتی اور اگر کر بھی سکتی ہوں تو نہیں کروں گی کہ ان کا غصہ بہر حال بے جا نہ تھا آپ کی آمد کا شکریہ اب ادھر آپ کی ضرورت نہیں تھینک یو۔'' ڈاکٹر ندرت نے اٹھتے ہوئے کہا تو آفیسر سر ہلا کر باہر نکل گیا۔

مزمل بھی اس کے پیچھے نکل گیا۔

''کیا مجھے میری بیٹی سے نہ ملواؤ گے۔'' وہ بے قراری سی اس کے پیچھے لپکیں۔

تو مزمل نے مڑ کر ایک شکایتی نگاہ ان پر ڈالی اور آگے بڑھ گیا۔

''اس بار پہل مجھے ہی کرنی ہوگی کہیں اور دیر نہ ہو جائے۔'' وہ سوچتی ہوئی آفس میں آکر اپنی چیزیں سمیٹنے لگیں ابھی زندگی کے دامن میں بہت سی آزمائشیں تھیں مگر انہیں خود پر اپنے اللہ پر اور اپنی اس گم گشتہ محبت پر یقین تھا جو برسوں بعد ان کے دل میں بے دار ہوئی تھی کہ وہ ان آزمائشوں سے سرخرو ہو جائیں گی۔

✿

تحفہ

''میں نے ایک فیصلہ کیا ہے۔'' میں نے جواد کو اپنے پاس کھڑے دیکھ کر ہاتھ میں پکڑا اخبار ایک طرف پھینکا اور اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

ٹیبل پر پڑا جواد کا آفس بیگ اٹھا کر ان کے ہاتھ میں دیا اور ان کی طرف دیکھنے لگی جو اب سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔

''کیا! کیا فیصلہ ہے؟'' انہوں نے کلائی پر بندھی گھڑی کو سرسری نظر سے دیکھا اور اندازہ لگایا کہ میری لمبی چوڑی گفتگو سننے کا ان کے پاس ٹائم ہے۔

''میں کل سے اخبار نہیں پڑھوں گی۔'' میں نے کوفت بھرے انداز میں سر ہلاتے ہوئے ناک چڑھا کر سامنے پڑے اخبار کو دیکھ کر کہا۔

''کل سے کیوں مائی ڈیئر، آج سے کیوں نہیں۔''

جواد کا جواب ہی نہیں ان کی اگلی حرکت ان کے جواب سے بھی زیادہ غیر متوقع تھی انہوں نے آگے بڑھ کر پنکھے کی ہوا میں پھڑ پھڑاتے اخبار کو سمیٹا۔ رول سا بنایا اور ہاتھ میں لے کر باہر کی طرف بڑھ گئے۔

''چلتا ہوں میں ویسے ہی لیٹ ہو گیا ہوں۔ شام کو جلدی آنے کی کوشش کروں گا تو کہیں چلیں گے اللہ حافظ۔'' وہ کہتے ہوئے باہر نکل گئے اور اگلے منٹ ان کی گاڑی گیٹ سے نکلنے اور گیٹ بند ہونے کے بعد کی آوازیں سنائی دیں اور ان آوازوں کے بعد ایک مہیب سناٹا۔ سرسراتی خاموشی اور وحشت ناک تنہائی میرے آس پاس ٹہلنے لگی۔

''اف۔'' میں نے گھبرا کر پناہ لینے کے لیے بالکل غیر ارادی طور پر اخبار اٹھانے

کے لیے ہاتھ بڑھایا تو مجھے یاد آیا اخبار تو جواد لے گئے ہیں۔

''اب کیا کروں۔'' میں نے کچھ پریشان سا ہو کر گھڑی کی طرف دیکھا ابھی تو بھی نہیں بجے تھے نو سے دس بجے تک میں اخبار پڑھتی تھی اس دوران اٹھ کر چائے دوبارہ بنا لیتی یا ناشتے کی بچی چائے ہوتی تو اس کو گرم کر کے اخبار کے مطالعے کے دوران چسکیاں لے کر پیتی رہتی مگر آج......

''آج تو کام ہی الٹا ہو گیا تھا۔'' میں دھڑام سے صوفے پر گر گئی۔

''اچھا چلو اس اخبار کی منحوس وحشت ناک، دہشت ناک خبروں، بم بلاسٹ، حادثوں، خودکشیوں، سیاستدانوں کی آپس کی لڑائیوں، ایک دوسرے کی کردارکشی کے لیے لگائے گئے الزامات، ذخیرہ اندوزوں کی دھمکیوں، ملاوٹ کرنے والوں کی تڑپوں، اسٹاک ایکس چینج کی گرتی ہوئی ویلیوز، ڈالر اور تیل کے آسمانوں کو چھوتے نرخ، لوڈشیڈنگ کے ہنگامے بلوے اور ہمارے بجلی کے وزیر موصوف کی ہر صبح بے چاری پاکستانی عوام کے لیے ایک عدد موٹی تازی کڑوی گولی بجلی کے بڑھتے ہوئے نرخ اور لوڈشیڈنگ کے دورانیے میں اضافے کی خبروں ہمارے ملک بلکہ ہماری حکومت کی یرغمالی پر اقوام عالم کی بے نیازی خودکش بمباروں کی اس درجہ بہتات...... کہ میرے ملک میں ہوتی شب رات روزانہ، والا حال ہو اور بندہ جل کر کہہ ڈالے کہ بھئی میں کل سے اخبار نہیں پڑھوں گا اور اس کی اس ہرزہ سرائی کو اس کی حد سے بڑھی ہوئی فرسٹریشن یا ڈیپریشن کا نتیجہ ہی سمجھنا چاہیے نہ کہ بالکل سچ سمجھتے ہوئے اخبار ہی بغل میں داب اور آفس چل دیے اب جو میرے جیسا اخبار کا نشئی، چرسی ہو گا وہ کیا کرے گا۔''

میں بلند آواز میں خود سے باتیں کر رہی تھی کہ وہاں سننے والا میرے سوا اور کوئی تھا بھی نہیں۔

''اب اخبار کے بغیر بھلا دن کیسے گزرے گا ابھی تو تمام کالم پڑھنے والے رہتے تھے جاوید چودھری کا کالم بھی آیا ہوا تھا آج تو سعد اللہ جان برق کا بھی، حمید اختر کا بھی...... اور مزے سے شام کو آ کر کہیں گے میں تو اخبار آفس ہی بھول آیا اف۔'' میری وحشت اور پریشانی لحہ بہ لحہ بڑھتی جا رہی تھی۔

بے چینی میں اٹھ کر ٹی وی لگایا باری باری سب نیوز چینلوں کے سب پر چھ سات وزیر اور ہماری وزارت داخلہ کے آل ان آل ہاتھ لہراتے، فضا میں مکا گھماتے عوام کو

دھمکاتے، ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالتے، ان پڑھ لوگوں کی طرح لڑتے جھگڑتے مجھے تھوڑی دیر میں بے زار کر گئے۔

میں نے ٹی وی آف کر دیا اور اٹھ کر کچن میں آ گئی چینک میں کچھ چائے بچی تھی اسے گرم کر کے مگ میں انڈیلا اور پھر اپنے پسندیدہ ٹھکانے یعنی لاؤنج میں آ گئی۔

''اچھا ہوا وہ اخبار لے گئے کیا کرنا تھا پڑھ پڑھ کر دماغ خراب کرنا تھا پورے اخبار میں جو ایک بھی اچھی خبر ہو، بہتر ہے کبوتر کی طرح کچھ دن آنکھیں بند کر کے ان مسائل بھری زندگی سے نظریں چرا لی جائیں اور رومانس کے یوٹوپیا کی سیر کی جائے۔''

میں نے ''پیار کا پہلا شہر'' کھولا اور پڑھنے میں مگن ہو گئی محض دس منٹ میں ہی طبیعت بے زار ہو گئی یہ کتاب پہلے بھی تو چار بار پڑھی ہوئی تھی اس وقت تو طلب خبروں اور کالموں کی تھی چائے بھی ختم ہو گئی مگر طبیعت کی بے زاری دور نہ ہوئی۔ میں نے اٹھ کر لاؤنج میں ٹہلنا شروع کر دیا۔

''رجو آتی ہے تو اس سے مارکیٹ سے اخبار منگوا لیتی ہوں۔'' میں نے اپنے نشے کا علاج سوچا۔

''اتنی ڈسٹ اتنی مٹی اف یہ رجو بیگم کیا روز ہاتھ لگنے آتی ہیں ادھر، آ جائے آج ذرا اس کی تو میں کلاس لیتی ہوں۔''

کھڑکی کی چوکھٹ میں جمع مٹی نے میری توجہ اپنی طرف مبذول کروائی اور پھر دھیرے دھیرے مجھے پورے گھر میں ہر جگہ ہر چیز گرد آلود نظر آنے لگی۔

''تفصیلی صفائی کو بھی اتنے مہینے ہو گئے ہیں بس ٹھیک ہے یہ پورا ہفتہ گھر کو چمکانے میں لگایا جائے گا اور گیٹ کے پاس بڑے گملوں اور ستونوں سے لپٹی بیلوں کو پانی دیتی ہوئی بے چینی سے رجو کے آنے کا انتظار کر رہی تھی جس کے آج آنے کے آثار بھی نایاب لگ رہے تھے۔

☆

میں دیکھتی ہی رہ گئی اور جواد نے اگلی صبح بھی وہی حرکت کر ڈالی۔ میں نے ناشتا ٹیبل پر لگایا اپنے کپ میں چائے نکالی اور دوسرا ہاتھ حسب عادت صوفے پر پڑے اخبار کی طرف بڑھایا ہی تھا جواد نے بڑے آرام سے اخبار اٹھایا اور تہہ کر کے اپنے آفس بیگ میں رکھ لیا۔

’’تم نے یہ بہت اچھا فیصلہ کیا جو اخبار پڑھنا چھوڑ دیا خواہ مخواہ صبح کے وقت دو تین کپ چائے پی کر اپنا خون جلاتی ہو باقی کا خون اخبار کی ہولناک خبریں جلا دیتی ہیں دیکھو ایک ہی دن میں تمہاری رنگت میں کیسا نمایاں فرق لگنے لگا ہے ایک دم سے فریش کھلی کھلی لگ رہی ہو۔‘‘ وہ مزے سے مکھن توس پر تہ پہ تہ جماتے کہتے چلے گئے۔

اور میں جو پہلے اچھی خاصی گرمی میں آنے لگے تھی ان کی حرکت پر انہیں ٹھیک ٹھاک سنانے کے لیے الفاظ ترتیب دے رہی تھی کہ ان کی اگلی بات پر میں لمحہ بھر کو گنگ سی بیٹھی رہ گئی بالکل غیر ارادی طور پر میرا ہاتھ اپنے منہ کی طرف گیا تھا اور صبح فجر کی نماز کے لیے وضو کرتے ہوئے حسب عادت میں نے کئی بار شیشے میں اپنا یہ چوکھٹا دیکھا تھا مجھے تو رتی برابر کچھ نیا پن، محسوس نہیں ہوا تھا، وہی گندھی سی صاف ذرا پیلی رنگت، نیند سے بوجھل مندی مندی آنکھیں کہ جلدی سے چار سجدے کر کے دربارہ بستر میں جا پڑوں آنکھیں پوری یوں نہیں کھولتی تھی کہ پھر کمبخت پوری ہی کھل جاتی تھیں تو دربارہ سونے میں گھنٹہ لگ جاتا تھا اور اس میں جواد کے آفس جانے کا ٹائم ہو جاتا تو اٹھنا پڑتا اور پھر خوب ہی سر میں درد ہوتا۔

’’خیر ایسی تو کوئی بات نہیں رنگت میری اب اس عمر میں کیا کھلے گی یا مرجھائے گی یہ تو آپ کی نظر......‘‘

میں نے سنبھل کر کہنا شروع کیا۔

’’ویسے مجھے لگتا ہے بلکہ پہلے ہی شک تھا کہ کچھ گھپلا ہے۔‘‘ وہ مکھن لگے سلائس کو دو ہی لقموں میں پار لگاتے ہوئے شریر لہجے میں بولے۔

’’کیسا گھپلا......‘‘ میں انہیں رشک بھری نظروں سے تکتے ہوئی بولی اب فربہی مائل جسم کی وجہ سے اس قسم کی خوراکیں، میرے لیے تو شجر ممنوعہ ہی تھیں۔

’’یہی عمر والا......‘‘ انہوں نے بائیں آنکھ دبائی۔

’’آج تمہارے منہ خود ہی نکل گیا اس عمر میں ......ہاہ کیسی حسرت ہے تمہاری آہ میں۔‘‘ وہ میرے یونہی بولے گئے جملے سے یہ مطلب نکالیں گے مجھے اندازہ نہیں تھا غصے میں ٹی پاٹ ہی اٹھا کر انہیں دھمکا ڈالا۔

’’میرے اسکول کالج کے سارے سرٹیفکیٹس تو بہانے بہانے سے کھنگال چکے ہیں اور عمر کی تسلی کہاں سے کروائیں گے۔‘‘ میں دانت پیس کر بولی تو وہ ہنس پڑے۔

’’بھئی سچ کہا سیانوں نے کبھی عورت کی عمر کی طرف ......اصلی عمر کی طرف اشارہ نہ کرو

قتل کرنے پر اتر آئے گی۔‘‘ وہ ہنستے ہوئے نیپکن سے ہاتھ منہ صاف کرتے اٹھ کھڑے ہوئے۔

’’اور جو سیانوں نے دوسرے سنہری قول کی طرف ذکر کیا ہے کہ مرد کی تنخواہ اصلی کبھی نہ پوچھو مرنے مارنے پر اتر آئے گا اس کے بارے میں کیا خیال ہے۔‘‘

میں نے بھی حساب برابر کیا۔

’’ظالم بیوی ہر مہینے پہلے پے سلپ چیک کرتی ہو پھر میری جیبیں وہ بھی ایک نہیں ساری اور اس کے باوجود شک کرو تو اللہ تمہاری نیکیوں میں کئی گنا اضافہ کرے گا۔‘‘ وہ جاتے جاتے بولے۔

’’اور جو خود شک کر رہے تھے وہ ......آپ کے اعمال نامہ کتنا وزنی ہوا ہو گا۔‘‘ میں پیچھے آئی۔

’’مذاق کر رہا تھا۔‘‘

’’میں بھی مذاق کر رہی تھی شام کو کیا پکاؤں؟‘‘ مجھے روزانہ والا سب سے الجھا ہوا مسئلہ یاد آیا تو پوچھ بیٹھی۔

’’جو جی میں آئے، ایسا فرماں بردار شوہر کسی کا ہو گا بھلا۔‘‘ وہ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے بھی اپنی مدح میں بولے۔

’’جی معلوم ہے آپ کی فرماں برداری اچھی طرح معلوم جو ہے ٹیبل پر تین ڈشز روز بھی ملتی ہیں تین میں سے ایک تو پسند کی ہوتی ہے۔ فرماں برداری کے نمبر الگ اور پسند کی ڈش کے مزے الگ۔‘‘ میں کسی بھی معاملے میں ادھار کی قائل نہیں تھی۔

’’یہ حنیف بھی تین دن کی چھٹی لے کر گیا اور ہفتہ ہونے کو آیا ہے ابھی تو کچھ پتا نہیں اس کا‘ تم دروازہ دن میں بھی اچھی طرح بند رکھا کرو آج کل ڈکیتیوں کا کام پھر زوروں پر ہے او کے اللہ حافظ۔‘‘ انہوں نے کھلے گیٹ سے گاڑی باہر نکالنی شروع کی۔

’’یہ سب ہی نوکروں کا حال ہے وہ رجو بی بی کل بھی نہیں آئی سارا کام مجھے خود سے کرنا پڑا اور آج بھی معلوم نہیں آتی ہے یا نہیں۔‘‘ میں گاڑی کے باہر نکلتے ہی گیٹ بند کر کے داخلی دروازے سے انہیں اللہ حافظ کہتے ہوئے بولی تو وہ نیازی سے سر ہلاتے گاڑی نکال لے گئے۔ میں گیٹ بند کر کے اندر آ گئی۔

اندر وہی بھائیں بھائیں کرتا سناٹا تھا۔

ایک عورت جس کی شادی کو گیارہ برس گزر چکے ہوں اور اس کی گود اس کا گھر

میرے گھر کی طرح سنسان بھائیں بھائیں کرنے والا ہو صرف وہی میری کیفیت کو سمجھ سکتی ہے۔ میں صوفے پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھی تھی۔

”ایں مجھے الجھی الجھی باتوں میں لگا کر آج پھر اخبار اچک لے گئے یہ کیا تماشا ہے بھئی کل بھی میں نے سوچا رجو سے منگوا لوں گی وہ محترمہ کل آئی ہی نہیں کل کا اخبار نہیں پڑھا اور آج۔“ مجھے اس خیال کے ساتھ جیسے ایک دم سے رونا آنے لگا گھر کا سناٹا اور بھی دل کے اندر اترنے لگا تھا۔

میں یونہی منہ اوپر اٹھا کر گہرے گہرے سانس لینے لگی۔

”میری مٹھی میں تو کوئی آس کا جگنو بھی نہیں کہ جس سے اس ویران دل کے کسی اندھیرے کونے کو اجال لوں سب کچھ واضح ہے بالکل عیاں...... اور اس طرح عیاں کروانے کی جستجو بھی تو مجھے تھی بس ایک بے چینی تھی دیوانگی' جنون کہ پتا چل جائے کب کیسے کیونکر میرے سونے گھر میں میری سونی کوکھ سے کسی پھول کے کھلنے کی امید بر آ سکتی ہے۔

پہلے پانچ سال اسی امید وبیم اسی خوش گمانی ناامیدی کے درمیان ڈولتے گزر گئے۔

پھر ڈاکٹری علاج معالجے کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا جوں جوں گوہر مقصود دور ہوتا محسوس ہو رہا تھا میری رسائی میری پہنچ سے دور...... میرے اضطراب میری دیوانگی میں اضافہ ہی ہوتا جا رہا تھا اور یہ دیوانگی جنوں مجھے کہاں کہاں نہیں لے گیا۔

ایلوپیتھک طریقہ کار سے مایوس ہونے کے بعد ہومیو پیتھک حکمت اور آخر میں تعویذ، عملیات، دم، چلے اور نہ جانے کیا کیا؟ پورے نو سال بیت گئے میرا دل، میری کوکھ کی طرح سونا ہوتا چلا گیا امید کا ایک ایک ستون گرتا چلا گیا اور میں بے وزن بدن کے ساتھ کسی اندھیرے خلا میں معلق ہو کر رہ گئی۔

اف وہ دن کتنے ظالم کتنے خوفناک تھے ماں نہ بن سکنے کا خوف میرے پورے وجود کو کسی آکٹوپس کی طرح جکڑے اس میں سے زندگی نچوڑنے لگا اور میں کسی بے نشان مردے کی طرح ہو گئی جسے اس کے لواحقین دفنانے کے بعد اس کے نام کا کتبہ اس کے سرہانے لگانا بھول گئے ہوں اور وہ بے نام مردہ اپنا نام تلاش کرنے کے لیے کسی بھولی بھٹکی روح کی طرح سارے عالم میں چکراتا پھر رہا تھا۔

خاندان میں ہونے والی شادیوں، منگنیوں، نکاح میں ہمیں بلوایا جاتا تو خوب جوش و خروش سے جاتے مگر اکثر دلہا دلہن کے پاس خاص طور پر دلہن کو مہندی لگانے یا اور کسی

ایسی رسم کے موقع پر نادانستہ سی کوششیں ہونے لگیں کہ میں دلہن کے پاس نہ ہی جاؤں مجھے آواز دے کر بلا وا بھیج کر کوئی اور اہم کام کا پیام دے جاتا شروع میں میں کچھ بھی نہ سمجھی اور جب سمجھی..... تو پھر خود ہی ایسی تقریبات سے دور ہٹنے لگی۔

ایک آز ایک بھرم سا تھا جو ہر نئے دن کے ساتھ ٹوٹتا جا رہا تھا جواد کی میڈیکل رپورٹس بالکل ٹھیک تھیں اور میری..... دن بہ دن پیچیدہ اور نافہم سی ہوتی جا رہی تھیں۔

میری دونوں نندیں جن کا جواد اکلوتا بھائی تھا ان کی بے چینی ان کا اضطراب مجھ سے بھی سوا تھا اب تو ان کی امیدیں ناامیدی کے گہرے کنوئیں میں گرنے کے بعد پریشانی اور پھر غصہ کے بھنور میں بدلنے لگی تھیں۔

میں ان دنوں کٹی پتنگ کی طرح خلا میں معلق تھی ہر لمحہ اپنے انجام کے خوف سے لرزتی کانپتی پھرا کرتی۔

زور سے بیل بجی اور میں جیسے کسی گہرے خیال سے باہر نکلی تھی۔

”کیا مصیبت پڑی تھی تمہیں ہر ہفتے تین چھٹیاں تو لازمی ہو گئی ہیں تمہاری اور پھر ہر چھٹی پر نئے سے نیا بالکل اچھوتا بہانہ کہ بے چاری بیگم صاحبہ تیرے بہانے کی زد میں آ کر سی بھی نہ کر سکے۔“ رجو کے اندر آتے ہی بولتی چلی گئی اس کا منہ میری توقع کے عین مطابق لٹکا ہوا تھا۔

”کیا بتائیں بی بی جی اللہ سائیں نے ہم غریبوں کی قسمت ہی ایسی بنائی ہے ڈھیٹ اور بے شرم تو بنا ہی ڈالا ہے اس غربت نے بہانے باز بھی' جو آپ سمجھ لیں۔“

اس سے پہلے کہ میں کچھ اور سخت اسے سناتی وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

”اب کیا ہوا ہے؟ کوئی نیا ڈرامہ۔“ میں نے بڑی مشکل سے زبان کو روکا اور وہ زاری سے صوفے پر بیٹھ گئی وہ روتے ہوئے سر پکڑ کر نیچے بیٹھ گئی۔

”چھوٹے کو نمونیا ہو گیا تھا جی۔“ وہ ڈبڈبائی آنکھوں اور گلوگیر آواز میں بولی۔

”رجو بات سن میری۔“ مجھے ایک دم سے تاؤ آ گیا۔

”گھر سے چلی تھی تو کوئی بہانہ بھی ڈھنگ کا سوچ لینا تھا اتنی گرمی میں بھلا کس کو نمونیہ ہو سکتا ہے۔“

”او جی وہ بڑا ماڑا (کمزور) ہے جی اس دن گرمی کی وجہ سے سارا دن چھپڑ کے ٹھنڈے ٹھار پانی میں نہاتا رہا رات تک پہلے کھانسی آتی رہی پھر جو زوروں کا بخار ہوا صبح

تک تو اس میں جان ہی نہیں رہی کل سارا دن سرکاری ہسپتال میں لے کر پھرتی۔...... پرچی نہیں بن رہی تھی پرچی بنی تو ڈاکٹر صاحب اٹھ گئے پھر محلے کے کمپوڈر کو دکھایا اس نے کہا کہ نمونیہ ہو گیا ہے اتنی مہنگی دوائی لکھ دی میں کدھر سے لیتی جو اس نے اپنے پاس سے دی وہی پلاتی رہی رتی برابر فرق نہیں پڑا اب بھی جلتے کھپتے کو چھوڑ کر آئی ہوں کہ آپ کو بغیر بتائے چھٹی کرنے سے غصہ آتا ہے۔'' اس کی کہانی ایسی تھی کہ یقین نہ کرنے کے باوجود میں نے یقین کر لیا اس کے ساتھ مل کر جلدی جلدی گھر کا کام نبٹایا۔

''دیکھ میری بات سن اب تمہارا بیٹا ٹھیک ہوتا ہے تو سارے گھر کی اچھی طرح صفائی کرنی ہے کل میں دیکھ رہی تھی جگہ جگہ کھڑکیوں دروازوں میں مٹی اور دھول کی تہیں جمی ہیں کل سے ذرا جلدی آجانا اور پیسے دیتی ہوں میں تمہیں جا کر اسے کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھانا اور خود بھی بچوں کا خیال رکھا کرو تم تو یہاں سے جا کر کھٹیا سنبھال کر بیٹھ جاتی ہو وہ گلی میں مٹی، گندے چھپڑ میں کھیلتے رہتے ہیں بیمار نہ پڑیں تو کیا ہو۔'' میں نے اسے جانے سے پہلے تنبیہ کی۔

''اللہ معافی باجی بدن ملے (ٹوٹے) جو جا کر منجی (چارپائی) پر بیٹھی بھی ہوں بہت کام گھر کے تیار ہوتے ہیں اور وہ جیون جوگے گھڑی کو بیٹھنے نہیں دیتے میں نے کیا آرام کرنا ہے اب تو لگتا ہے قبر میں جا کر ہی آرام ملے گا قسمت ہی ایسی ہے ہم غریبوں کی۔'' وہ پھر سے اپنے مخصوص شکوے پر آگئی۔ ''قسمت ہی ایسی ہے ہم غریبوں کی'' اس کا تکیہ کلام ہی بنتا جا رہا تھا۔

''اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں بہت سوں سے اچھی ہو جیسا بھی سہی گھر والا بھی تھوڑا بہت کما کر لاتا ہے خود بھی کما لیتی ہو تھوڑے سے سلیقے اور طریقے سے چلو تو ایسی چھوٹی موٹی بیماری شماری پر یوں ہاتھ پیر جھاڑ کر نہ منہ کھولنا پڑے' لو اسے کسی ڈھنگ کے ڈاکٹر کو دکھانا آج تو جلدی جا رہی ہو مگر کل نہیں جانے دوں گی گھر کے سو کام سر پر پڑے ہیں اور تیری چھٹیاں ہی تمام نہیں ہوتیں سالن والے شاپر لے لینا کچن سے اور کل سویرے آنا بتا رہی ہوں میں۔''

میں نے اسے پانچ سو روپے دیتے ہوئے ذرا سخت لہجے میں کہا تھا اس کی گردن تو پانچ سو کی ہری پتی دیکھتے ہی جیسے وجد میں آ کر دائیں بائیں جھولنے لگی تھی۔

''چنگا بی بی اللہ آپ کو بہتا دے آپ کی گود ہری کرے اس گھر کا سناٹا بھی دور

کرے یہاں بالوں (بچوں) کی ہنسی ان کے ہاسے (قہقہے) گونجیں' جی میں تو غریب دن رات جھولی اٹھا اٹھا کر رب سے آپ کی یہ کمی دور کرنے کی دعا کرتی ہوں اور میرا رب سوہنا ضرور سنے گا مجھے پکا یقین ہے وہ آپ جیسی نرم دل مہربان ہم جیسے کیموں کے کام آنے والی کو نامراد کیسے رکھ سکتا ہے وہ ضرور آپ کی کھیتی ہری بھری کرے گا میرا رب سوہنا۔''

وہ اس وجد کی کیفیت میں مسلسل دعائیں دیے جا رہی تھی اس کی دعا میرے محروم دل پر کسی تازیانے کی طرح لگ رہی تھی اس کی دعا میری کمزوری میری محرومی میری کجی کی طرف کیسا بے باک اشارہ تھا کہ اکثر میرا دل اسے سہہ نہیں پاتا تھا۔

یوں جیسے کسی لنگڑی عورت کو کوئی اس کے منہ پر لنگڑا کہہ دے یا کسی بہت کمزور نظر والی عورت کو کوئی اس کے سامنے اندھی کہہ دے تو کیسے اس کا دل اپنی اس کمزوری پہ درد سے بھر جاتا ہے، اب تو اکثر میرے دل کا بھی یہی حال ہونے لگا تھا کوئی گود بھرنے کی دعا دیتا تو خدانخواستہ وہ مجھے گالی کی طرح لگنے لگتی ایسی گھبراہٹ ہوتی کہ جی چاہتا وہاں سے بھاگ جاؤں یا دعا دینے والی کا منہ کسی طرح بند کروا دوں اس وقت بھی میں نے یہی کیا۔

''اچھا جا اب، جاتے ہوئے گیٹ اچھی طرح بند کر جانا۔'' میں نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہہ کر ٹی وی آن کر لیا تو وہ سر ہلاتی کچن میں بچے ہوئے سالن کے شاپر لینے چلی گئی جاتے ہوئے سلام اور دعا کرتی کل سویرے آجاؤں گی جی کہہ کر چلی گئی تو میں نے گہرا سانس لے کر ٹی وی کا والیوم کم کر دیا۔

''صحیح کہتے ہیں لوگ پیر کامل کہ یقین کامل...... میرا یقین ہی نہیں تھا پیروں فقیروں کی طرف سوان کے عملیات کیا اثر کرتے میری نند چوکی والی ریحانہ ہر دوسرے دن کسی نہ کسی بابا' پیر پہنچے ہوئے بزرگ حضرت کا پتا لیے صبح سویرے ہی آن ہی ٹپکتی اور پھر وہ سارا دن میرا انجل خواری کا ہوتا۔

ان پیروں، بزرگوں، فقیروں کے ڈیروں پر حاضری کوئی آسان کام ہوتا ہے رش ایسا کہ خلقت ٹوٹی پڑتی ہے ان ڈیروں پر جا کر پتا چلتا ہے کہ خدائی کتنی پریشان حال ہے اسے اپنی پریشانیوں اپنے دکھوں کے علاج کے لیے کوئی تکیہ کوئی ڈھارس کوئی بانہہ چاہیے۔ جس کے کندھے پر سر رکھ کر وہ اپنے غم کی گٹھڑی ہلکی کر سکیں ان کے پھوڑے کی طرح دکھتے دلوں کا کتھارسس ہو سکے کوئی ان پھوڑوں کا منہ کھلوا کر اندر سے گندا مواد نکال سکے محض اس کتھارسس کے لیے اس غم سے جلتے بلتے دلوں کی تسلی کی دو بوندیں پانے کے لیے لوگ

ٹھیک ٹھاک ہدیہ بھی دیتے ہیں اور اکثر شافی تسلی علاج سے بھی محروم رہتے ہیں اور پھر مایوس ہو کر دوسرے ڈیرے پر چلے جاتے ہیں۔

میں نے اکثر عورتوں کو دیکھا جو دو چار ہفتوں' مہینوں بعد ڈیرہ اور پیر دونوں بدل لیتی تھیں مگر ان کے دکھوں کی جھولی بھری سی رہتی قطرہ قطرہ غم اس سے ٹپکتا ہی رہتا کوئی نہیں تھا جو ان کی جھولی کا سارا غم اپنے ڈیرے پر رکھوا کر انہیں مطمئن شانت و پرسکون کر کے گھر بھیج دیتا کہ ہلکی پھلکی ہو کر اپنے گھروں کی دنیاؤں میں مگن ہو سکتیں کہ اگر پیر فقیر اتنے مہربان اتنے ہمدرد غمگسار ہوتے کہ ان دکھوں کی ساری دنیا کے دکھ چن کر انہیں ہلکا پھلکا کر لیتے تو پھر ان کے ڈیروں پر رونقیں کیسے لگتیں ان کے پاس کوئی بھی آنے والا نہ رہتا ان کا تو سارا دھندہ ٹھپ ہو جاتا۔

ایک عامل صاحب نے تو باقاعدہ میرا آپریشن بھی کر دیا کہ ''اس کے اندر جو نقص تھا جو رکاوٹ تھی وہ میں نے اس آپریشن میں نکال دی ہے ابھی اس کا اندر زخمی ہے اسے پورے اکیس دن مکمل بیڈ ریسٹ کروانا ہے جیسے کسی آپریشن والے مریض کو کرواتے ہیں بالکل ہلکی رقیق غذا لینی ہے دلیہ، کسٹرڈ، ساگودانہ وغیرہ ساتھ سات دن بعد نہانا ہے اور اکیس دن بعد میرے پاس پھر آنا پھر بچے کے لیے آگے کا عمل شروع کریں گے۔''

اس بابا جی نے پورے پانچ ہزار روپے صرف آپریشن کے ہتھیائے جو انہوں نے محض ایک چھری کو میرے جسم کے گرد پھرا پھرا کر مختلف عمل کرتے ہوئے کیا تھا اور بس.....

ریحانہ کا تو کچھ نہ گیا اس کا یقین ان باتوں پر کچھ اور بھی پختہ ہو گیا مگر میرے پرس سے پانچ ہزار جانے سے جہاں میرا دل بوجھل سا ہو گیا وہیں سنتے ہی جواد کا موڈ بھی آف ہو گیا۔

''او ہو ایسی کیا بات ہے اللہ نے اتنا دیا ہے بیچ میں سے دو چار ہزار روپیہ نکل جاتا ہے تو کیا برا ہے وہ بھی تو علاج کے لیے لگا ہے کون سا اس نے بچاری نے گل چھرے اڑائے ہیں، تم تو یونہی منہ بنا کر بیٹھ گئے ہو اب اس کی طبیعت اچھی نہیں اسے کچھ نہیں کہنا اور جو بابا جی نے اکیس دن کا مکمل آرام کہا ہے اس پر سختی سے عمل کروانا ہے بابا جی کہہ رہے تھے، آرام نہیں کرے گی تو کچا جسم ہے کوئی بھی پیچیدگی پیدا ہو سکتی ہے رجو کو اکیس دنوں کے دن رات ادھر ہی رکھ لو۔''

ریحانہ جواد کے خراب موڈ کو خاطر میں لانے والی کب تھی اور اس کی باتیں سن کر جہاں مجھے ہنسی آ رہی تھی جواد کا غصہ اب کوفت و بے زاری میں بدلنے لگا تھا۔

''بی بی جاؤ اللہ کو مانو یہ کون سی کہانیاں سنا رہی ہو کسی بھی اوزار کو ہاتھ لگائے بغیر حتیٰ کہ جسم کو چھوئے بغیر تمہارے بابا جی نے آپریشن بھی کر ڈالا اور تم عقل کی اندھی عورتوں سے اس کرشمے کے پانچ ہزار بھی ہتھیا لیے ریحانہ تمہیں ہو کیا گیا ہے۔'' جواد نے بہن کے آگے ہاتھ جوڑے ہوئے آخر میں کچھ مشکوک سے لہجے میں کہا۔

''دیکھا یہی تو کمال ہے بابا جی کا نہ ہاتھ لگایا نہ کوئی اوزار اور آپریشن کر ڈالا پوچھو اپنی بیوی سے کیسا لگ رہا ہے اسے کسی نے اندر سے چیر ڈالا ہو ایسی تکلیف ہے کہ نہیں اسے۔''

ریحانہ پر یقین لہجے میں کہہ رہی تھی اور جواد دانت پیستے ہوئے خود کو کوئی سخت جملہ کہنے سے روک رہے تھے۔

''بولو بشریٰ کیسا محسوس ہو رہا ہے؟'' ریحانہ نے ٹھیک بابا جی والے پروفیشنل لہجے میں پوچھا میری ایک دم سے ہنسی چھوٹ گئی میری ہنسی سے جہاں ریحانہ کا موڈ بری طرح سے خراب ہوا وہیں جواد کے منہ سے چھت پھاڑ قہقہہ نکل گیا۔

بولو بشریٰ تمہیں کیسا محسوس ہو رہا ہے؟'' ان کا قہقہہ بمشکل تھما تو انہوں نے ریحانہ کے انداز میں انگلی اٹھا کر مجھ سے پوچھا تو میں ریحانہ کے چہرے کے خوفناک تاثرات دیکھ کر ڈر سی گئی۔

''مجھے چکر سے آ رہے ہیں نقاہت سی محسوس ہو رہی ہے تھوڑی دیر لیٹ جاؤں۔'' میں خود کو سنبھالتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی آخر نند کا دل بھی تو رکھنا تھا اور میرے ان دو جملوں سے ریحانہ کا بگڑا ہوا موڈ بہتر ہو گیا۔

''دیکھا اب ہنسو' اڑاؤ مذاق ایک سال کے اندر بابا جی نے کہا ہے نہ اس کی گود ہری ہوئی تو مجھے پکڑ لینا آ کر۔''

وہ اٹھ کر چابک دستی سے مجھے سہارا دے کر اندر لے جاتے ہوئے بولی۔

''ویسے ریحانہ ڈیڑھ ایک سال تو اچھا خاصا لمبا عرصہ ہے اور بابا جی سال بعد کہاں ہوں آخر ان کی ضرورت تو پورے ارض زمین کو ہے کہیں بھی ان کے مرشد انہیں' دکھی خلقت کی خدمت کرنے کو بھیج سکتے ہیں تم ایک کام کرو۔''

جواد ہمارے ساتھ ہی کمرے میں آئے ریحانہ بستر پر لیٹ گئی تو وہ ریحانہ سے بولے

''وہ کیا بھلا؟'' ریحانہ میرے سر کے نیچے تکیہ اونچا کرتے ہوئے یوں شو کر رہی تھی جیسے میں کسی سیریس سرجری کے مرحلے سے گزر کر آئی ہوں۔

"بھئی اپنے بابا جی سے کہو بابا جی آپ پہنچے ہوئے ولی کامل آپ کے لیے بھلا کیا مشکل ہے اور ہم بھی تو اتنے سالوں سے علاج معالجہ کراتے کراتے تھک چکے ہیں اور اچھے خاصے بے صبرے ہو چکے ہیں سال بھر کون صبر کرے ان سے کہو اپنی کرامت کا کوئی معجزہ دکھا دیں سال بھر کی بجائے بس تین چار مہینوں میں اس بے چاری بشریٰ کی گود ہری کر دو مطلب سالم جیتا جاگتا بچہ اس کی گودی میں آجائے تو یہ اتنا شاندار کارنامہ ہو گا کہ ہم تو ساری عمر کے لیے ان کے مرید بنیں گے ہی میڈیکل سائنس میں بھی یہ کسی تہلکے سے کم نہ ہو گی محض چار ہ ماہ میں بچہ......"

وہ بات مکمل کیے بغیر منہ کے آگے ہاتھ رکھے قہقہہ روکنے کی کوشش میں بھی قہقہہ لگا ہی گئے اور ریحانہ اس کا چہرہ غصے میں پہلے لال بھبھوکا ہوا وہ جواد کو مارنے کو دوڑی اور دونوں بچوں کی طرح آگے پیچھے بھاگتے باہر نکل گئے تو میرے مسکراتے چہرے پر ایک ملول سی چاہت بھری مسکان جامد ہو کر رہ گئی۔

☆

"تم بھی حد کرتی ہو اس بہانے باز کے معمولی بہانے پر آرام سے پانچ سو روپے نکال کر پکڑا دیئے حد ہوتی ہے جب تمہیں معلوم بھی ہے کہ وہ معمول کی طرح جھوٹ بول رہی تھی پھر بھی بشریٰ تمہیں کب انسانوں کی پہچان ہو گی۔" جواد کو یہ سنتے ہی پتنگے لگ گئے کہ میں نے رجو کو پانچ سو روپے دے دیے ہیں ان کے یوں چراغ پا ہو جانے پر تھوڑی دیر کو تو میں گنگ سی رہ گئی فوری طور پر کوئی جواب نہیں بن پڑا۔

"مگر ...... مجھے یقین تھا صاف لگ رہا تھا وہ اس بار جھوٹ نہیں بول رہی تھی باقاعدہ رو رہی تھی بچے کی طبیعت واقعی اچھی نہیں ہو گی۔" میں نے ہکلا ہکلا کر بات پوری کی تھی۔

"یعنی اس بار جھوٹ نہیں بول رہی تھی۔" انہوں نے ہاتھ نچا کر میری نقل اتاری۔

"ویسے تمہیں پتا ہے کہ وہ عادی جھوٹ بولنے والوں میں سے ہے تم جیسی سادہ طبیعت نرم دل اور اگر تم برا نہ مانو تو بے وقوف مالکان بیگموں کو مزید بے وقوف بنانا اس جیسی چالاک عورتوں کے لیے کیا مشکل ہے۔"

وہ محض پانچ سو روپے کے لیے یوں اس طرح بات کر رہے تھے جیسے نہ معلوم کیا قیامت ٹوٹ پڑی ہے وہ تھوڑے کنجوس بلکہ فراخ دلی سے انہیں کفایت شعار کہا کرتی تھی مگر آج جس طرح وہ بات کر رہے تھے کسی بنیے کو بھی مات دیتے لگ رہے تھے۔

"آپ کو غصہ کس بات پر ہے مجھے مزید بے وقوف بنائے جانے پر یا اس کی چالاکی پر جھوٹے بہانے پر یا پانچ سو روپے نکل جانے پر۔" میں نے بڑے تحمل سے بیٹھی ہوئی آواز میں پوچھا تھا کہ اس سے اگلا مرحلہ تو بس آنسوؤں کا تھا جس پر بدقت بند باندھے بیٹھی تھی۔

"تمہارے یوں بے وقوف بن جانے۔" وہ ایک دم سے ابلتے دودھ کی طرح ٹھنڈے پڑتے ہوئے بولے تھے۔

"پیاری بیوی تم بہت بھولی ہو بہت سادہ لوح' آرام سے ہر کسی کی باتوں پر آجاتی ہو پھر چھوٹی چھوٹی باتوں کو دل پر لے کر یونہی رنجیدہ ہوتی رہتی ہو زمانے کے لیے اس طرح تر نوالہ نہ بنو میں تمہارے لیے فکر مند ہوں۔"

وہ میرے ماتھے سے بال ہٹاتے جس لگاوٹ جس ہمدردی اور محبت سے کہہ رہے تھے اس میں ایک شوہر والی رفاقت کا احساس کم تھا اور فکر مند دوست ہم سفر کی تشویش زیادہ تھی مجھے روتے روتے بھی ہنسی آنے لگی۔

"مگر مجھے تو صاف لگ رہا تھا آپ پانچ سو روپے کے لیے اتنے غصے میں آئے تھے۔"

میں نے ان کا ہاتھ تھام کر آنسوؤں کا گھونٹ سا حلق کے پار کر لیا کہ اب ان کو بہانے یا باہر نکالنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔

پانچ سو روپے کی بات نہیں ہے تمہیں معلوم تھا نا وہ جھوٹ بول رہی ہے۔ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"پھر بھی تم نے اسے پیسے دے دیے۔" وہ افسوس بھرے لہجے میں بولے۔

"جواد وہ جس طرح روئی گڑگڑائی میرا دل برا ہو گیا اللہ جانے اس کی کیا مجبوری تھی جو وہ زبان پر نہیں لا سکتی تھی بچے کا بہانہ کر کے ...... اور میں کہتی ہوں وہ ماں نہ جانے اپنے دل پر کیا بھاری پتھر رکھتی ہے جو اپنے بچے پر بیماری کا بہانہ لگا کر روپے وصولنا چاہتی ہے بس اس لیے میں نے زیادہ بحث کی نہ کرید اور......"

میں سنجیدگی سے کہتے ہوئے چپ کر گئی۔

"اور نوٹ تھما دیے کبھی اس فراخدلی کا مظاہرہ ہمارے ساتھ تو کیا نہیں۔" وہ معنی خیز انداز میں بولے تو میں نے انہیں زور سے پرے دھکا دیا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

ویسے ایک بات تو تم مانتی ہونا۔" انہوں نے بیڈ سے ٹیک لگائی اور پرے پڑا ریموٹ کنٹرول اٹھا کر ٹی وی آن کرنے لگے۔

''انسانوں کی پہچان نہیں تم محض اگلے کی زبان اس کے جھوٹ سچ بیان پر بڑے آرام سے یقین کر لیتی ہو نا۔'' وہ مجھ سے منوانا چاہ رہے تھے کہ میں انسانوں کی پہچان کے معاملے میں ایک دم نل ہوں اور اس میں ایسا کچھ جھوٹ بھی نہیں تھا جو کوئی مجھ سے جس طرح جو بات کہتا میں بس ذرا سی پس وپیش کے بعد اسے مان لیا کرتی تھی زیادہ جرح بحث وتمحیص مجھ سے ہوتی نہیں تھی۔

''ہوسکتا ہے ایسا ہو مجھے انسانوں کی پہچان نہ ہو آپ سے تھوڑی کم مگر ایک چیز ہے جو مجھے ایسا کرنے پر اکساتی ہے کہ میں جانتی ہوں سامنے والے کے عزائم اس کا اصلی چہرہ مکمل نہ سہی تیس چالیس فیصد تک جانتی ہوں مگر پھر نظر انداز کر دیتی ہوں جانتے ہیں کیوں۔''

میں نے بال از سر نو کھول کر ادھر اُدھر بکھرنے والی لٹوں کو سمیٹا اور مضبوطی سے کیچر میں جکڑ لیا۔ وہ سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔

''میں انسانوں سے مایوس نہیں ..... جس طرح اللہ انسانوں سے مایوس نہیں' لوگوں کے دھوکوں' چالاکیوں اور دھاندلیوں کے باوجود انہیں رزق' روزی' آسائشیں' راحتیں دیے جارہا ہے قیامت برحق ہے مگر ابھی پردہ پیاں میں ملفوف ہے سو اللہ ہم انسانوں کو رعایت دیے جارہا ہے تو آپ یہ سمجھ لیں مجھے شرم ہی آتی ہے کہ خود ایک معمولی انسان ہوتے ہوئے میں لوگوں کے چھوٹے چھوٹے جھوٹ ان کی ذرا ذرا سی غلطیوں کی باز پرس کسی جابر حاکم کی طرح کروں نہ بھئی مجھ سے تو یہ نہیں ہوتا پانچ سو ہزار سے وہ کتنا نفع کما لے گا کما لے۔ مگر میں اپنے دل کو سخت نہیں کر سکتی میں اب کھانا لگانے جارہی ہوں بس جلدی سے اٹھ کر آجایئے یہ ٹی وی کے سامنے نہ جم جایئے گا۔''

میں انہیں تاکید کرتی ہوں باہر جانے لگی۔

''بھئی ادھر ہی لے آؤ ٹرے میں رکھ کر ہمارے کون سے گھر میں دس آٹھ لوگ ہیں جو سب میز پر اکٹھے ہوں میں اب اٹھ نہیں سکتا۔'' انہوں نے شاید لوگ کی جگہ بچے کہنا تھا یونہی جلدی میں لفظ بدل گئے اور وہ بدلا ہوا لفظ جیسے میرے پیروں کے ساتھ کسی سنپولیے کی طرح لپٹ گیا مجھ سے قدم اٹھانا دوبھر ہو گئے مرے مرے قدموں سے کچن تک آئی۔

بھرا بھرایا کچن تین قسم کے تیار کھانے اعلیٰ قسم کی کراکری کھانے پینے کا سامان' ڈیپ فریزر' فریج کیا نہیں تھا اس لگژری کچن میں منہ کے مزے کے لیے مگر ...... اٹھانے والا جیسے کوئی تھا نہیں ہم دونوں تھے اور دونوں کے ...... اندر سے اشتہا ہی مر چکی تھی۔

بس جینے کو ایک دوسرے کو دکھانے کو خوب رغبت سے کھانے کا ڈرامہ کرتے اور میں ایسی مستعدی اور فکر مندی سے تین تین سالن چولہے پر چڑھاتی جیسے ابھی سکول سے چھٹی کے بعد بچے بھوکے پیاسے کھانا کھانا کرتے گھر میں داخل ہوں گے اور ذرا دیر میں سب چٹ کر جائیں گے اور اگلے ٹائم کے کھانے کی فکر میں پریشان ہوں گے۔

تین تین ڈشز بناتی کھانا سارا بچ رہتا جو اگلی صبح رجو للچائی آنکھوں سے تکتے ہوئے خوش خوش اپنے بچوں کے لیے لے جاتی ہفتے میں دو بار کپڑے دھونے ماسی آتی وہ بھی شاپر بھر بھر کے کر کھانے لے جاتی اور میرا دل ایسے ہلکا پھلکا ہو جاتا جیسے ان سب کے لیے تو میں روز یہ اہتمام کرتی ہوں اتنی محنت ...... اور وہ یہ سب لے جاتی تو جیسے میری محنت وصول ہو جاتی۔

یوں گھر میں خاموشی تھی صرف بیڈروم سے آتی ٹی وی کی ہلکی ہلکی آواز تھی۔

''آخر کب تک...... کب تک میں یہ جھوٹ کی زندگی گزارتی رہوں گی خود کو بہلانے کے لیے اتنے کھانے پکانے اور اگلے دن سب بانٹ دینا آخر میں بھی دوسری عورتوں کی طرح سخت دل بخیل اور کمینی کیوں نہیں ہو جاتی جو نوکروں کو ذرا ذرا سی چیز دیتے ہوئے دس بار ہاتھوں میں لے کر تولتی ہیں پھر بھی دیتے وقت ڈنڈی مار جاتی ہیں یونہی تو نہیں رجو اس گھر سے چپکی ہوئی...... پھر بھی مکار میرے ساتھ جھوٹ بولتی ہے ابھی اس کے گھر کا سارا کھانا راشن تو ادھر سے چلا جاتا ہے پھر بھی ہفتہ دس دن بعد کوئی نہ کوئی بہانہ گھڑ کر پیسے بٹورنے آجاتی ہے اور مجھے کیا ضرورت تھی جواد کو بتانے کی۔ دل میں تو سوچتے ہوں گے کہ میں ان کی محنت کی کمائی دونوں ہاتھوں سے لٹا رہی ہوں۔''

''اوہو بھئی اب یہ تنہائی میں بیٹھ کر کون سا چلہ کاٹا جارہا ہے ادھر میرے پیٹ میں اچھا خاصا بھوک کی وجہ سے اودھم مچا ہے میں سمجھا بیڈروم میں کھانا لانے کا کہا تو روٹھ کر نہیں آئیں اور باہر ہی لگا دیا کہ باہر بھی کچھ نہیں' کیا پکایا نہیں آج کچھ۔'' پتا نہیں کیوں میں نے جواد کو کبھی اپنی طرح ملول رنجیدہ غمزدہ سا نہیں دیکھا یا تو انہیں اپنے تاثرات پر اتنا کنٹرول تھا کہ ہمارے اتنے سالوں کے ساتھ کے بعد بھی ان کے اندر سے اصلی والے جواد، کو دریافت نہیں کر سکی تھی یا پھر واقعی انہیں اس کمی کا دکھ رنجیدہ نہیں کرتا تھا جس کا بھوت ہر لمحہ میرا خون چوسنے میں لگا رہتا تھا۔

''پکایا ہے پکایا کیوں نہیں' لگاتی ہوں۔'' میں پژمردہ سی اٹھی اور آنکھوں میں

اترتے پانی کو جھکتی ہوئی کچن کی طرف بڑھی۔

"یار آج دوپہر میں لنچ بھی نہیں کیا ہمارے باس کو میٹنگ فوبیا ہے آفس میں کھیاں بھی زیادہ ہو جائیں تو وہ میٹنگ بلا لیتے ہیں ساری دوپہر اس بک بک میں گزر گئی' پکایا کیا ہے۔"

وہ اب بے صبری سے پتیلیوں کے ڈھکن اٹھا اٹھا کر دیکھ رہے تھے اور مجھے اپنے بے وقت کے سوگ کی عادت پر غصہ آیا کہ انہیں بھوک تھی۔ میں نے جلدی جلدی چھلکے اتار کر کھانا ٹیبل پر لگایا۔

"کھایا طعام، پایا آرام، اللہ تیرا شکر ہے دیکھو یار اس دنیا میں سارے جھگڑے سارے رپھڑے روٹی کے لیے ہیں۔ مل جائے تو سمجھ ہر طمع کے منہ پر ڈھکن آجاتا ہے یہ مال و دولت، اولاد خواہشات سب وقتی پاگل پن لگتے ہیں اگر پیٹ میں روٹی نہ ہو تو، دیکھا نہیں آج کل اخباروں میں لوگ کیسے روٹی کی خاطر، روپے کی خاطر اپنے بچے سیل کر رہے ہیں اللہ نے ایسی ہی باتوں کو تو قیامت کی واضح نشانیاں قرار دی ہیں کہ والدین پیسے کی خاطر اپنی بھوک کی خاطر اپنے بچے فروخت کر دیں گے اس لیے بھی ہمیں تو کم از کم ہر کھانے کے بعد بڑے اہتمام سے اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔"

جواد کا پیٹ کچھ ضرورت سے زیادہ ہی بھر گیا تھا سویٹ ڈش دوسری بار پیالی میں نکالتے ہوئے وہ کہتے چلے گئے۔

"کس بات کا شکر؟" میں نے گھور کر پوچھا۔

"بھئی اتنی نعمتوں بھرے خوان کا جو اس نے ہماری کوتاہیوں اور گناہوں سے چشم پوشی اختیار کرتے ہوئے ہمیں دیا۔" انہوں نے آخری چمچ بھر کر منہ میں ڈالا اور پیالی پرے رکھ دی۔

"اور دیکھو یہ ہمارے اللہ کی تقسیم ہے وہ کسی کو دے کر آزماتا ہے کسی کو نہ دے کر اور کسی کو دے کر پھر لے لیتا ہے سب اس کے پرکھنے کے انداز ہیں اپنے بندوں کو' اگر اس نے ہمیں اولاد نہیں دی صرف ایک کمی' تو ہمیں ہر دم روتی بسورتی شکل بنا کر ان دی ہوئی دیگر تمام نعمتوں کی نفی نہیں کرنی چاہیے اس سے بڑھ کر ناشکراپن اور کوئی نہیں ہوتا کہ جو پاس ہے اس کا تو شکریہ ادا کریں جو نہیں ملا ہر دم اسی کے لیے روتے بسورتے شام غریباں سی شکل بنائے پھرتے ہیں۔ اب ایک مزے داری چائے ہو جائے باہر لان میں چل کر پیتے ہیں باہر آج موسم اچھا ہے۔" وہ ان ڈائریکٹ انداز میں مجھے کتنی بڑی بات سمجھا گئے تھے کہ میں کتنی

دیر وہیں بیٹھی سوچتی رہ گئی انہیں کیا میرے یوں ہر دم ایسی شکل بنانے کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی میں تو خود وجہ کا چلتا پھرتا اشتہار بنی ہوتی ہوں آنکھ کا اندھا بھی جیسے آرام سے پڑھ لے۔

"واقعی مجھ سے بڑھ کر ناشکرا کون ہوگا! سو نعمتیں ملیں ان کو شمار کیا نہ شکر ایک نہیں ملی تو ہر دم اس کا غم..... اور نعمت بھی ایسی جو سراسر اس دنیا کا مال ہے اس دنیا کے مال کی خاطر میں اپنی عاقبت سے بھی بے فکر ہو چلی ہوں بشریٰ بی بی کیسی زندگی بسر کر رہی ہو تم ایک دم بے کار ایک دم بوگس۔"

میں خود کو لتاڑتی برتن سمیٹتی اٹھ کر چائے بنانے چل دی کہ کہیں جواد کو دوبارہ اندر آکر مجھے چائے کے لیے نہ کہنا پڑ جائے۔

☆

بابا جی کے آپریشن سے بھی کچھ نہ ہوا ہاں اتنا ضرور ہوا کہ میں جو پہلے ہی ان سب چیزوں سے بے زار تھی اور بھی بے زار ہو گئی اس کے بعد ریحانہ ایک اور بابا کے ڈیرے پر لے جانے کے لیے میری منت کرتی رہی مگر میں نہ مانی۔

"ریحانہ جواد نے مجھے سختی سے منع کر رکھا ہے پلیز تم ان سے پوچھ لو۔"

میں نے آخر میں جان چھڑانے کے لیے کہا تو وہ چپ کر گئی کیونکہ اسے معلوم تھا جواد اس بار ہم دونوں کو بالکل کسی ڈیرے پہ جانے کی اجازت نہیں دیں گے۔

ان دنوں جب میں گھٹا ٹوپ اندھیروں میں ہاتھ پیر مارتی بے بس ولاچار کھڑی تھی میرے بھیا منیب احمد اور بھابی شمع آگئی وہ دونوں گزشتہ چھ سات سالوں سے کینیڈا میں تھے۔

بھیا کی اور میری عمر میں بارہ سال کا فرق تھا ہم دو ہی بہن بھائی تھے بھیا کی شادی پر میری عمر گیارہ بارہ سال تھی دو سال بعد ہی امی کا انتقال ہو گیا جبکہ ابو میرے بچپن ہی میں فوت ہو گئے تھے میرے بی اے کرتے ہی بھیا نے بھابی کے دور کے رشتے داروں میں جواد کے ساتھ میرا رشتہ طے کر دیا جواد کی دونوں بہنوں نے مجھے دل و جان سے پسند کیا تھا بلکہ مجھے دیکھتے ہی مجھ پر فریفتہ ہو گئی تھیں حالانکہ میں بہت خوب صورت لڑکیوں میں شمار نہیں کی جا سکتی تھی بس نارمل سی تھوڑی زیادہ اچھی شکل کی سمجھ لیں اور جواد نے تو پہلی رات ہی کس گرمجوشی اور محبت سے مجھے اپنی زندگی میں ویلکم کیا تھا میرے دل سے ہر خدشہ ہر واہمہ اسی رات کی رخصتی کے ساتھ ہی کہیں تحلیل ہو گیا تھا۔

جواد کی بڑی بہن شاہین باجی تو مظفر آباد میں رہتی تھیں اور جواد کی طرح ہنس مکھ

اور ہلکے پھلکے مزاج کی تھیں ان کا آنا بھی سالوں میں ہوتا تھا مگر فون ہفتے میں دو تین بار آ جایا کرتے تھے ان کے شوہر سعودیہ چلے گئے تھے اور چھ سال پہلے بیوی بچوں کو بھی بلا لیا اتنی دور جا کر بھی ان کا جب بھی فون آتا تو باتوں باتوں میں اس خوشخبری کے بارے میں ضرور دریافت کرتیں جو شاید میری زندگی میں آنی ہی نہیں تھی۔

پھر ریحانہ تھی جو پتوکی میں ہونے کی وجہ سے ہفتے پندرہ دن بعد تو ضرور ہی آیا کرتی تھی اسے بھی ایک ہی مراق تھا۔'' ہائے کب ہمارا بھتیجا ہوگا کب ہم اسے گود میں لے کر سینے سے لگائیں گے اپنے کلیجے میں ٹھنڈ ڈالیں گے۔'' وہ کچھ ایسے ترسے ہوئے انداز میں کہتی کہ سیدھی برچھی میرے کلیجے کے پار اتر جاتی اور میں بھی مجرمانہ انداز میں سر جھکا لیتی۔

پھر دس سالوں میں ہر حربہ ہر ٹوٹکا استعمال کرنے کے بعد بالکل مایوس و نامراد ہو کر بیٹھ گئی انہی دنوں ریحانہ کے جیٹھ نے اس کے شوہر کو کراچی بلا لیا اس نے بینک سے گولڈن شیک ہینڈ لیا اور کراچی اپنے بھائی کے کاروبار میں شریک ہو گیا اور ریحانہ بھتیجے کو گلے سے لگانے اور ٹھنڈ ڈالنے کی حسرت لیے بال بچوں سمیت کراچی چلی گئی۔

یوں ہمیں لگا ہم اس بھرے شہر میں اکیلے ہی رہ گئے ہیں میرا ننھیال اور ددھیال بھی خاصا مختصر تھا اور امی ابو کے انتقال کے بعد ان سے ملنا بھی بے حد کم رہ گیا تھا پھر بھی میں سال بھر میں دو تین چکر اپنے دونوں ماموؤں اور خالہ کی طرف لگا لیتی ایک چچا شہر میں تھے وہ بھی کبھی کبھار آ جاتے یا ہم چلے جاتے مگر پھر بھی ہمارے سوشل تعلقات بے حد مختصر تھے۔

خیر میں ذکر کر رہی تھی جب بھیا اور بھابی آئے انہوں نے میری اتری ہوئی شکل دیکھی تو دونوں ہی پریشان ہو گئے۔

سب کچھ بھابی کے سامنے کھول کر بیان کر دیا ان کے دو بچے تھے اور میری طرف سے بھی وہ ایسے مایوس نہیں تھے کہ ابھی بالکل کورا جواب تو کسی ڈاکٹر نے بھی نہیں دیا تھا۔

''بشریٰ ہماری پندرہ دن بعد واپسی ہے یا تو دونوں ہمارے ساتھ چلو یا اپنی رپورٹس مجھے دو وہاں دو تین بہت Compilent ڈاکٹرز ہیں ان کو کنسلٹ کرتی ہوں۔ اب تو خدانخواستہ بانجھ پن کے بھی ہزاروں علاج نکل آئے ہیں تو دونوں میں سے تو صرف تمہیں ہی مسئلہ ہے تو اس کا بھی کوئی نہ کوئی علاج ہوگا ہی۔'' بھابی نے مجھے حتی الامکان تسلی دی۔

ساتھ جانے پر جواد تو راضی نہ ہوئے میں نے اپنی تازہ ترین ساری رپورٹس اور بائیو ڈیٹا ان کے ہمراہ کر دیا۔

ہفتے بھر بعد ہی ان کا فون آ گیا ایک دو ٹیسٹ اور منگوائے اور کہا پرسوں تینوں کا بورڈ حتمی فیصلے پر پہنچ جائے گا تم بھی خوب دعا کرنا ہم بھی کریں گے اللہ کے گھر میں دیر ہے اندھیر نہیں۔'' بھابی نے مجھے تسلیاں دیتے ہوئے فون بند کر دیا۔

جس صبح بھابی کا فون آنا تھا وہ پوری رات میں نے جاگ کر گزاری پہلے تو آدھی رات اور اس کے کافی دیر بعد تک مصلے پر بیٹھی رو رو کر اللہ سے گوہر نایاب مانگتی رہی جو مجھے صرف اس کے خزانے سے مل سکتا تھا پھر بے قراری ہو کر باہر آ گئی جواد تو مزے سے سو رہے تھے پہلے دو چار بار مجھے آوازیں دے کر سونے کے لیے کہتے رہے پھر کروٹ بدل کر منٹوں میں خراٹے لینے لگے۔

''انہیں کوئی فکر نہیں انہیں معلوم ہے کہ ان کی رپورٹس بالکل کلیئر آتی ہیں اگر کوئی نقص' کوئی کمی ہے تو میرے اندر ہے انہیں کل کو بچہ چاہیے ہوگا کوئی ایسی دیوانی خواہش سر اٹھائے گی تو وہ دوسری شادی کر کے کسی بھی زرخیز عورت کے ساتھ...... یہ اپنی خواہش پوری کر سکتے ہیں سو یہ کیوں فکر کریں۔'' اسی خیال کے ساتھ میرے آنسو اور بھی تواتر کے ساتھ بہنے لگے۔

باہر چاندنی چٹکی ہوئی تھی کیاریوں اور گملوں میں لگے پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو رات کے اس پہر ساری اور پھیلی ہوئی تھی ہلکی ہلکی خنک ہوا امرود کے پیڑوں اور انار کے درختوں کے پتوں کو چھیڑتی سرسراتی پھر رہی تھی مگر یہ خنکی میرے دل کے تپتے صحن کو اور بھی جھلسا رہی تھی۔

اگر صبح میری ساری رپورٹس کے جواب میں ڈاکٹرز کا جواب نفی میں ہوا تو......''

ہوا کے ساتھ سرسراتا ہوا خیال میرے دامن سے لپٹا تھا دھک سی رہ گئی۔

لمحہ بھر کو سن کھڑی رہی پھر جیسے بے جان سی ہو کر بینچ پر بیٹھ گئی۔

''ایسا ممکن ہے اور مجھے اس خیال کو زیادہ اپنے ذہن میں رکھنا چاہیے جبکہ یہاں کے سارے قابل ڈاکٹرز' ڈاکٹرز کے بورڈ اسی طرح کا فیصلہ دے چکے ہیں تو وہاں سے بھی اس جواب کی توقع ہو سکتی ہے...... پھر میں کیا کروں گی۔'' میں نے سر بینچ سے ٹکایا اور بے چین ہو کر اٹھا لیا۔

''اللہ سب کو دیتا ہے مجھے نہیں دے گا بھلا۔''

خوش امیدی نے سر اٹھایا۔

"اللہ بہت سوں کو نہیں بھی دیتا پھر وہ کیا کرتے ہیں۔"

دوسرا خیال کسی سنپولیے کی طرح اندھیرے میں لہرایا۔

"وہ پھر بھی اللہ کے وجود سے منکر نہیں ہوتے اس سے ناراض ہوتے ہیں مگر مستقل ناراض نہیں رہ سکتے...... اللہ سے مستقل ناراضی تو کوئی بھی افورڈ نہیں کرسکتا۔" اس خیال نے ہی مجھے ٹھٹکا دیا۔

شعور کی آنکھ کھلنے سے بھی پہلے اللہ ہمارے اندر ہمارے باہر اردگرد ہر جگہ موجود نظر آیا روزمرہ کی زندگی میں اللہ کے بتائے ہوئے قوانین نافذ ہوں یا نہ ہوں مگر اللہ، خدا، اب اتنا کامن اتنا زیادہ استعمال ہوتا ہے کہ دس جملوں میں شاید دس بار تو ضروری ہی اللہ کا ذکر کرتے ہیں اس نام کو لیے بغیر ہم رہ ہی نہیں سکتے اور میں جو ابھی مصلے پر بیٹھی اللہ سے جھگڑ رہی تھی کہ "یا اللہ اگر میری رپورٹس پازیٹو نہ آئیں اگر تو نے میرے دل کی مراد پوری نہ کی...... تو میں تجھے نہیں پکاروں گی پھر تجھ سے کچھ نہیں مانگوں گی...... گویا ناراض ہو جاؤں گی۔"

بس دل میں ضد سی ٹھان کر جائے نماز سے اٹھ آئی تھی گویا اللہ کو دھمکی دی تھی اگر اس نے میرے دل کی خوشی پوری نہ کی تو...... شاید اس کے باوجود سے منکر تو نہ ہوں مگر ایسی اپنائیت بھی نہ رہے گی۔

اور اب یہاں ٹہلتے ہوئے اللہ کے بارے میں اپنی دھمکی اور اپنے مطالبے کے بارے میں سوچتے ہوئے مجھ پر حیرت انگیز انکشاف ہو رہے تھے۔

"میں شعور سنبھالنے سے اب تک اپنی ہر چھوٹی بڑی معمولی غیر معمولی ہر خواہش ہر مطالبہ اللہ کے سامنے ہی تو پیش کرتی رہی تھی اگر میں خدانخواستہ اس ضد کے پورے نہ ہونے کے باعث اللہ سے ناراضی کا اعلان کرتی ہوں تو پھر میرا کیا بنے گا؟

مجھے تو ہر بات ہر ذکر میں اللہ کا نام لینے اپنی کجی کی خامی کی ذمہ داری اللہ پر ڈالنے کی عادت ہے آج اگر میں خدانخواستہ اس یکطرفہ ناراضی کا اعلان کرتی ہوں تو بھی نقصان میرا ہی ہوگا میں ایک اتنے پاور فل ذکر سے محروم ہو جاؤں گی جبکہ میں جانتی ہوں چند دنوں...... محض چند دنوں کے بعد مجھے توبہ تلا کرتے ہوئے دوبارہ اسی کی طرف لوٹنا پڑے گا اپنی کوتاہی اپنی لغزشوں کی معافی مانگ کر پھر سے اس کے دروازے سے لپٹنا ہوگا تو پھر...... اس بے کار کی ناراضی کا کیا حاصل؟

معلوم نہیں اس کی کیا مرضی ہے اس نے میرے بارے میں کیا طے کر رکھا ہے

میں یوں اسے دھمکا کر فیصلہ اپنے حق میں تو کروا نہیں سکتی تو پھر ایسی دل کو اس پر راضی کرنے کی کوشش کروں جس میں میرا اللہ راضی ہو۔

اپنی خامیوں کا اعتراف کرنے کے بجائے سب کچھ اللہ پر ڈال دینے کی عیاشی مفت میں...... کہ جی میرا کیا دوش سب اللہ کی مرضی ہے...... اور پھر وہی ہوا جو اللہ کی مرضی تھی۔

میری تمام رپورٹس انتہائی مایوس کن اور نگیٹو تھیں ڈاکٹرز کا میڈیکلی حتمی فیصلہ تھا کہ مجھ میں ماں بننے کی صلاحیت پرسنٹیج کی زبان میں انتہائی کمترین ہے کہ شاید انہوں نے فکر شو کر کے میری کمتری میں اضافہ نہ کرتے ہوئے مجھے سہارا دینے کی کوشش کی جبکہ انہیں نہیں معلوم تھا میں اللہ کی مرضی کا ستون کھڑا کر کے پہلے ہی اپنے دل کو بڑا مضبوط سہارا دے چکی ہوں فقط ان تین حرفوں نے ان تین لفظوں نے مجھے اندر باہر سے کیسا مطمئن کر ڈالا تھا کہ اس کے بعد میں نے ان تمام رپورٹس اور کاغذوں کو چولہے میں جھونک دیا۔

مجھے یوں لگا شادی کے دس سال بعد ایک نئی بشریٰ نے جنم لیا ہے میں نے چھوٹی چھوٹی نیکیوں کو بڑھ بڑھ کر کرنے کا وطیرہ اپنا لیا جو کوئی مجھے محروم جان کر اظہار تاسف کرتا میں کندھے اچکا کر اللہ کی مرضی کہہ دیتی میرے پاس اللہ جیسا سہارا جو موجود تھا جو میری ہر پریشانی ہر محرومی کا بوجھ بخوشی اپنے ذمے لینے کو تیار تھا مجھے اور کیا چاہیے تھا پھر میں نے دو طوطے پالے مگر دونوں انتہائی باتونی اور ٹیں ٹیں کرنے والے تھے۔

وہ ساری رات ٹیں ٹیں کرتے شور مچاتے رات میں کم سونے کی بیماری تھی شاید انہیں اور جواد کا موڈ آف ہو جاتا پھر بھی میری دلجوئی کے لیے انہوں نے بہت سارے دن ان کو برداشت کر لیا ایک دن جانے کیسے پنجرے کا دروازہ کھلا رہ گیا پنجرہ باہر کاریڈور میں پڑا تھا دونوں بے وفا اڑ گئے میرا گھر پھر سے سونا ہو گیا۔

پھر ایک بلی بالکل دودھ کی طرح سفید فروالی منگوائی میں نے چند ہی دنوں میں وہ مجھ سے سارے گھر سے مانوس ہو کر اندر باہر میاؤں میاؤں کرتی پھرتی رات کو چپکے سے میرے پاس بستر میں آگھستی اس کے نرم نرم مخملی فر پر ہاتھ پھیر کر میری ممتا کو کیسا سکون ملتا تھا میں جواد کو بتانے سے قاصر تھی جنہیں اس بے زبان سے زبردست بیر ہو چکا تھا۔

ایک رات سوتے ہی ان کی ٹانگ اس کے پیٹ میں لگ گئی جانور ہی تھا تکلیف سے بلبلا اٹھی اور اس نے پنجہ مار کر پاؤں زخمی کر دیا ان کے غصے کا لاوا ابلنے سے پہلے میں نے وہ بلی رجو کے گھر اس کے بچوں کے کھیلنے کو بھجوا دی۔

اس کے بعد میں نے گھر کا سناٹا توڑنے کی احمقانہ کوششیں ترک کر دیں بیچ میں دو بار جاب کا ہڑکا اٹھا کہ ڈاکٹرز کا بھی میرے لیے بہترین مشورہ یہی تھا دو دو مہینوں بعد ہی میں نے ان دونوں نوکریوں سے ہاتھ کھینچ لیا میں بنیادی طور پر ہوم برڈ تھی گھر کے بغیر رہ نہیں سکتی تھی ۔دونوں نندوں کے فون اب بھی آتے تھے مگر بجھے بجھے یاس بھرے۔

دو چار بار انہوں نے دبے دبے لفظوں میں جواد کی دوسری شادی کے بارے میں ذکر بھی کر ڈالا بلکہ ریحانہ نے تو اشاروں کنایوں کے بعد ایک روز کھل کر کہہ بھی ڈالا اور مجھے اس میں ان کا کوئی قصور نظر نہیں آیا اور مجھے کچھ کچھ جواد کی مرضی بھی اس میں معلوم ہو رہی تھی شاہین باجی کے ان اشاروں کی طرف میں نے اشارہ کر کے بتایا تو وہ چپ کر گئے۔

وہ دن میری بیاتا زندگی میں قیامت کے دن تھے۔

جواد کسی لڑکی کسی عورت کو نظر بھر کر بھی دیکھتے تو میں ٹھٹک کر رہ جاتی ان کی گفتگو میں کسی انجان عورت کا ذکر دوسری بار ہوتا تو میں بے اختیار چونک کر انہیں دیکھنے لگتی وہ بھی ایسے گھنے تھے کبھی سرا میرے ہاتھ میں نہ دیتے۔

ان کے کولیگ ثمر کی شادی ہوئی تو ان دونوں میاں بیوی کی ہم نے دعوت کی شادی اچھی خاصی ایج میں ہوئی تھی ساتھ میں مسز ثمر کی بہن آصفہ بھی تھی جسے دوران ڈنر جواد نے ایک دو بارہ نہیں کئی بار نا صرف نظر بھر کر دیکھا بلکہ دوبارہ اسے مختلف ڈشز بھی سرو کیں میرا ماتھا وہیں ٹھنک گیا۔

مجھے آصفہ اس وقت اپنے اس پیارے سے گھر میں چلتی پھرتی نظر آنے لگی دل کے اندر جیسے کوئی دیوار سی گر گئی۔

ان کے جانے کے بعد مردہ بدن کے ساتھ کچھ بھی سمیٹے بغیر بیڈ پر لیٹ گئی

"اچھی دعوت ہو گئی تم کوکنگ میں ماسٹر ہو ورنہ یہی دعوت ہم کسی اچھے ہوٹل میں دیتے تو چار پانچ ہزار سے اوپر بل بن جاتا تھا بھئی یونہی تو ہم تمہارے قدر دان نہیں۔"

وہ موڈ میں کم کم ہی آتے تھے آج کی یہ تعریف مجھے سرا سر آصفہ کی بدولت لگ رہی تھی شاید وہ موضوع رواں کرنے کو مجھے خوش کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

"کتایا کٹی (بچھڑا یا بچھیا) جو بھی ہونا ہے ہو جائے۔" میں نے بھی فیصلہ کن انداز میں سوچا اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"یہ آصفہ تو شاید مسز ثمر سے بھی بڑی ہیں ایج میں۔"

میں نے پہلا تیر اندھیرے میں چلایا۔

"ہوں شاید۔" انہوں نے فوراً بے نیازی کی بکل اوڑھ لی۔

"ان کی شادی نہیں ہوئی ابھی۔" میں جانتی تھی مگر پھر بھی پوچھ رہی تھی کیوں شاید ان کی سوئی ایک ہی جواب پر اٹک گئی تھی۔

"ویسے آپ نے ان کی سسٹر کو بھی انوائیٹ کیا تھا۔" آصفہ کی آمد غیر موقع تھی سو میں نے پوچھ لیا اور اس کا جواب وہ "ہوں" شاید تو کبھی بھی نہیں دے سکتے تھے۔

"نہیں وہ ان کے گھر آئی ہوئی تھیں بھابی کو لینے یہاں سے انہوں نے بھابی کے میکے ہی جانا تھا اس لیے وہ ساتھ لے آئے کیوں تمہیں اچھا نہیں لگا۔"

"آپ کو اچھی لگیں۔" میں نے اچھا کو اچھی میں بدلتے ہوئے پوچھا۔

"کون؟" کھاگ تھے اس تبدیلی تذکیر کو فوراً بھانپ گئے۔

"آصفہ اور کون؟" میں نے بھی دوٹوک بات کرنے کا سوچا۔

"اچھی ہے مگر تم کس لحاظ سے پوچھ رہی ہو۔" وہ اب کے بڑے جاندار انداز میں ٹھٹکے تھے۔

"ان دونوں بہنوں کی شادیاں دیر سے ہوئیں بلکہ آصفہ کی تو بڑی ہونے کے باوجود ابھی بھی نہیں ہوئی دونوں کے ماں باپ چھوٹی عمر میں رخصت ہو گئے تو اس لیے...... اب یہاں ادھر انہیں بلامقصد تو بہن بہنوئی نہیں لائے ہوں گے۔" میں ان کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔

"کیا مطلب؟ کس مقصد کے لیے بھلا۔"

"پلیز جواد آپ مجھ سے یہ بلی چوہے کا کھیل نہ کھیلیں آپ نے ثمر بھائی سے اپنی شادی کا ذکر کیا ہوگا تو وہ اس لیے اپنی سالی کو کھانے پر لے کر آئے تا کہ آپ دونوں......"

"شٹ اپ بشریٰ مجھے تم نے ایسا سمجھ رکھا ہے۔" یکدم تپ گئے۔

"تو اور کیا سمجھوں۔" میں آنکھوں میں آنسو بھر لائی۔

"میرا اندازہ پہلے دن سے تمہارے بارے میں بالکل درست ہے تمہیں انسانوں کی پہچان ہی نہیں ابھی تک تم نہ مجھے سمجھ سکیں نہ جان سکیں بہت افسوس ہے مجھے۔" وہ دکھی سے ہو گئے۔

"اس میں پہچاننے نہ پہچاننے والی کون سی بات ہے آپ کی بہنوں کا یہ خیال ہے

بلکہ ان کی تجویز ہے اور جو میری کنڈیشن ہے اس میں یہ غلط اور ناجائز بھی نہیں آپ ان کے اکلوتے بھائی ہیں آپ کی اولاد کی تمنا ان سے زیادہ اور کسے ہوگی۔"

"کیا مجھ سے زیادہ انہیں تمنا ہے۔" وہ لمحہ بھر بعد بولے تو مجھ سے فوری کوئی جواب نہیں بن پڑا۔

"بہر حال اب تمہیں منہ سے اور صاف الفاظ میں مجھے بتانا پڑے گا میں اپنی زندگی میں الحمدللہ بہت مطمئن ہوں اولاد قسمت میں ہوگی تو ضرور ملے گی اگر میرا ایسی خواہش کے حصول کا ارادہ ہوا جس کے لیے دوسری شادی ناگزیر ہوئی تو اس کا علم سب سے پہلے تمہیں ہوگا اور کسی کو نہیں اس لیے آئندہ تم اس بارے میں یوں خود کو بے حال مت کرنا تھکی ہوئی ہو اب سو جاؤ۔"

انہوں نے کیسی تسلی میرے بے قرار دل کو دی تھی اس کے بعد نیند کس کافر کو آنی تھی مجھے یوں لگا جیسے کسی نے میرے گھر کی چابیاں مجھ سے چھین کر دوبارہ مجھے تھما دی ہوں۔

"جواد ہم کوئی بچہ ایڈاپٹ کر لیتے ہیں۔" ایک آخری حل بھی رہ جاتا تھا جو بار ہا میری زبان پر آتے آتے رہ گیا تھا۔

"ہوں دیکھیں گے ابھی سو جاؤ۔" وہ بے تاثر لہجے میں کہہ کر کمپیوٹر ٹیبل کے پاس بیٹھ گئے اور ان کی پشت کو دیکھتے مجھے بھی جلدی نیند آ گئی۔

☆

"بیگم صاحبہ کوئی شخص باہر گیٹ سے صاحب کے بارے میں پوچھ رہے ہیں۔" رجو نے مجھے کچن میں آ کر بتایا۔

"جواد کے بارے میں۔" میں تیزی سے کباب بنا رہی تھی جواد کے آنے کا ٹائم ہو رہا تھا شام کی چائے پر اچھا خاصا اہتمام میں کرتی تھی۔

"جی یہ کارڈ بھی دیا ہے انہوں نے کہ صاحب سے ضرور ملنا ہے۔" رجو نے انگلش میں پرنٹڈ کارڈ میرے آگے کیا رحیم صاحب تھے شاید۔

"اچھا یوں کرو انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ جواد آنے والے ہیں میں ابھی فون کر کے پتا کرتی ہوں۔"

رجو اجنبی کو بٹھا کر کچن میں آ کر میرے ساتھ کام کرنے لگی۔

جواد آفس سے نکل آئے تھے فون ریسیو نہیں کر رہے تھے ڈرائیونگ کے دوران وہ

موبائل فون نہیں سنا کرتے تھے اس لیے میں فون رکھ کر کچن میں آ گئی اور چائے کا پانی چولہے پر رکھ دیا۔ چائے تیار تھی جب جواد گھر آ گئے۔

"جواد کوئی صاحب آپ سے ملنے آئے ہیں رجو نے انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا ہے چائے تیار ہے اگر آپ کہیں تو ڈرائنگ روم میں بھجوا دوں۔" میں نے ان کو سلام کرتے ہوئے بریف کیس پکڑا اور اس شخص کے بارے میں بتایا۔

"مجھ سے ملنے گھر کون آ سکتا ہے بھلا۔" وہ ماتھے پر شکن لیے اندر چلے گئے۔

اور جب واپس آئے چند ہی منٹوں بعد تو ان کے ماتھے کی وہ شکنیں پورے چہرے پر پھیل چکی تھی۔

"کب عقل آئے گی تمہیں شہر بھر میں کیسی کیسی وارداتیں ہو رہی ہیں اور تم بالکل اجنبی انجان لوگوں کو بلا کر ڈرائنگ روم میں بٹھا لیتی ہو تم کسی دن اپنے ساتھ میرا کام تمام کرواؤ گی بہت بے وقوف ہو تم۔" وہ میں کچن میں کھڑے کھڑے گرجتے برستے باہر نکل گئے اور میں جو ٹرالی سجائے دھکیلتی ہوئی باہر لا رہی تھی وہیں ہکا بکا سی کھڑی رہ گئی۔

رجو کے ساتھ سلیٹی شلوار قمیص میں پتلا دبلا اچھی خاصی گہری رنگت مگر تیکھے نقوش والا آدمی اونچے لمبے وجود کو سیاہ رنگ کی چادر میں لپیٹے میرے پاس سے گزر کر باہر جا رہا تھا۔

اس کی نگاہ سرسری سی میری طرف اٹھی اور جھک گئی۔

اس کی نظروں میں کیا نہیں تھا عجیب سی لاچاری۔

"کیوں بھلا؟ کیسی رحم بھری نظروں سے اس نے میری طرف دیکھا تھا...... کون تھا یہ؟"

میں تھوڑا الجھتی ڈرتی اندر چلی آئی جواد بھی غصے میں تھے۔

"جواد سوری میں نے تھوڑی دیر اسے بٹھایا تھا وہ تو رجو میرے ساتھ رجو بھی تو تھی۔" میں نے انہیں احساس دلانے کی کوشش کی۔

"ہاں رجو تو کمانڈو رہ چکی ہے نا۔" وہ طنز بھرے انداز میں بولے۔

"مگر اس نے آپ کا نام لیا تھا تبھی تو رجو اسے اندر لائی تھی۔" میں نے ایک اور دلیل پیش کی۔

"اچھا جو بھی راہ چلتا میرا نام لے کر دروازہ کھٹکھٹائے تو آپ اسے گھر کے اندر لا بٹھائیں گی۔" وہ غرا کر بولے تو میں دو قدم پیچھے بدک گئی۔

"تو کیا وہ آپ سے ملنے نہیں آیا تھا مجھے اچھا خاصا مشکوک لگ رہا تھا بھٹی صاحب کے بیٹے کو ٹیوشن ٹیوٹر کی ضرورت تھی اسی سلسلے میں کسی حامد اختر نے اسے بھیجا تھا اور تم نے۔" وہ اب غصہ پینے کی کوشش کر رہے تھے۔

"کوئی بے چارہ سا لگ رہا تھا آپ کو مشکوک جانے کیسے لگا۔" میں دل کا خیال زبان پر لے آئی۔

"تمہیں تو ساری دنیا ہی بے چاری لگتی ہیں بس نہیں چلتا سارے بے چاروں کو پناہ سے ڈالو۔" وہ چڑ کر بولے تو میں ہنس دی۔

"لگتا ہے آج پھر لنچ نہیں کیا آپ نے صرف بھوک ہی آپ کو اس حد تک چڑچڑا کر سکتی ہے۔"

میں نے ان کو منانے کی کوشش کی تو وہ سر ہلاتے کپڑے چینج کرنے چلے گئے۔

"جانے بے چارے کو بھوک لگی تھی رجو کے ہاتھ پانی منگوا کر پیا تھا جواد اسے چائے کا ہی پوچھ لیتے۔"

وہ بھری ٹرالی میں اندر لے جا رہی تھی اور اس کا مظلوم سا سراپا اور لاچار نظریں مجھے ڈسٹرب کر رہی تھیں مگر اب میں اس کی ہمدردی میں کوئی بھی لفظ بول کر جواد کے مزید بھڑکنے کا رسک نہیں لے سکتی تھی سو چائے خاموشی ہی سے پی گئی۔

☆

کل پہلا روزہ متوقع تھا میں اور رجو کچن میں بری طرح مصروف تھیں روزہ رکھنے والے تو گھر میں دو ہی تھے مگر اہتمام دس بندوں جتنا کیا جاتا دو تین مسجدوں میں افطاری سحری بھجواتی تھی میں اس کے علاوہ بھی اور بہت کچھ ہوتا تھا چکن رولز، کباب، شامی، سموسے بنانے کا سامان بکھرا ہوا تھا اور ہم دونوں وقت کے ساتھ لڑ رہی تھیں ایک چولہے پر چکن، رولز کے لیے رکھا تھا تو دوسرے پر املی کی چٹنی ابل رہی تھی تیسرے پر آلو بخارے کی چٹنی۔

ڈور بیل بجی تھی رجو آٹا گوندھ رہی تھی مجبوراً مجھے ہی جانا پڑا یوں بھی جواد کے آنے کا ٹائم تھا چوکیدار نوکری چھوڑ گیا تھا اور دوسرا کوئی بھروسے کا آدمی ابھی مل نہیں رہا تھا رمضان میں بھی اس وجہ سے کافی پرابلم ہو سکتی تھی میں نے جواد کی آمد کے خیال سے سرسری سا کون ہے، پوچھ کر گیٹ کھول دیا۔

مجھے ایک جھٹکا سا لگا سامنے وہی شخص کھڑا تھا اس روز والے سلیٹی رنگ کے شلوار

قمیص میں ملبوس سیاہ چادر لیے۔۔۔ میں نے جلدی سے دروازہ بند کرنا چاہا اس نے سلام کر کے مجھے ایسا کرنے سے روک دیا اب میں نے غور سے دیکھا اس کے انتہائی بائیں طرف کوئی اور بھی تھا۔

سیاہ چادر میں لپٹا چہرہ اور بدن نقاب سے مکمل طور پر ڈھکے ہوئے وہ کوئی کم سن سی لڑکی لگ رہی تھی دونوں کے پیروں کے پاس نسواری رنگ کا پھولا ہوا بیگ پڑا تھا۔

"بیگم صاحب آپ لوگوں نے کوئی کمرہ کرائے پر دینا ہے شاید۔۔۔ بھٹی صاحب نے بھیجا ہے ہمیں۔۔۔ فوری طور پر کمرہ چاہیے کرائے کے لیے۔" وہ بیٹھی ہوئی آواز میں گھگیا کر یوں بول رہا تھا جیسے ابھی رو دے گا اور مجھے یاد آیا ہمارا بیرونی گیسٹ روم خالی پڑا تھا کئی بار میں جواد سے کہہ چکی تھی کسی۔۔۔ لائق چھوٹی سی فیملی کو دیکھ کر کرائے پر دے دیتے ہیں مجھے دوسراہٹ کے لیے کوئی مل جائے گا اور تھوڑا اس گھر کا سناٹا بھی دور ہو جائے گا وہ میری بات ان سنی کر جاتے پچھلے دنوں کہہ رہے تھے کسی جاننے والے ڈیلر سے انہوں نے بات کی ہے شاید اس نے بھیجا ہو مگر اب میں ان دونوں کو اندر بٹھا کر جواد کی خفگی کا رسک نہیں لے سکتی تھی۔

مگر لڑکی پر پڑنے والی دوسری نظر نے مجھے ٹھٹکا دیا۔

سیاہ چادر میں اس کا وجود۔۔۔ کیسا بھرا ابھرا ہوا۔۔۔ میرے دماغ میں کچھ کلک ہوا میں جواب دیتے دیتے رہ گئی۔

"ابھی تو میرے شوہر گھر پر نہیں آپ پھر کسی وقت تشریف لائیے۔" میں نے لڑکی پر ایک بھرپور نظر ڈال کر کہا۔

"اس وقت۔۔۔ ہمیں ذرا مشکل ہے اصل میں ہم اپنے رشتہ داروں کے ہاں ٹھہرے ہوئے تھے ہمارا تعلق جہلم سے ہے مجھے نوکری کے سلسلے میں ادھر آنا پڑا فوری طور پر کوئی گھر نہیں مل رہا تھا بلکہ سچی بات کہوں گھر تو مل رہے تھے مگر ان کا کرایہ ہمارے رینج سے خاصا بڑھ کر تھا کچھ دن رشتہ داروں کے پاس ٹھہرے ہوئے تھے بس کافی دنوں سے وہ لوگ ہمیں جانے کو کہہ رہے تھے اور اب۔۔۔ عین وقت پر سمجھ نہیں آ رہی، کہاں جائیں بھٹی صاحب نے آپ کا ایڈریس دیا۔ آپ کا ایک کمرے کا اتنا کرایہ ہو گا کہ ہم افورڈ کر سکیں۔" وہ لجاجت بھرے انداز میں اس طرح بیٹھی ہوئی آواز میں کہہ رہا تھا۔

لڑکی شاید کھڑے کھڑے تھک گئی تھی کمر پر ہاتھ رکھ کر گیٹ کے بند پٹ سے ٹیک لگانے لگی۔ مجھے بے اختیار اس کی حالت پر ترس آیا۔

"دیکھیں یہ فیصلہ تو میرے شوہر ہی کر سکتے ہیں کہ آپ کو کمرہ رینٹ پر دینا ہے یا نہیں آپ اگر پھر نہیں آ سکتے تو تھوڑی دیر یہیں رک کا ان کا ویٹ کر لیں وہ آنے ہی والے ہیں شکریہ۔" میں نے حتیٰ الامکان لہجے کو روکھا بناتے ہوئے کہا اور گیٹ بند کر دیا۔ اندر آنے کے بعد مجھے عجیب سی بے کلی لگ گئی۔

رجو کے ہاتھ ان دونوں کے لیے پلاسٹک کی کرسیاں بھجوا دیں اور شربت کے گلاس بھی۔

دوبارہ جواد کو فون کیا وہ ریسیو نہیں کر رہے تھے بے چینی سے ٹہلتے ہوئے ان کا انتظار کرنے لگی۔

"اللہ جانے کیا چکر ہے جواد صحیح کہتے تھے مشکوک لگ رہے ہیں۔" اسی وقت جواد کی گاڑی کا ہارن سنائی دیا۔

ان کا ردعمل میری توقع کے عین مطابق تھا انہوں نے دونوں کو فوری طور پر وہاں سے چلے جانے کو کہا تو ان کی حالت ایسی ہو گئی جیسے ابھی ختم ہو جائیں گے میں برآمدے سے کھڑی دیکھ رہی تھی گاڑی اندر آ گئی گیٹ بند ہو گیا مگر وہ دونوں نہ جانے کس آس کے سہارے ابھی بھی باہر ہی کھڑے تھے۔

"جواد پلیز! وہ لڑکی اس حال میں ہے اور رات ہو رہی ہے بے سہارا لگتے ہیں کہاں جائیں گے آپ بھٹی صاحب کو فون کر کے پوچھ لیں۔" میں جواد کے اندر آتے ہی لجاجت بھرے انداز میں بولی مجھے امید تو نہیں تھی پھر بھی انہوں نے بھٹی صاحب کا نمبر ملایا بات کی اور فون رکھ دیا۔

"ان کے بیٹے کو ٹیوشن پڑھا رہا ہے کہ کمپنی میں جاب بھی کرتا ہے کہہ تو رہے ہیں بھروسے کا آدمی ہے اس وقت بہت مجبور ہے بھائیوں کے ساتھ کوئی جائیداد کے بٹوارے کا جھگڑا ہے جس سے بچنے کے لیے وہ شہر ہی چھوڑ آئے ہیں اور......" وہ متذبذب سے لہجے میں کہہ رہے تھے۔

"پھر؟" میں نے آس بھرے لہجے میں پوچھا۔

"وہ چوکیدار کا انتظام ہو گیا ہے، بشیر نام ہے اس کا سر جمال نے رکھوایا ہے پہلے ان کے گھر کام کرتا تھا ان کا اب ٹرانسفر ہو گیا ہے تو انہوں نے میری طرف ریفر کر دیا کہہ رہے تھے بھروسے کا آدمی ہے اور خاصا دلیر بھی ابھی آدھے گھنٹے میں آ جائے گا۔" ہم جس

علاقے میں رہتے تھے شہر کا اچھا پوش ایریا تھا دور دور تک کوٹھیاں بنی ہوئی تھیں مگر مہینوں سے چوری ڈکیتی کی وارداتیں ہونے کی وجہ سے ہم بھی چوکیدار رکھنے پر مجبور ہو گئے تھے۔

"تو پھر کیا مسئلہ انہیں رکھ لیتے ہیں چوکیدار کو ان پر نظر رکھنے کی تاکید کر دیں گے یوں بھی یہ کمرہ تو ہمارے گھر کی مین بلڈنگ سے ہٹ کر ہے، آپ اللہ کے خوف کے خیال سے...... پلیز شام گہری ہو رہی ہے اگر آپ کہیں تو۔" وہ اپنی طرف سے زیادہ میری بے چینی دیکھ کر ہاں کرنے پر مجبور ہو گئے۔

میں نے رجو کو بھیج کر ان دونوں کو اندر گیسٹ روم میں بلوا لیا وہاں ایک پرانا بیڈ اور قالین بچھا ہوا تھا کچن وغیرہ تو تھا نہیں ارادہ تھا کہ کسی کو پراپر طور پر کرائے پر دیں گے تو بیرونی چھوٹے برآمدے میں مختصر سا کچن بھی بنوا دیں گے مگر اب......

وہ دونوں ممنون نظروں سے دیکھتے ہوئے اندر آ گئے رجو ان دونوں کو کھانا دے آئی۔

"بی بی عجیب سے لوگ لگتے ہیں دونوں چپ ڈرے ڈرے سے جیسے بھاگ کر آئے ہوں اور بی بی مجھے تو لڑکی بالکل پورے دنوں سے لگ رہی ہیں۔" وہ سرگوشی کے سے انداز سے کہہ رہی تھی۔

میرا دل انوکھی سی لے پر دھڑکا۔

"اچھا کل کسی ڈاکٹر کو بلوا کر چیک کروا دیں گے ابھی صاحب کے سامنے زیادہ ذکر مت کرو۔" میں نے اسے ٹوکا۔

☆

"نہیں بیگم صاحب آپ کی مہربانی کسی ڈاکٹر کو نہ بلوائیں یہ ہمارے ہاں بے پردگی سمجھا جاتا ہے بس ایسے ہی اللہ اپنا کرم کر دے گا۔" اگلے روز میں نے اور رجو نے جا کر ڈاکٹر کا ذکر ہی کیا تو دونوں بدک سے گئے۔

لڑکی کی آنکھیں وحشی غزال سی تھیں بڑی بڑی خوب پھیلی ہوئیں اس کے چہرے کی ساری خوب صورتی سب سے بڑا عنوان اس کی یہ پھیلی پھیلی سرمئی آنکھیں تھیں رنگت اس کی گندمی سے کچھ صاف تھی جسم بالکل دھان پان سا تھا ہاتھوں کی نیلی نیلی رگیں ابھری ہوئی تھیں جو صاف اچھی غذا کی کمی کا بتا رہی تھیں۔

"تمہارے ماں باپ کہاں ہیں۔" وہ شخص جس کا نام رحیم تھا ہمیں ڈاکٹر کو بلانے سے منع کر کے اپنی جاب پر چلا گیا اس نے رات ہی جواد کو زبردستی تین ہزار روپے

اس کمرے کا کرایہ دیا تھا جسے جواد کسی صورت لینا نہیں چاہ رہے تھے اصل میں تو ان کا ارادہ انہیں یہاں رکھنے کا تھا ہی نہیں کرایہ پکڑ کر وہ پابند نہیں ہونا چاہتے تھے مگر اس شخص کی منت زاری میں کچھ ایسی زبردستی تھی کہ جواد بھی ہار گئے اور روپے تھامنے پر مجبور ہو گئے۔

"" وہ ٹھیک ہیں جی۔" وہ دھیرے سے بولی اور سر جھکا لیا۔

"کیا فوت ہو گئے۔" رجو منہ پھٹ تھی اس نے جواب دینے کی بجائے فقط سر ہلا دیا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟" وہ ابھی بھی اپنا پورا جسم چادر میں لپیٹے ہوئے تھی۔

"غزالہ۔" اس کی آواز اور بھی پست ہو چکی تھی۔

"اچھا غزالہ دیکھو تمہیں اس وقت چیک اپ کی ضرورت ہے تمہارا شوہر تو مرد ہے اسے کیا پروا کہ عورت پر اس حال میں کیا گزرتی ہے ساری اذیت تو اس کا بدن سہتا ہے تمہیں خود اپنا خیال ہونا چاہیے کتنا عرصہ ہو گیا شادی کو۔"

"س..... سال ہو گیا ہے۔" وہ عجیب ڈری ڈری سی تھی۔

"جی او لوگوں کے رسم و رواج سخت ہوتے ہیں ڈاکٹروں کے چکر میں نہیں پڑتے آپ کہیں تو میں بتول دائی کو لے آؤں ایمان سے اس کے ہاتھوں میں تو سمجھیں شفا ہی شفا ہے ایک بار دیکھ لے گی تو بالکل صحیح دن ٹیم بتا دے گی۔" رجو جانچتی نظروں سے غزالہ کا جائزہ لیتے ہوئے کہنے لگی۔

"نہیں جی ..... رحیم نہیں مانیں گے ان سے پوچھ لیں۔" اس کی سانسیں ہموار نہیں تھیں اور میرا دل کر رہا تھا میں اس کے پاس سے اٹھوں ہی نہیں مگر وہ شاید ہماری موجودگی میں بے آرام ہو رہی تھی اس لیے میں اٹھ کھڑی ہوئی۔

"تم نے تو روزہ نہیں رکھا نا۔" میرے پوچھنے پر اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"میں تمہارے لیے کچھ پھل بھجواتی ہوں کھا لینا۔"

وہ ہمارے دروازے سے نکلنے کا انتظار کیے بغیر ہی لیٹ گئی مجھے اس کی حالت پر بڑا ترس آیا۔

دن ایک ایک کر کے گزرتے چلے گئے جواد نے ان سے کہہ دیا تھا کہ وہ اسی مہینے اپنا کوئی اور ٹھکانہ دیکھ لیں انہیں بھی یہاں مرمت وغیرہ کروانی ہے وہ جواب میں چپ رہے تھے۔

بڑے عجیب سے روز گزر رہے تھے سحری میں اٹھتی تو مجھے غزالہ کی فکر ہوتی مگر جواد

کی وجہ سے ان کی طرف نہیں جاتی تھی جواد ہی کو آواز دے کر اس کی اور رحیم کی سحری پکڑا دیتے اور صبح جب جواد اور رحیم گھر سے نکل جاتے تو میں فوراً غزالہ کی طرف آ جاتی

وہ مجھے پہلے دن کی طرح ڈری سہمی خوفزدہ سی ملتی مجھے کئی بار شک ہوا کہ دونوں گھر سے بھاگے ہوئے ہیں مگر کبھی زبان پہ یہ بات لا کر نہ پوچھ سکی میں اسے بار بار بلانے بات کرنے پر اکساتی وہ تھوڑا تھوڑا مجھ سے کھلنے لگی تھی۔

"جی ہم دونوں نے پسند کی شادی کی ہے میں ان کی خالہ کی بیٹی ہوں میرے ماں باپ ہیں نہ ان کے، ان کے بھائی اس شادی کے حق میں نہیں تھے ہم دونوں نے ان کی مرضی کے بغیر دو چار لوگوں کی موجودگی میں نکاح کر لیا تو وہ ہم دونوں کے خون کے پیاسے ہو گئے جھگڑا اسی موروثی جائیداد کا ہے جو ان کے ماں باپ چھوڑ گئے ہیں اگرچہ رحیم نے انہیں لکھ کر بھی دے دیا

کہ انہیں حصہ نہیں چاہیے مگر پھر بھی..... بس ان سے بچنے کے لیے ہم ادھر آ گئے پہلے دور کے رشتے داروں کی طرف رہتے تھے پھر شاید انہیں بھنک مل گئی تو ہمیں مجبوراً وہاں سے نکلنا پڑا میں اس حال میں نہ ہوتی تو ...... باجی ایسی خوف بھری زندگی ہے کہ...... موت، موت اچھی لگتی ہے۔ میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"بے وقوف ایسے نہیں کہتے اللہ خیر کا وقت لائے۔ یہ مشکل دن بھی گزر جائیں گے۔" میں نے اسے تسلی دی۔

جواد کو یہ سب بتایا تو وہ اور بھی خلاف ہو گئے۔

"پھر تو ان کا یہاں رہنا خطرے سے خالی نہیں وہ ان کی بو سونگھتے ہوئے یہاں آ گئے تو...... بس اب ان کو یہاں سے چلتا کرو صبح ہی بندوبست کرتا ہوں ان کا کسی ڈیلر سے کہہ کر کہیں اور کرائے پر گھر دلوا دیتا ہوں ہماری جان تو چھوڑیں۔" مگر اللہ کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

رات جو غزالہ کی حالت بگڑ گئی اسے زبردستی گاڑی میں ڈال کر ہسپتال لے جانا پڑا کیس انتہائی پیچیدہ تھا۔

ہماری دعاؤں رحیم کے آنسوؤں اور ڈاکٹروں کی مہارت تھی یا اللہ کی رحمت، سحری کی آواز کے ساتھ ہی غزالہ نے ایک کمزور مگر خوب صورت بیٹے کو جنم دیا خود اگرچہ اس کی حالت اچھی نہیں تھی مگر وہ زندہ بچ گئی تھی ہم سب کے لیے یہی کافی تھا۔

دوسرے ہی دن رحیم نے زبردستی اسے ڈسچارج کروانے کے لیے کہنا شروع کر دیا ڈاکٹرز نے ایک ہفتہ تک اسے ہسپتال میں رکھنے کو کہا بچہ نرسری میں تھا اسے آج شام ہمارے حوالے کیا جانا تھا ہم نے جلدی جلدی روزہ افطار کیا اور اسپتال آ گئے۔

روم کا دروازہ بند تھا ہم نے دھکیلا تو کھل گیا۔

بے بی کاٹ میں بچہ پڑا ہاتھ پاؤں چلا رہا تھا جبکہ غزالہ کا بیڈ خالی تھا ہم سمجھے شاید وہ واش روم ہوگی میں بے بی کاٹ پر جھک کر بچے کو پیار کرنے لگی۔

''ارے یہ کیا۔'' اس کے کمبل میں کچھ کھڑکھڑایا تھا۔سفید رنگ کا کاغذ تھا میں نے کھولا۔

''اری..... سلام جب آپ لوگ اسپتال آئیں گے تو ہم دونوں یہاں سے جا چکے ہوں گے کہاں؟ آپ سوچ نہیں سکتے تھے جواد بھائی ٹھیک کہتے تھے کہ ہم دونوں کا آپ کے گھر رہنا ان کے لیے بھی خطرناک ہوسکتا ہے اور اس میں کچھ غلط بھی نہیں تھا ہم دونوں کا تعلق سندھ کے اس پسماندہ علاقے سے ہے جہاں ابھی تک اس صدی کی تازہ ہوا نہیں پہنچی آپ لوگوں کا خیال درست تھا ہم دونوں نے گھر سے بھاگ کر شادی کی تھی ہم دونوں کا تعلق ایک دوسرے کے دشمن قبائل سے تھا ہماری جانوں کے دشمن میرے بھائی نہیں بلکہ ہم دونوں کے ماں باپ اور خاندان والے ہو رہے ہیں ہم دونوں کو کاری قرار دیا جا چکا ہے۔

اس مہینے کا عرصہ ہم دونوں نے کس طرح چھپ چھپ کر گزارا چاہیں بھی تو نہیں بتا سکتے زندگی کے دن ہم پر تنگ ہوتے چلے جا رہے ہیں ہم اپنی زندگی کی حفاظت نہیں کر سکتے تو اس ننھی جان کو کہاں سنبھال لیں گے ہم مر بھی گئے تو ہماری روحیں پرسکون رہیں گی کہ ہمارا بیٹا محفوظ و مامون ہے آپ دونوں کی محبت بھری چھاؤں میں۔

یہ ہمارا خیال بھی ہوسکتا ہے شاید آپ لوگ اس بچے کو ہمارے گناہ کا پھل سمجھ کر اپنے گھر میں رکھنا نہ پسند کریں تو اسے کسی بھی لاوارث بچوں کے سینٹر میں بھجوا دیں یہ زندہ رہے ہمیں اس کے سوا اور کچھ نہیں چاہیے اگر آپ اسے کسی سینٹر میں جمع کروائیں تو اللہ کے لیے سارے کوائف اپنے پاس محفوظ رکھیں اگر ہم زندہ بچ گئے تو شاید کبھی اسے ڈھونڈتے ..... آ جائیں یہ ہماری پاک محبت کی پاک نشانی ہے میں اسے جب بھی یاد کروں گا طیب کے نام سے یاد کروں گا اگر آپ اسے اپنے پاس رکھنا چاہیں تو میں ابھی ادھر دوسرے کاغذ پر بچہ آپ کو دینے کے لیے اپنے اور غزالہ کے دستخط کے ساتھ تحریر لکھ کر جا رہا ہوں کہ ہم دونوں یہ

بچہ آپ کو اپنی خوشی اور مرضی سے آپ کی نیک فطرت کو تحفہ کرتے ہیں خاص طور پر ادی بشریٰ جن کے دل میں اللہ نے محبت کے سوا اور کچھ نہیں بھرا......

شاید آپ کو چند دنوں بعد ہم دونوں کے مرنے کی خبر اخبار یا کسی چینل پر ملے یا اگر اللہ کو ہماری زندگی منظور ہوئی..... آپ نے طیب کو اپنا لیا ہم زندگی کے کسی موڑ پر ملے بھی تو اجنبی بن کر گزر جائیں گے کوئی دعویٰ نہیں کریں گے۔

اللہ حافظ رحیم اور غزالہ۔''

ہم دونوں حیران نظروں سے کبھی اس کاغذ کی تحریر دیکھتے اور کبھی کاٹ میں لیٹے ہاتھ پاؤں مارتے محبت کی اس طیب نشانی جو علی الاعلان کہہ رہا تھا کہ اللہ ابھی انسانوں سے مایوس نہیں ہوا۔

میں سوالیہ نظروں سے جواد کی طرف دیکھ رہی تھی اب کے میں خود سے کوئی بھی فیصلہ نہیں کرنا چاہ رہی تھی کہ یہ کسی کو پناہ دینے کا معاملہ نہیں تھا عمر بھر کے لیے اپنی زندگی کے ساتھ منسلک کرنے کا تھا۔

''میں تمہیں کہتا تھا نا تمہیں انسانوں کی پہچان نہیں دیکھا وہ وہی نکلے جو میں سمجھتا تھا۔'' جواد بول رہے تھے اور میری آنکھوں میں اترتی دھند میں بے بی کاٹ دھندلاتا جا رہا تھا۔

''مگر اس کے باوجود اللہ کو تمہاری سادگی اور نیک فطرت پر اس درجہ پیار آیا کہ اس نے تمہارے دل کی آرزو کو زندہ وجود دے کر تمہاری جھولی میں ڈال دیا ہے ہم ان دونوں کی زندگی کی دعا بھی کریں گے اور جب کہیں وہ ملے تو..... تمہیں خوشی نہیں ہوئی کہ اللہ نے ہماری زندگی میں جو ایک کمی تھی وہ بھی دور کر دی۔''

وہ کہہ رہے تھے اور میری نظروں کے سامنے سے دھند ہٹ رہی تھی وہ ننھا وجود اب ہاتھ پاؤں چلانے کے ساتھ زور زور سے رونے بھی لگا تھا۔

جواد نے ہاتھ بڑھا کر اسے اٹھایا اور سینے سے لگا کر پیار کیا تو میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے، پتا نہیں اس نعمت کے شکرانے کے طور پر یا ان دو اجنبی مسافروں کا سوچ کر جو نا جانے کدھر سے آئے تھے کدھر چلے گئے ہمیں یہ بیش قیمت تحفہ دے کر..... میں جواد کے کندھے پر سر رکھ کر رونے لگی جواد طیب کے ساتھ میرا کندھا بھی تھپکے جا رہے تھے اتنے مبارک مہینے کا یہ متبرک تحفہ مجھے بے حال کیے جا رہا تھا۔

❁

پہلی سی محبت

صبح کا تارہ پوری شدت سے جگر جگر کرتے ہوئے اپنا وجود قائم رکھنے کی کوشش میں افق کے پار گم ہوا جا رہا تھا اور رات کی سیاہیاں صبح صادق کی سفیدیوں میں گھل گھل کر مٹ رہی تھیں۔ ایک لمبی سیاہ رات کا خوشگوار اختتام سنہری دن کی شکل میں ہونے جا رہا تھا اور ایک مسافر کی لمبی مسافت اپنے انجام بخیر کو پہنچی تھی۔

میں سامان کی ٹرالی گھسیٹتا علامہ اقبال انٹرنیشنل ایئر پورٹ کے لاؤنج سے باہر نکلا تو ایک خوشگوار صبح بانہیں پھیلائے مجھ سے معانقہ کرنے کو تیار تھی کہ فی الحال اس وقت میں سوائے اس خوشگوار صبح کے اور کسی سے معانقہ نہیں کرسکتا تھا۔ سرپرائز دینے کا ایک ہی نقصان لمبی مسافت طے کر کے آنے والے کے لیے کافی نہیں بہت بڑا ہوتا ہے کہ سفر کے اختتام پر کوئی اپنا پُرجوش اپنائیت لیے بانہیں پھیلائے آپ کو اپنے استقبال کو نہ ملے اور اس نقصان کو میں نے خود اپنے لیے منتخب کیا تھا سو ملال بھی کم تھا۔

اور سچی بات ہے ملال یوں بھی کم تھا کہ ایئر پورٹ کے کمپاؤنڈ سے باہر آتے ہوئے مجھے اس نقصان پر خواہ مخواہ نفع مل جانے کا خوشگوار سا احساس ہوا تھا۔ ایک بالکل دھلی دھلائی نکھری خوشگوار بھینی خوشبو والی پُر کثافت و آلودگی سے پاک فضا سے ملنے کا سرپرائزنگ نفع بخش احساس!

ورنہ اس وقت آ کر مجھے سب اپنے لینے کے لیے آئے ہوتے تو اس وقت ان سے گلے ملنے، چھیاں ڈالنے، ہاتھ ملانے کیسے ہو، کیسے ہیں؟ کے مکرر سوال کے بیچ اس کنواری، نئی نویلی، سج دھج والی صبح سے ملنے کا کہاں موقع ملنا تھا۔

ٹیکسی پر سامان رکھواتے اور بیٹھنے تک میں پوری طرح اپنے پیارے وطن کی اس پیاری صبح کی نیم خنک، خوشبو دار اٹھکھیلیاں کرتی بادنسیم کے عشق میں گرفتار ہو چکا تھا۔ یہ دیکھے بغیر کہ ٹیکسی ڈرائیور کس رشک بھرے انداز میں مجھے دیکھ رہا ہے اور منور بھائی کی اس تاکید کے باوجود میں ذہنی طور پر بالکل الرٹ نہیں تھا کہ آج کل لاہور شہر چوریوں، ڈکیتیوں کے حوالے سے زندہ دلان لاہور نہیں بلکہ زندہ دلان چوروں کا من پسند جنگل بن چکا ہے۔

میں کھڑکی سے کسی دیہاتی کی طرح پوری گردن نکالے اپنے دیس کی بانکی البیلی صبح کی سانسوں کو اپنی سانسوں میں سمونے کی کوشش کر رہا تھا۔

''کتنے عرصے بعد پاکستان آئے ہیں؟'' میری اس بچکانہ بے صبری حرکت کو دیکھتے ہوئے ٹیکسی ڈرائیور نے قیاس کیا ہوگا کہ میں شاید زمانوں بعد ادھر لوٹا ہوں۔

''ڈھائی سال بعد۔'' میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے ٹھنڈی معطر ہوا سے بڑا سا گھونٹ بھرا اور ذرا سا سر اندر کرتے ہوئے اطمینان سے جواب دیا ٹیکسی ڈرائیور لمحہ بھر کو حیران ہوا اور پھر ڈرائیونگ کرنے لگا۔ ابھی سفیدی پوری طرح پھیل کر روشنی میں نہ ڈھلی تھی۔ اس لیے سڑکیں بالکل صاف شفاف کسی بھی انسانی بھاگ دوڑ سے پاک بڑے آرام سے ایک ہی کروٹ کے بل لیٹی تھیں اور ٹیکسی گویا بغیر چپو کی کشتی کی مانند ان پر تیرتی چلی جا رہی تھی۔

میں باہر کے نظاروں میں مگن تھا اور ڈرائیور جمائیاں لیتے ہوئے مندی مندی آنکھوں سے ڈرائیونگ میں، دو ایک بار مجھے خیال آیا اسے ٹوکوں، بھائی ذرا دس منٹ کو اس نیند سے رخصت لے لو ورنہ مجھے اپنے گھر والوں سے ملے بغیر اس جہاں سے رخصت کرا دو گے پھر سوچا جیسے چل رہا ہے چلنے دو، وہ مجھے اکیلا تو رخصت نہیں کرائے گا خود اپنا بھی ٹکٹ کٹوانا پڑے گا۔

ٹیکسی فراٹے سے کینٹ کی سیاہ چمکیلی سڑکیں روندتی مال روڈ کی طرف رواں تھی۔ خوبصورت سماں، خوبصورت ماحول اور پُرفضا مناظر انسان کی طبیعت پر کیسے خوشگوار اثرات مرتب کرتے رہیں کہ میں ایک لمبے سفر کی تھکان تک بھول گیا۔

''اور سناؤ یار! کیسی چل رہی ہے آج کل ادھر۔'' طبیعت بشاش ہوئی تو میں نے یونہی بات کرنے کو ڈرائیور سے پوچھا۔

''آپ امریکہ سے آرہے ہیں نا!'' وہ مرر میں مجھے دیکھتے ہوئے سرخ ڈوروں والی نیند سے بوجھل آنکھوں کے ساتھ تکتے ہوئے الٹا پوچھنے لگا۔

''ہاں نیویارک سے۔تو؟''

''وہاں تو ہمارے بارے میں ہم سے زیادہ خبریں ہوتی ہیں۔ الٹا ہمیں ان سے پوچھنا چاہیے۔ انکل سام آج کل ہمارے ملک میں کیا چل رہا ہے، وہ زیادہ مفصل جواب دیں گے۔'' ایک معمولی ٹیکسی ڈرائیور کے منہ سے ایسی ہوش مندی کی بات کی مجھے توقع نہیں تھی۔

''اجی ہم تو وہ بدنصیب قوم ہیں جس کا وجود تو ادھر اس ملک میں چل پھر رہا ہوتا ہے اور سانسوں کا ریموٹ واشنگٹن اور نیویارک کے قبضے میں ہوتا ہے۔ دفع کریں جی! کیا کرنا ہے اس موضوع کو صبح صبح نور کے تڑکے چھیڑ کر۔ جی جلانے والی بات۔'' اس نے کہتے کہتے ایک ہاتھ اسٹیرنگ سے اٹھا کر ہوا میں چلایا اور زیادہ تن دہی سے گاڑی چلانے لگا۔

''مہنگائی تو ادھر آج کل زوروں پر ہے۔تم سناؤ تمہارا گزارا ٹھیک ٹھاک ہو جاتا ہے؟'' میرے منہ سے غیر اختیاری سا سوال نکلا اور سوال کرنے کے بعد اس کی کٹیلی نگاہوں سے مجھے احساس ہوا کہ یہ سوال تو پہلے سے بھی زیادہ تکلیف دہ اور جلا کٹا ہے۔

''رب سوہنے کا احسان ہے۔ ہماری محنت کی کمائی میں وہ برکت ڈال دیتا ہے۔ چار کی جگہ دو روٹیاں کھا کر پیٹ بھرا بھرا سا محسوس ہونے لگتا ہے نہ بھی ہو تو خود کو محسوس کروانے کی کوشش میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو یہ اس کا احسان ہی ہوا نا۔ ہاتھ پیر سلامت ہیں۔ محنت کر رہے ہیں نہ چوری کرتے ہیں نہ ڈاکا ڈالتے ہیں نہ ایسا کبھی کوئی شیطانی خیال دماغ میں آیا سو رات کو دو تین گھنٹے ہی سہی سکون کی میٹھی نیند سوتے ہیں۔ شکر ہے اس کا۔'' ٹیکسی ڈرائیور کا انداز عجیب بے نیازانہ سا تھا۔

''کبھی باہر جانے کا خیال نہیں آیا؟'' گاڑی اب جی پی او کی پُر شکوہ عمارت کے پہلو سے گزرتی ہوئی جین مندر کی طرف بڑھ رہی تھی۔ بائیں طرف ہائی کورٹ کی عمارت کی پیشانی پر بنا ترازو بے بسی سے سڑک پر گزرنے والوں کا دن بھر منہ تکا کرتا تھا۔ میں بھی بس لمحہ بھر کو اس کی طرف دیکھ سکا۔

''پہلے آتا تھا۔ اب نہیں۔'' اس نے سر جھٹک کر کہا۔

''اب کیوں نہیں۔'' میں نے قدرے دلچسپی سے پوچھا۔

''اب جو پاکستانی ساری دنیا میں ننگے ہو گئے ہیں۔ اپنی ہی حکومت نے دہشت گردوں کے نام پر پکڑ پکڑ کر معصوم لوگوں کو ان کے حوالے کر کے ان کی ہمدردیاں لینے کے بجائے ان کی عمر بھر کی دشمنی خریدی ہے۔ اس کے بدلے جو سلوک پاکستانیوں کے ساتھ

دوسرے ملکوں کی حدود میں داخل ہونے پر ہوتا ہے۔ اسے دیکھ کر تو جی کانوں کو ہاتھ لگاتے ہیں۔ سو بار اللہ توبہ کرتے ہیں۔ ادھر کی روکھی سوکھی وارے میں ہے۔ ہم ایسے ڈالروں اور پونڈوں سے باز آئے جن کے بدلے کپڑے اتار کر ننگ دھڑنگ پر تلاشی دینی پڑے۔ عزت آبرو کے ساتھ اپنے ملک میں سر اٹھا کر چلتے ہیں۔ کوئی انگلی اٹھائے تو سینہ تان لیتے ہیں۔ آدمی کو جینے کے لیے ڈالروں سے زیادہ عزت نفس کی ضرورت ہوتی ہے، وہ اللہ کا شکر ہے بہت نہ سہی، تھوڑی بہت ادھر مل ہی جاتی ہے۔ باہر کے لالچ میں اسے بھی گنوا دیں۔'' وہ مجھے ٹیکسی ڈرائیور کم کوئی دانش ور زیادہ لگ رہا تھا۔ اس کی سچی باتوں نے مجھے چپ کرا دیا۔

سامنے چوبرجی کے چار مینار بڑی شان سے سر اٹھائے کھڑے تھے۔ صرف ان کے سر ہی اٹھے تھے ورنہ کہن سالی اور خستہ حالی نے جوان کا رنگ روپ اڑا رکھا تھا۔ ذرا جو سر جھکا کر خود کو دیکھ لیتے تو شاید اپنے ہی قدموں پر ملبے کے ڈھیر کی صورت پڑے ہوتے۔ یوں بھی ملبے کو ملبہ بنانے میں دیر کتنی لگتی ہے، ان خوبصورت تاریخی میناروں کو یوں اجڑی پجڑی بے رنگ سی حالت میں ندامت سے سر اٹھائے دیکھ کر مجھے حقیقتاً دکھ ہوا۔ میرے بچپن کے دنوں میں ان کی ایسی خستہ حالت ہرگز نہ تھی۔ میرے بچپن کی یادوں میں ان کا خوبصورت تصور موجود تھا۔ میں اسی تصوراتی نقشے کو سوچنے لگا۔

راؤنڈ اباؤٹ کے گرد گھوم کر ٹیکسی اب راج گڑھ کی گلیوں کا رخ کر چکی تھی۔ میرا دل زور سے دھڑکا۔ منزل اب دو گام ہی تو رہ گئی تھی۔

صبح سویرے کی سرگرمیاں ابھی پوری طرح سے متحرک نہیں ہوئی تھیں۔ دکانیں بند تھیں اور ان کے شٹر گرے دروازوں کے آگے کہیں کہیں کوئی مزدور منہ سر لپیٹے سو رہا تھا اور کہیں کوئی کتا اونگھ رہا تھا۔ بھولی بلیاں میاؤں میاؤں کرتی گلیوں کے اور دکانوں کے تھڑوں کے نیچے سے آ جا رہی تھیں۔

''بس یہاں سے دائیں طرف موڑ لو۔'' میرے گھر کی گلی آ گئی تھی۔ میں نے ذرا پُر جوش سا ہو کر سیٹ پر آگے کھسکتے ہوئے ڈرائیور سے کہا۔ اگلے لمحے گاڑی سرکتی ہوئی اس گھرے بھورے تھوڑا رنگ اڑے لکڑی کے دروازے کے آگے رک گئی تھی۔

میں نے نیچے اتر کر سامان اتروایا۔ ٹیکسی والے کو کرایہ دے کر دروازے کی بغل میں گھنٹی کے بٹن کو دبا دیا۔

''بھاجی! یہ پچاس روپے زائد دے دیے آپ نے۔'' ٹیکسی والا جاتے جاتے رکا۔

''یار! ایئر پورٹ پر کوئی اپنا نہیں ملا۔ تم اپنے ملے تو دیکھ کر خوشی ہوئی پھر تمہارے ساتھ سفر بھی اچھا کٹا۔ بچوں کے لیے شام کو کوئی میٹھی چیز لے جانا کہنا۔ ان کے چاچے نے بھیجی ہے اور یہ بھی۔''

میرے کوٹ کی جیب میں چاکلیٹ کا بڑا پیک بند ہی پڑا تھا سوچا تھا راستے میں کھاؤں گا۔ اس کی نوبت نہیں آئی، وہ پیکٹ پکڑتے ہوئے متذبذب سا ہوا۔ میں نے اصرار کیا تو شکریہ ادا کرتے ہوئے ٹیکسی میں بیٹھ کر چلا گیا۔

میں ایک معمولی سے ٹیکسی ڈرائیور پر اتنا مہربان کیوں ہوا۔ مجھے خود پر حیرت سی ہوئی، واقعی کوئی اپنا نہ ملے تو اپنے وطن سے تعلق رکھنے والا کوئی بھی شخص ملے، وہ اپنا ہی لگتا ہے۔

''بھا منور تو صبح سویرے اٹھ کر موڑ کے تھڑے پر بیٹھ کر مسواک کرنے کے عادی ہیں۔ آج وہ بھی نظر نہیں آ رہے۔'' میں نے ویران پڑی گلی کو قدرے تشویش سے دیکھا۔ اب تو اچھا خاصا دن نکل رہا تھا پھر...... میں نے تیسری بار گھنٹی کا بٹن دبایا۔

''کمال ہے، گھوڑے بیچ کر سوئے ہیں سب......'' اب کے میں خاصا جھلایا تھا۔

''کون ہے پاگل، سویرے سویرے گھنٹیاں بجائے جا رہا ہے۔'' فریدہ کڑکڑاتی، سلیپر گھسیٹتی حسب عادت بدمزاجی سے بولتے ہوئے باہر نکلی تھی۔

اب اگر میں جواب میں ''مَیں'' کہہ دیتا تو اس نے اونچا اونچا بولنا شروع ہو جانا تھا۔ ''کیا بکری کی طرح میں میں لگا رکھی ہے۔ سیدھی طرح اپنا نام بتاؤ۔''

''بھئی۔ کھولو دروازہ۔ حد ہو گئی۔ اتنی دیر سے بیل بجا رہا ہوں۔ مدثر ہوں میں۔'' بکری کہلوانے کے ڈر سے میں نے فوراً اپنا تعارف کرا ڈالا تھا۔

''ہائے اللہ جی!'' دروازہ تو وہ کھول ہی چکی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کے منہ سے فوری طور پر یہی نکل سکا۔ بے یقین سی نظروں سے مجھے تکے جا رہی تھی۔ ''آپ تُسی...... توبہ حد ہو گئی اطلاع تو دیتے، سویرے سویرے کوئی لینے آ جاتا۔'' خوشی سے منہ سے الفاظ نہیں نکل رہے تھے۔

''نہ سلام نہ دعا ہائے اللہ جی۔ تسی کم دیکھا کرو پنجابی فلمیں۔''

میں اس کی خوشی سے محظوظ ہوتے ہوئے آگے بڑھا اور ہولے سے اس کی کلائی مروڑ دی۔ وہ ایک بار پھر ''ہائے اللہ جی'' کہہ کر تھوڑا پیچھے ہو گئی۔ اس کی اسی کیفیت سے انجوائے کرنے کے لیے میں نے یہ سرپرائز دیا تھا۔

سامان اندر رکھ کر دروازہ بند کر کے میں اس کے پیچھے چلتے ہوئے صحن میں آ گیا۔

صحن کی شمالی دیوار کے ساتھ لگے نیم کے درخت کے پتے خوب ہرے بھرے ہو رہے تھے اور ان پر بیٹھی چڑیوں نے خوب شور مچا رکھا تھا۔

''تین دن پہلے تو بات ہوئی تھی آپ نے ذکر ہی نہیں کیا۔ آج میرا ارادہ تھا آپ کو فون کرنے کا۔ اچانک پروگرام کیسے بن گیا؟'' وہ ابھی بھی خوشی اور حیرت کے بیچ ڈول رہی تھی۔

''بس دیکھ لو۔ تم لوگوں کی یاد آئی تو دوڑا چلا آیا۔''

میں اسی نیم کے درخت کے نیچے پڑی جھلنگا چارپائی پر ترچھا ہو کر نیم دراز سا ہو گیا۔ فریدہ محجوب سی میرے پاس بیٹھ کر نیچے جھکی اور میرے جوتے اتارنے لگی۔

''رہنے دو، میں خود ابھی اتار لیتا ہوں۔'' میں نے سیدھا ہونا چاہا تو اس نے دوسرا ہاتھ میرے پہلو پر رکھ دیا۔ میرے پورے بدن میں لطیف سی سنسنی دوڑ گئی وہی ناسمجھ میں آنے والا سکون جو مجھے پردیس سے آنے کے بعد گھر میں داخل ہو کر فریدہ کے پہلے لمس سے محسوس ہوا کرتا تھا۔ میں نے بے اختیار آنکھیں میچ لیں۔

''بچے سو رہے ہیں ابھی تک؟'' میں نے اسی طرح بند آنکھوں کے ساتھ پوچھا۔

''ہاں، ابھی ٹائم کیا ہوا ہے؟'' وہ اب اپنے نرم ہاتھوں سے میرے پیروں کو جرابوں کی قید سے نکال کر رہی تھی۔ اس نے ہاتھ لگایا تو میرے پیروں نے اپنی تھکن کا برملا اظہار کر ڈالا۔ وہ ان ہی ہاتھوں سے میرے پیروں کو ہلکا ہلکا دبانے لگی۔

''بس کرو...... کیا مجھے یہیں سُلا دو گی۔ پہلے بچوں سے مل لوں، یہ لوگ نماز نہیں پڑھتے کیا؟'' بچوں کو دیکھنے کے خیال سے میں ایک دم اٹھا اور کھڑا ہو گیا۔

''کسی کسی دن زبردستی کروں تو پڑھ لیتے ہیں ورنہ......''

''آج تم نے خود بھی نہیں پڑھی ہو گی۔'' میں نے مڑ کر شکایتی لہجے میں کہا تو وہ کھل کر مسکرا دی، اور زور زور سے بچوں کو پکارنے لگی۔

''گڈو کے پیپرز شروع ہو گئے؟''

''نہیں۔ اگلے ہفتے پہلا پرچا ہے۔ رات کو دیر تک پڑھتا رہتا ہے، اس لیے صبح دیر سے اٹھتا ہے۔'' بچے میری آمد کا سنتے ہی ہڑبڑا کر اٹھ چکے تھے اور اب دائیں بائیں آگے پیچھے سے مجھ سے لپٹے جا رہے تھے۔

''میری گڑیا اتنی بڑی ہو گئی۔'' میں واقعی صدف کو دیکھ کر حیران سا رہ گیا تھا۔ ڈھائی سال پہلے جب میں آیا تھا تو وہ میری کمر تک آتی تھی اور اب جیسے گڈو کے برابر ہوئی

جا رہی تھی اور ٹیپو بھی ان کے ساتھ کھڑا ان کے برابر کا لگ رہا تھا، صرف نوال ابھی بھی کچھ کم سن سی تھی۔

"بیٹیاں تو اسی طرح بڑی ہوتی ہیں۔ ابھی دیکھو تو گڑیا سے کھیلتی اور ابھی دیکھو تو......" فریدہ نے ماؤں کے روایتی فکر مند لہجے میں کہا اور میں ہنس پڑا۔

"اور میں اپنی گڑیا کے لیے ابھی بھی باربی ڈول ہی لایا ہوں۔" وہ مجھے گڑیا سے کھیلنے کے لیے خاصی بڑی لگ رہی تھی۔

"اور ابو! میرے لیے؟" ٹیپو فوراً اپنا چہرہ میرے سامنے کرتے ہوئے بولا تو میں نے بے اختیار جیسے اپنے ہی عکس کی پیشانی پر لب رکھ دیے۔ ٹیپو تو بالکل مجھ جیسا لگ رہا تھا۔

"سب کے لیے سب کچھ لائے ہوں گے ابو، پہلے انہیں سانس تو لینے دو۔ ناشتا بناؤں آپ کے لیے یا بازار سے منگواؤں؟"

فریدہ محبت بھرے لہجے میں پوچھ رہی تھی۔ اس نے کیسا گھسا ہوا ملگجا سالان کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ عجیب جوگیا سے رنگ کا اور بال جیسے کتنے دنوں سے بنائے ہی نہیں پھر بھی مجھے اس پر پیار آ رہا تھا۔ ان ہی صورتوں کو تو اس برفیلے علاقے میں سفید سفید برف جیسی پتھریلی صورتوں کو تکتے ہوئے ترس جایا کرتا تھا۔

"ابھی تھوڑی دیر آرام کروں گا پھر بھامنور اور منظور کو بھی بلا لو۔ ابھی تو وہ گھر پہ ہوں گے پھر کاموں پر نکل جائیں گے تو رات سے پہلے ملاقات نہیں ہو سکے گی۔"

میرے دونوں بھائیوں کے گھر بھی اسی گلی میں تھے اور میرا دل اپنے ماں جائیوں کو دیکھنے کے لیے بھی اتنا ہی بے چین تھا جتنا فریدہ اور بچوں کو دیکھنے کے لیے۔

"مل لیجیے گا۔ ابھی منڈلی منڈلی اٹھ کر آ جائے گی پھر تو آپ کے پاس ہمارے لیے گھڑیاں بھی نہیں ہوں گی۔ وہ دونوں دیر سے جاتے ہیں۔ آپ ناشتہ کر لیں پھر بلوا لوں گی۔"

فریدہ ایک دم سے چہرہ سخت کرتے ہوئے کوفت بھرے لہجے میں بولی۔ اسے یقیناً ان تین سوٹ کیسوں کو پچھلے کمرے میں رکھوانے کی جلدی ہوگی کہ دونوں بھائیوں اور ان کی بیویوں، بچوں کی ان پر نظر نہ پڑ جائے۔ اس معاملے میں فریدہ کسی سے بھی رعایت نہیں برتتی تھی کہ میرے حق حلال اور خون پسینے کی کمائی پر وہ خالصتاً اپنا اور اپنے بچوں کا حق سمجھتی تھی۔ اپنے دونوں بھائیوں اور ان کی بیویوں سے بھی "مال غنیمت" کو چھپایا کرتی تھی۔ یہ اس کی بچوں کی خوشی تھی تو میں اس کی خوشی میں کیوں رخنہ ڈالتا۔ یوں بھی اتنے

سالوں بعد تو ہم ملتے تھے۔ میں تو ایک پل کے لیے بھی اس کی خفگی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ یہ میرا ہی حال نہیں تھا۔ فریدہ بھی میری دل جوئی میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتی تھی۔ یہی سوچتا سوچتا میں غنودگی میں چلا گیا۔

☆

سارا دن ہی گہما گہمی میں گزرا ایک تو میری آمد بنا اطلاع تھی، دوسرے بھامنور کی افشاں کی شادی ان دنوں طے کرنے کا سوچا جا رہا تھا۔ میری آمد نے بھامنور کے جوش کو بڑھا دیا۔

"بس بھئی۔ شادی کی تاریخ اسی مہینے کے آخیر تک رکھ لو۔ مہینہ تو اپنا مدثر ادھر ہی ہے۔" لحیم شحیم سے بھامنور نے مجھے اپنی بغل میں لیتے ہوئے خوب اونچی آواز میں کہا۔

"ارے نہیں بھا! میں تو......" ان کی بغل کی گرفت میں میری پسلیاں تو کیا جھنجھنائیں، سانسیں بھی گڈمڈ ہو کر باہر نکلنے سے انکاری ہو گئیں۔

"میں تو کیا...... کتنے دنوں کے لیے آیا ہے؟" انہوں نے جھٹکے سے مجھے اپنی بغل سے پرے کیا۔

"صرف ایک ہفتے کے لیے۔" بھامنور اور دوسرے تو شاید مجھے بعد میں گھورتے، برآمدے سے گزرتی فریدہ نے یہ سنتے ہی سامنے سے گزرتی گڑیا کی کمر میں زور سے دھپ لگا دی۔

"پڑھو مرو اندر جا کر۔ سارا دن ادھر تو میلا لگا رہے گا نا۔ تم بھی دانت نکالتی ڈیلے پھاڑتی ادھر ٹکی رہو گی۔"

فریدہ کی آواز اور الفاظ دونوں ہی ایسے کاٹ دار تھے کہ صحن میں بیٹھی قہقہے لگاتی محفل کی ہنسی یک لخت تھم گئی۔

"چلو بھئی۔ کچھ دیر مدثر کو بھی آرام کر لینے دو۔ شام کو گپ ہوگی۔ زبیدہ کو فون کر دیا تُو نے مدثر؟" بھامنور سب سے سیانے تھے۔ اگلے کا چہرہ دیکھ کر اس کے ارادے بھانپ لیا کرتے تھے، انہوں نے اٹھتے ہوئے محفل برخاست کر دی۔

"ابھی کر دوں گا، ویسے میرا خیال تھا۔ میں کل یا پرسوں جا کر خود ہی مل آتا۔ پانچ چھ دن تو میں ہوں ادھر۔"

میں نے تھوڑا شرمندہ سے لہجے میں کہا۔ فریدہ کبھی کبھی حد ہی کر دیتی تھی۔ میں

کون سا روز یوں بھائیوں کی منڈلی سجا کر بیٹھا کرتا تھا۔ سالوں بعد تو ہی موقع ملتا تھا، وہ بھی نصیبوں کی بات؟ مجھے غصے کے ساتھ رنج سا بھی ہوا۔

''اوہو! ادھر ہی بلا لیتے ہیں۔ قصور کون سا دور ہے بلکہ بہن بھائی ذرا دو گھڑی بیٹھ جائیں گے۔ اب تو وہ بھی مہینوں نہیں آتی۔ شکیلہ تو چلو پردیس میں ہوئی۔ تم رہنے دو، میں جا کر اسے فون کر دیتا ہوں۔'' بھامنور بات ختم کرتے ہوئے اپنے بیٹے اور دونوں بیٹیوں کو آگے لگائے باہر نکل گئے۔ بھرجائی پہلے ہی جا چکی تھی۔

فریدہ اب کچن میں برتن کھڑکانے میں لگی ہوئی تھی۔ ان کھڑکتے برتنوں کا صاف مطلب مجھے اندر بلانا تھا۔ تھوڑا نخرا تھوڑی الفت جتانی ...... پر نہ جانے کیوں اس گھڑی میرے دل میں جیسے اداسی لہرا لہرا اتر کر اپنی جھیں جمانے لگی تھی۔

اسی ویہڑے میں بے بے اور ابا جی کبھی اس چارپائی پر بیٹھ کر ہم تینوں بھائیوں اور دونوں بہنوں کو اونچی اونچی آوازوں میں بلایا کرتے تھے اوپر والی منزل پر چاچا بشیر، ان کے چار بچے اور بیوی رہتی تھی۔ ابے سے تین سال چھوٹا تھا چاچا بشیر، زمانے بھر کا نکھٹو اور ناکارہ۔ سارا دن اوپر والی منزل پر برتن کھڑکتے یا لکا فضیحتی رہتی تھی۔ تیسری منزل پر ابے کا چاچا شریف اپنی بیوہ بیٹی اور اس کے تین بچوں کے ساتھ رہا کرتا تھا یعنی اس ساڑھے تین مرلے کے گھر میں اٹھارہ افراد رہا کرتے تھے اور اوپر چوبارے میں بے بے کا نشی بھائی، ماموں طفیل، فالتو کاٹھ کباڑ کے ساتھ دن رات منہ کھول کر ہاتھ پیر چھوڑے سویا رہتا تھا۔

ہمارے گھر کے دو کمرے، یہ مٹی کا صحن اور برآمدے میں کھلا باورچی خانہ خاندان کے اچھے گھروں میں شمار ہوتا تھا۔ اپنے بھائی کے برعکس ابا مکینک تھے۔ اپنی کوئی باقاعدہ دکان تو نہیں تھی۔ پر سارے علاقے کو معلوم تھا، یہ سراج دین بجلی کا بڑا اچھا مکینک ہے۔ اس وقت چونکہ بجلی کے اتنے آلات نہیں تھے۔ موٹریں اکادکا بلکہ نہ ہونے کے برابر تھیں۔ محلوں میں سرکاری پانی کی فراوانی تھی سو ابا کی کمائی تو زیادہ نہ ہوتی مگر پھر بھی ہمارا گزارا اچھا ہو ہی جاتا۔ محلے میں ہونے والی ایک آدھ شادی میں بتیاں لگانے کا کام مل جاتا تو چند دن کام کے بغیر بھی اچھے گزر جاتے۔

ہم سب ابا اور ابے کی کمائی کو ''یونہی'' سمجھا کرتے تھے۔ بے بے تو اکثر طعنے بھی دیا کرتی تھی۔

''جا جا کر دیکھ، لوگوں نے گھروں میں کیا ریل پیل لگا رکھی ہے۔ اوپر تیرا بھائی

بشیر ہی نہیں...... موسم کی پہلی سبزی، پہلا پھل خواہ کتنا مہنگا کیوں نہ ہو اس کے گھر آتا ہے اور ہم جب وہ پھل سبزی موسم کے درمیان میں ٹکے ٹکے سیر بک رہا ہوتا ہے، تب نصیب ہوتا ہے۔ تو ہمارے لیے کرتا کیا ہے۔ منورے کو بچ کرا کے اٹھالیا۔ یہ مدثر اور منظور رو رو کو پانچویں کرلیں تو انہیں بھی گھر بٹھا کر مکینکی سکھا دینا۔ یہیں تو منورے کی طرح بیٹھے منجیاں توڑا کریں گے۔ کوئی چار دن ہم بھی اچھے دیکھ لیں۔''

یہ شاید بے بے کا ناشکرا پن تھا کہ چار دن اچھے آتے اللہ نے ناراض ہو کر ان گئے گزرے موافق دونوں کو بھی ہمارے بیچ سے اٹھالیا۔

میں نویں میں تھا اور منظور ساتویں میں۔ بھامنور نے چاچا بشیر کی الفت سے خوب الفت بڑھانے کے بعد گھر میں تڑیاں دھمکیاں لگا کر ابے اور بے بے کو شادی پر راضی کرلیا تھا اگرچہ ابھی تک بھامنور نے کام کے نام پر کبھی تنکا دہرا نہیں کیا تھا۔ چاچا بشیر کے ''اچھا سوچتے ہیں۔'' کا جواب سن کر ابے نے بھامنور کو کسی دکان میں نوکر رکھوا دیا۔

پہلی تنخواہ آئی تو بقول اماں کے ''شریکوں کے منہ بند ہوگئے۔'' اور چاچے بشیر کو بغلیں جھانکتے ہوئے ہاں کرتے ہی بنی۔

الفت اوپری منزل سے نیچے آگئی اور ہمارا گھر جو پہلے ہی سکڑ سکڑ کر دو کمروں میں گزارا کر رہا تھا۔ ایک کمرے میں آگیا۔ ابا اور بے بے مستقل برآمدے میں منتقل ہوگئے۔ ان ہی دنوں ابا نے اپنے رشتے کی بہن کے گھر زبیدہ کا رشتہ طے کر دیا۔ تاریخ رکھی تھی کہ ایک گھر میں موٹر ٹھیک کرتے ہوئے ابے کو جو بجلی کا جھٹکا لگا۔ اس کا دوسرا سانس نہ نکلا اور ہمارے گھر سے وہ گنے گزرے دن بھی اٹھ گئے۔

زبیدہ کی شادی میں گھر کے بس دو چار تین بھانڈے بکنے سے رہ گئے اور جو قرض چڑھا وہ علیحدہ۔ ابے کی جدائی، معاشی ابتری اور گھر میں بڑھتی ہوئی الفت کی زور آوری نے بے بے کو مستقل چارپائی پر ڈال دیا۔ میں دسویں بھی مکمل نہ کرسکا اور منظور نے ساتویں بھی نہ کی۔ مجھے شروع سے ابے کے کام سے دلچسپی تھی اور میں بچپن سے اکثر ساتھ ہی جایا کرتا تھا۔ فیوز لگانا، پنکھا لٹکانا بلب ٹیوب لائٹ، موٹر فٹ کرنا۔ شادی بیاہ میں بتیاں لگانے کے لیے کنکشن کی تاریں کہاں جوڑنا ہیں۔ سب ابے کے سکھائے بغیر ہی سیکھ گیا تھا اور پتا بھی نہیں چلا۔ کب لوگ سراج دین کے دروازے پر آ کر مدثرے کی آوازیں لگانے لگے اور میں اپنا ٹول بکس وہ پیچ کسوں پلاس اور دوسرے اوزاروں کا تھیلا اٹھا کر ان کے ساتھ نکل پڑتا۔

بھا منور کی ہڈحرامی نے انہیں دو چار ماہ سے زیادہ پہلی نوکری پر ٹکنے نہیں دیا۔ وہ چار مہینے کام کرتا اور آٹھ مہینے گھر بیٹھ کر ماں اور بیوی کے معرکوں میں کبھی ایک فریق کا حامی بن کر جوتے طعنے کھاتا تو کبھی دوسرے کی لاتیں۔ اب گھر کی ساری ذمہ داری خود بخود میرے کندھوں پر آ گئی تھی۔

فریدہ، ماے صدیق کی تیسرے نمبر والی بیٹی تھی۔ اس سے پہلے دو بھائی اور بعد میں ایک بہن تھی۔ وہ خودکیسی تھی۔ مجھے اس کا احساس ان ہی دنوں ہوا تھا جب وہ بہانے بہانے سے مامی کے ساتھ بن ٹھن کر بے بے کی خیریت پوچھنے اور الفت بھابی سے ہونے والے معرکوں کی تفصیل جاننے کے لیے آیا کرتی تھی۔ سوکھی چوہیا جیسی چوٹی کو اپنے بالوں سے دگنے بھاری پراندے میں لپیٹے۔ فریدہ میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ پر اس کی غلافی موٹی موٹی آنکھیں اس کے سوکھے ہڈیوں کے ابھار والے رخساروں اور بڑے سے دہانے کے سارے عیب کو انوکھے سے پُر سوز حسن میں بدل دیتی تھیں۔ ان آنکھوں نے مجھے ان دنوں ڈسٹرب کرنا شروع کر دیا جب مجھے عشق محبت کے معنی معلوم تھے نہ ان کو پالنے کا وقت ...... پھر بھی قدرت نے جیسے میرے معصوم جذبہ شوق کو بھانپتے ہوئے فریدہ کو ہنگامی بنیادوں پر میرا نصیب بنانے کا فیصلہ لکھ ڈالا۔

بے بے کو ایک رات دل کا دورہ پڑا۔ دورہ تو معمولی تھا پر اس کے نفسیاتی اثرات بڑے سنگین تھے۔

اور نا معلوم میرا بے بے پر کیا بھار تھا کہ اس نے اگلے دنوں میں اس جان لیوا دورے سے سنبھلتے ہی شاموں شام بھائی کی منت ترلے کر کے میرا اور فریدہ کا نکاح پڑھوا دیا۔ منظور اور شکیلہ کو بے بے کے ساتھ وہ دوسرا کمرہ چھوڑ کر برآمدے میں اپنے بستر لگانے پڑ گئے۔

فریدہ سے میں نے بہت توقعات نہیں باندھی تھیں اور نہ وہ مجھے کوئی سیدھی سادی لگتی تھی جو آتے ہی الفت بھابھی کی طراریوں کے آگے ہتھیار ڈال دے گی۔ میں دل ہی دل میں گھر میں برپا ہونے والی نئی جنگوں کے لیے خود کو تیار کر چکا تھا مگر میرے خیالات کے بالکل برعکس فریدہ بہت محبت کرنے، خیال رکھنے والی اور تھوڑی کم گو نکلی۔ اپنے طبقے کی دوسری لڑکیوں سے خاصی مختلف۔ یہ مجھے خاصی خوشگوار سی حیرت ہوئی اور بے بے اسے سراسر میری خوش قسمتی گردانتی تھیں۔

اور میں جس دورے کو معمولی جان رہا تھا۔ وہ میری شادی کے تیسرے مہینے

بے بے کی جان لے گیا اور برآمدے میں شکیلہ اور منظور کی چارپائیاں رہ گئیں۔

برآمدے کے اس سونے منظر کو یاد کرتے میری آنکھوں میں نمی اتر آئی۔ میں آنکھیں مسل رہا تھا جب فریدہ کھسر پھسر ...... کرتی ناراض چہرہ لیے میرے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

''چھ دنوں کے لیے آنے کی بھلا کیا ضرورت تھی جہاں ڈھائی سال سے دل پر جدائی کا پتھر رکھے بیٹھی تھی۔ وہاں کچھ اور مہینے سہہ لیتی۔ ڈھائی سالوں بعد مہینے کی چھٹی بہت زیادہ لگی تھی کیا؟''

وہ ناراض ناراض لہجے میں شکوہ کرتے ہوئے مجھے اس لمحے کتنی اپنی اپنی سی لگی تھی، بالکل اولین دنوں جیسی جب مجھے رات کو کسی تقریب میں کام کی وجہ سے دیر ہو جاتی تو وہ بے چین سی برآمدے اور صحن میں بہانے بہانے سے چکراتی رہتی۔

''میں وہاں ملازم ہوں میری جان! کوئی اپنا بزنس نہیں کہ اپنی مرضی سے جب چاہوں مہینے کی چھٹی لے کر آ جاؤں۔ مجبوری ہے۔'' میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے نرمی سے کہا۔

''اور نیا شوشا سنا ہے آپ نے، یہ جو آپ کے بھائی بیٹھے خوش گپیاں بگھار رہے تھے، یونہی بے سبب نہ تھیں۔'' وہ ایسی متعصب تو کبھی نہ رہی تھی۔ میں نے کچھ غور سے فریدہ کو دیکھا۔

''آپ آئے ہیں تو پلاٹ کا کام شروع کروا کے جائیں۔'' وہ چند لمحے میرے استفسار کا انتظار کرنے کے بعد بولی۔

''اتنے دن تو نہیں ہوں میں ادھر۔'' میں نے ذرا افسردگی سے کہا۔

''آپ کے بھائی صاحب، منور بھا نے سارے خاندان میں پھیلا دیا ہے کہ مدثر اپنا یہ والا گھر مجھے دے جائے گا۔ اس کی تو گلبرگ میں کوٹھی تیار ہو رہی ہے، اس نے اس کھنڈر کا کیا کرنا ہے۔ خریدنا اس ملبے کو کسی نے ہے نہیں۔ میرے بچے جوان ہیں۔ کب تک کرائے پر لے کر دھکے کھاتا رہوں، اس بار مدثر آئے گا تو اپنے نام پر گھر کروا لوں گا۔'' فریدہ چبا چبا کر بول رہی تھی۔ اس کی بات سن کر لمحہ بھر کو میں بھی چپ سا رہ گیا۔

میرے پردیس کی مشقت بھرے تکلیف دہ ابتدائی سالوں کی کمائی تو اس گھر جسے فریدہ بھی کھنڈر اور چڑیا گھر کے نام کے سوا بلاتی نہیں تھی کو اپنے نام کرانے میں لگ گئی۔ چاچا بشیر کو موٹی رقم دے کر ان کا حصہ دیا پھر ابے کے چاچا شریف اور اس کی بیوہ بیٹی کو لاکھوں دے کر نکالا اور ماما طفیل اس کا نشہ پانی تو ابھی تک میرے بھیجے ہوئے روپوں سے چلتا تھا۔

"اتنے سالوں کی محنت کی کمائی جو اس کھنڈر کو اپنے نام کرانے میں برباد کی، وہی ہم اپنا حصہ لے کر کہیں کرائے پر یا ایک کمرے کا گھر لے کر رہ لیتے تو آج لوگوں کی حریص نظریں نہ ہماری طرف ٹکی ہوتیں۔" فریدہ اسی تپے ہوئے لہجے میں بولی۔

"تمہارے اور بچوں کے اکیلے رہنے کا خیال تھا۔ یہ گھر، گلیاں، علاقے سمجھو اپنے ہی تو ہیں سب پھر تمہارے بھائیوں کے گھر بھی پاس۔ میرے بعد تم اکیلی کہیں اور کیسے رہ سکتی تھیں۔"

یہ اکلوتی دلیل تھی جس کے ذریعے میں ہر بار فریدہ کو یہیں رہنے پر مجبور کیا کرتا تھا۔ اب سوچتا ہوں، غلط کرتا تھا۔ کیا فائدہ ہوا لاکھوں ڈبونے کا۔ اب اگر بھامنور نے یہ مشہور کردیا ہے تو لامحالہ مجھے یہ کرنا پڑے گا۔ اس وقت خاندان بھر میں ان سے گیا گزرا اور لمبے چوڑے کنبے والا کوئی اور نہیں تھا میں یہ گھر بیچ کر چار پیسے وصول لوں گا تو سارا خاندان تھو تھو کرے گا۔ بھامنور کے چار بیٹے تھے اور چاروں باپ کی طرح نکھٹو کام چور۔ چار بیٹیاں کوٹھے جتنی اونچی لمبی۔ سب شادی کے لیے تیار! فریدہ کا غصہ بے جا نہیں تھا۔

"اچھا چلو۔ پکایا کیا ہے؟ بھوک لگ رہی ہے۔ یہ بچے کدھر ہیں؟" میں نے فی الحال اس بوجھل موضوع سے دماغ ہٹانے کے لیے اٹھتے ہوئے کہا اور اندر چل دیا۔

"ہاں۔ میرے کہے کی پروا نہ کرنا۔ سب لٹا دو ان طفیلیوں پر، ان کی تو نہ نیت بھرتی ہے نہ بھوک مٹتی ہے۔ خود کولہو کے بیل بنے رہو اور ان کے ہاتھ پھیلتے رہیں۔ پہلی بار انکار کیا ہوتا تو آج منہ پھاڑ پھاڑ کر حق نہ جتا رہے ہوتے۔ حصہ بھی وصول لیا۔ اکڑ کر جیبیں بھر کر نکلے اور اب پھر دعوے دار بن کر آ گئے، سارے خسارے کیا ہمارے لیے ہیں، جدائی مَیں اور بچے جھیلیں اور میٹھا میٹھا یہ ہپ ہپ کھاتے جائیں۔ مطلبی، موقع پرست۔ ایسے ہوتے ہیں بھائی۔"

فریدہ کی بڑبڑاہٹ کھانے کے دوران اور کھانے کے بعد بھی جاری رہی۔

میں کھانے کے بعد لیٹا بچوں سے باتیں کر رہا تھا۔ اب فریدہ کچن سے فارغ ہو کر آتی تو ان سوٹ کیسوں کو کھولنے کی مہم سر کی جاتی۔ فریدہ تو نہ آئی۔ اس کی دونوں بھابیاں اور بھائی آ گئے پھر ان کے ساتھ باتیں کرتے، چائے پیتے، شام ہو گئی۔ ان کے آنے سے فریدہ کا موڈ بھی قدرے بہتر ہو گیا مگر شام ڈھلے بھامنور اور منظور پھر سے آ گئے تو اس کے چہرے کا تناؤ پہلی حالت پر چلا گیا تو میں دونوں کے ساتھ باہر نکل گیا۔ محلے کے

پرانے یار دوستوں اور ابا کے دوستوں سے ملنے، سلام دعا کے بہانے۔

اور باہر جا کر سب سے ملنے کے دوران واقعی میرے دل پر چھائی اداسی کی نہر کہیں کم ہوتی چلی گئی۔ جب رات گئے میں گھر لوٹا تو صاف ستھرے گھر کے ساتھ فریدہ بھی خوب بنی سنوری ہوئی تھی فالسی کلر کے سوٹ پر شاید کوئی کڑھائی تھی یا مقیش میں تمیز نہیں کرسکا جو بھی تھا۔ اس کے قدرے صحت مند جسم پر خوب اٹھ رہا تھا۔ کندھوں تک کٹے بال تازہ شیمپو کیے ہوئے تھے اور ہلکے میک اپ کے ساتھ تیز کلر کی لپ اسٹک اسے پُرکشش بنا رہی تھی اور دن بھر کے مقابلے میں اس کے حلیے کی طرح اس کا مزاج بھی شگفتہ ہو رہا تھا۔

اس نے کھانے میں بھی اپنے ہاتھ اور سلیقے کی تمام تر کوشش کو مجتمع کیا تھا مٹن بریانی مجھے پہلے بھی اس کے ہاتھ کی پسند تھی۔ آج تو اس کا ذائقہ اور خوشبو دونوں لاجواب تھے اور میٹھے میں فرنی دونوں میری پسند کی چیزیں تھیں، احتیاط کرتے ہوئے بھی میں بہت زیادہ کھا گیا۔

اس نے بچوں کو جلدی سونے کے لیے بھیج دیا، یوں بھی بچوں کو اپنے تحائف مل چکے تھے اور وہ زیادہ وقت اپنے چیزوں کے ساتھ گزارنا چاہ رہے تھے۔ ابھی رشتہ داروں کو دینے والے تحائف کی بندر بانٹ باقی تھی اور یہ تکلیف دہ مرحلہ صبح ہی طے ہونا تھا۔

"اتنا عرصہ کیسے میرے بغیر گزارا کرتے ہو؟"

اور یہی وہ مرحلہ ہوتا تھا جب بھی میں واپس آ کر اس کی قربت کا طلب گار ہوتا۔ وہ بھڑک اٹھتی پھر شکوک و شبہات سوالوں اور مفروضوں اور میری دلیلوں قسموں وعدوں ارادوں کی طویل فہرست ہوتی جو میں اس کے حضور پیش کرتے کرتے تھک جاتا اگرچہ انجام کار وہ ایک مشرقی بیوی کی طرح شوہر کی رضا و خوشی کی خاطر سرینڈر تو کر دیتی مگر میرے دل میں بال سا آ جاتا کہ اسے میرا یقین کیوں نہیں۔ کس طرح پردیس میں پھر اس دیس میں کہ جہاں قدم قدم پر ترغیبات یوں سرراہ آدمی کا رستہ کاٹتی ہیں جیسے کوئی نشان راہ اور میں کیسے کیسے ان ترغیبات سے نگاہیں چرا کر راستہ بدلتا ہوں، یہ میں جانتا ہوں یا میرا اللہ۔

"مرد ہو کر کیسے اتنے پاک باز رہ سکتے ہو، وہ بھی اس شہر میں جہاں قدم قدم پر راستہ روکنے والی ہوں گی۔" وہ سرینڈر، کرتے کرتے بھی طعنہ مار جاتی اور میرے پاس دلیلیں کم پڑنے لگتیں۔

میں جانتا ہوں کہ میں اپنی قسموں میں کتنا سچا ہوں اور اس کے ساتھ بندھے ہوئے تعلق میں کتنا کھرا۔ پھر بھی اسے یقین نہیں آتا تو اس مقام پر آ کر میرا دل چاہتا، میں

اسے لات مار کر سارے شکوک تھوکتے ہوئے ہمیشہ کے لیے اسے چھوڑ کر دفع ہو جاؤں اور اس سے صرف ڈالرز کے ٹرانسفر کا تعلق رکھوں اور سارے تعلق توڑ ڈالوں۔

مگر اس کے باوجود میں ایک کمزور شوہر تھا کہ کسی بھی صورت اپنی بیوی سے نہ تو بے وفائی کر سکتا تھا نہ اپنی تذلیل پر قطع تعلق۔

وہ اب میرے پہلو میں مطمئن سو رہی تھی اور میں کڑھ رہا تھا۔

☆

اگلی صبح کافی لے دے کے بعد فریدہ سب کو وہی تحائف دینے پر راضی ہو ہی گئی جو میں سب کے لیے لایا تھا۔

''ابھی راشد بھائی آئیں گے۔ جا کر پلاٹ پر ہو آیئے اور ٹھیکے دار سے مل کر سارا نقشہ اور خرچ سمجھ لیجیے۔ اب میرے بھائیوں نے تو سارے ٹھیکے نہیں لے رکھے۔ پلاٹ بھی خرید کر دیا۔ اب اس کی تعمیر کے لیے بھی وہی بھاگ دوڑ کریں۔''

میں بھی کچھ حیران تھا۔ فریدہ نے کل سے بھائی کے کارنامے کو جتایا نہیں اور میں بھی جتاتا جتاتا رہ گیا کہ تمہارے بھائی نے جو پلاٹ کی رقم سے کٹوتیاں کر کے اسی علاقے میں اپنا پلاٹ خریدا ہے۔ کیا ایک کرائے کی وڈیو شاپ سے گلبرگ کے پوش ایریے میں سات مرلے کا پلاٹ لینا ممکن ہے اس کے لیے؟ میری شوہرانہ وفاداری پھر آڑے آ گئی۔

''اچھا چلوں گا لیکن تعمیر کے لیے یکمشت اتنی بڑی رقم نکالنا مشکل ہو گی تم سے کہا تھا، دس بارہ مرلے کا پلاٹ لے لو مگر تم نے تو کنال کا لفظ منہ سے نکالا اور پورا کر کے چھوڑا۔ اب اس کنال پر گھر بنانا آسان کام ہے!'' میں چپ رہنے کا سوچ کر بھی کہہ گیا۔

''ہاں تو ساری زندگی اس چڑیا گھر میں گزاری ہے آثار قدیمہ کے کھنڈر میں کہ برسات ہو یا گرمیوں کی آندھیاں، دل ڈرتا ہی رہتا ہے، کہ یہ ملبہ ہمارے اوپر آ کر ابھی ہمارا مقبرہ بنائے کہ بنائے۔ اب اگر اتنی دشواریوں کے بعد اللہ نے موقع دیا تو بندہ اتنا گھر تو لے کہ کھل کر سانس آ سکے۔ ساری زندگی تو سہم سہم کر گزار دی۔ ایک خوشی تم میری پوری نہیں کر سکتے۔ بہن بھائیوں کے منہ سے نکلا ہر غلط ملط لفظ بھی تمہارے لیے حدیث......''

وہ حسب توقع نان اسٹاپ بولتی چلی گئی۔ میرے سیل فون کی بیپ بج رہی تھی۔ میں جان چھڑا کر اٹھ گیا۔

''جی جی حاجی صاحب! خیریت سے پہنچ گیا۔ جی اللہ کا شکر ہے۔''

''جی اچھا...... اچھا آج ہی نکل جاتا ہوں...... جی میں بس ابھی روانہ ہوتا ہوں...... گاڑی...... گاڑی تو نہیں ہے۔ چلیں کر لوں گا۔ بس میں ابھی گھنٹے بھر میں روانہ ہوتا ہوں۔ آپ فکر نہ کریں۔ جی جی ٹکٹ تو میری بھی کنفرم ہے واپسی کی ...... منگل کو ٹھیک ہے جو آپ کا حکم ...... میں پہنچتے ہی آپ کو خبر کرتا ہوں، آپ پریشان نہ ہوں۔ اللہ بہتر کرے گا۔ اللہ حافظ۔''

میرے بولنے کے دوران ہی فریدہ اٹھ کر میرے پاس چلی آئی۔

''کہاں کدھر نکل رہے ہیں ابھی؟'' وہ بہت سارا غصہ دبا کر پوچھ رہی تھی۔

''میں ذرا گوجرانوالہ جا رہا ہوں۔ شام تک آ جاؤں گا۔ تم کھانا اچھا سا پکا لینا اور یہ سامنے بچوں والا کمرہ تیار کر دینا۔ حاجی صاحب کی بیٹی اور بیوی آئیں گی میرے ساتھ۔ وہ یہاں کسی فوتگی پر آئی تھیں۔ ان کی واپسی میرے ساتھ ہی ہے منگل والے دن۔ کل ہفتہ ہے چار دن وہ ادھر ہی رہیں گی۔ ان کی مدارت میں کوئی کسر نہیں رہنا چاہیے۔ پتا ہے نا تمہیں۔''

میں اس سے جلدی جلدی کہتے ہوئے الماری کی طرف اپنے کپڑے لینے کے لیے بڑھ گیا۔ وہ کچھ حیران کچھ پریشان اور کچھ غصے میں لب بھینچے وہیں کھڑی رہی۔

اب وہ حیران ہو یا غصے میں طوفان اٹھائے۔ مجھے اس وقت اس چیز کی پروا نہیں تھی۔ آخر میری روزی کا معاملہ تھا، اس پر کوئی کمپرومائز نہیں ہو سکتا تھا۔

اس کے بڑبڑانے، بولنے، خفا ہونے کی پروا کیے بغیر میں گھنٹہ بھر میں تیار ہو کر باہر نکل گیا۔

رینٹ اے کار سے ایک گاڑی چار دنوں کے لیے رینٹ پر لی اور پٹرول پانی بھروا کر گوجرانوالہ کی طرف روانہ ہو گیا۔

☆

بے بے کے بعد شکیلہ کی شادی، منظور کے روزگار اور شادی کا مسئلہ خود بخود میرے ذمے لگ گیا۔

بھا منور کو تو ان دنوں ایک ہی کام تھا۔ بچے پیدا کرنا اور بیوی کی حمایت میں سب سے لڑائیاں کرنا۔

میں نے مکینکی کا کام پارٹ ٹائم کرتے ہوئے ایک وڈیو شاپ پر نوکری کر لی جہاں ان دنوں زیادہ تر شادیوں پر مووویز بنانا، وی سی آر اور وڈیو کیسٹیں کرائے پر دینا شامل تھا۔ وہ دو نوکریوں کے باوجود بھی گزارہ بہت مشکل سے ہو رہا تھا۔

اوپر تلے تین بچوں کی پیدائش نے میرے اپنے گھریلو اخراجات میں بے تحاشا اضافہ کردیا تھا پھر بہن بھائی کی ذمہ داری، منظور بھی بڑے بھائی کی دیکھا دیکھی کوئی کام تک کرسنجیدگی سے نہ کرتا تھا۔

یوں بھی ہمارے خاندان میں مردوں کی ہڈحرامی ضرب المثل تھی۔ انہیں کام کرنا دوبھر لگتا۔

ان دنوں جب میری تنگ دستی عروج پر تھی۔ پارٹ ٹائم بہت دنوں سے کوئی کام نہیں ملا تھا جب حاجی جمال الدین اپنے بھائی کی شادی کی مووی بنواتے ہماری دکان کی خدمات لینے آئے، وہیں سے میں حاجی صاحب سے متعارف ہوا۔ وہ کئی سالوں سے امریکہ میں تھے اور ایک چھوٹے سے گروسری اسٹور کے مالک بھی بن چکے تھے۔ انہوں نے مجھے امریکہ جانے کو کہا تو پہلی بار مجھے بہت عجیب لگا یہ سن کر۔ اپنا گھربار ملک شہر چھوڑ کر چلا جاؤں ناممکن؟ فریدہ سے بات کی۔ وہ بھی نہ راضی ہوئی۔ اسے بھی میری رفاقت میں روکھی سوکھی گوارا تھی مگر جدائی نہیں۔

حاجی صاحب مجھے اپنا کارڈ دے کر چلے گئے اور میں بھول بھال بھی گیا حالات دن بدن دگرگوں ہوتے چلے گئے۔ گزارہ تو دور کی بات اب تو سر پر قرض ہی اتنا چڑھ گیا تھا کہ اتارنے کے لیے بھی الگ سے سرمائے کی ضرورت تھی۔

ان ہی دنوں ہمارے محلے کے ایک لڑکے نے کسی ایجنٹ کے ذریعے سمندری رستے سے امریکہ جانے کا پروگرام بنایا تو میں بھی سوچنے لگا پھر بہت سارے دن اور بہت ساری راتیں ہم دونوں میاں بیوی نے سوچتے ہوئے بالآخر ''جدائی'' کا بھاری پتھر اپنے سینوں پر رکھنے کا فیصلہ کرلیا۔

ایجنٹ کو دینے کے لیے نئے سرے سے قرض لیا گیا اور سب کی دعاؤں کے سائے میں، میں پردیس کے لیے روانہ ہوگیا ان دنوں امریکہ کیا کسی بھی یورپی ملک میں جانا اتنا جان جوکھوں کا کام نہیں تھا۔ اچھی رقم دے کر بندہ قانونی طریقے سے جاسکتا تھا۔ میں اورشکیل نیویارک ہی پہنچے مگر ہمارے پاس نہ تو قانونی ویزا تھا نہ رہائش نہ روزگار...... چوری چھپے اسی ایجنٹ کے بتائے ہوئے بندوں کے پیچھے مارے مارے پھرتے۔ بھوکے پیاسے پولیس سے چھپتے......

وہ چند مہینے میری زندگی کے تلخ ترین مہینے تھے۔ دو تین بار گھر خط لکھا جواباً فریدہ

نے رو رو کر لکھا کہ آپ کسی طرح واپس آجائیں۔ ہمیں کچھ نہیں چاہیے۔ ہم ادھر بھوکوں گزارہ کرلیں گے آپ آجائیں۔''

میں کشمکش میں پڑ گیا کہ شکیل پکڑا گیا۔ میں اس کے ساتھ نہیں تھا، اس لیے بچ گیا مگر کب تک؟

پردیس کا ہراس کم نہیں تھا کہ پکڑے جانے کا خوف میں گڑگڑا کر سجدے میں گرتا، اللہ سے نیک وسیلے کی دعا کرتا، شاید اسی دعا کا نتیجہ تھا کہ اچانک مجھے حاجی جمال دین مل گئے انہوں نے میرے ان بُرے دنوں کے کانٹے یوں چن لیے جیسے کوئی دوا کسی درد کے مارے مریض کا درد چنتی ہے۔

وہ دن اور آج کا دن۔ حاجی صاحب کے احسانات کا پلڑا اونچا ہی ہوتا چلا گیا۔
اب انہوں نے اگر مجھے یہ معمولی سا کام کہا تو کیا میں نہ کرتا۔ ایسا تو ہو ہی نہیں سکتا تھا۔
میں دوپہر تک گوجرانوالہ کے اس نواحی گاؤں میں پہنچ گیا اور شام سے پہلے ان دونوں خواتین کو لے کر واپس روانہ ہوگیا۔ حاجی صاحب کی بیگم کی بہن فوت ہوگئی تھیں جس کے پُرسے کے لیے وہ پاکستان آئی تھیں۔

''میرا تو سیل فون راستے میں کہیں بیگ سے گرگیا تھا جبکہ زہرہ کا کسی نے چپکے سے نکال لیا۔ فون کے لیے اِدھر گاؤں کے اکلوتے پی سی او پر جانا پڑتا، سوچا تھا شام کو جاکر فون کرکے حاجی صاحب کو بتادوں گی کہ ہم خیریت سے ہیں۔'' حاجی صاحب کی بیگم نے رابطہ نہ کرنے کی وجہ بتائی۔

دونوں خواتین اس گرم موسم میں بھی عبایا پہنے ہوئے اور اسکارف لیے ہوئے تھیں۔ میرا ان دونوں سے احترام کا رشتہ تھا کہ آج تک میرا ان دونوں ماں بیٹی سے سامنا ہو بھی جاتا تو کبھی نظر نہیں ملی تھی۔ میری شرافت اور حاجی صاحب کے احسانات مجھے نگاہ اٹھانے ہی نہ دیتے۔

''ابھی تک ان علاقوں کی وہی حالت ہے جو آج سے تیس چالیس سال پہلے تھی، دیکھ کر دل ہی دکھتا رہا ہے۔ غربت، جہالت اور سہولتوں کی کمی جیسے کوئی ان لوگوں کا والی وارث ہی نہیں۔'' بیگم جمال دین دکھ بھرے لہجے میں کہہ رہی تھیں۔ ''اور یہ غربت اور انتہا درجے کی مفلسی ہی تو ہے جو اچھے بھلے، شریف بھلے مانس لوگوں کو عیاری اور دھوکا دہی پر اکساتی ہے۔ ہم کسی کو کیا الزام دیں۔''

آخر میں وہ ایک آہ سی بھر کر چپ ہوگئیں تو میں نے نادانستگی میں زہرہ جمال کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔ وہ گاڑی کے بند شیشوں سے باہر دھول اڑاتی، کوڑے کرکٹ اور گند سے اٹی سڑکوں اور راستوں کو پلک جھپکے بغیر دیکھ رہی تھی۔

''ہم گناہگار ہوتے اپنے اللہ کے بھی، اپنی بیٹی کے بھی اور اس نعیم کی بیوی اور دو بچوں کے بھی ...... ہمارا آنا کام کر گیا۔'' بیگم جمال بولیں تو میں نے چونک کر انہیں دیکھا۔

''نعیم کی بیوی اور بچے!'' میں نے تعجب سے پوچھا۔

''ہاں اور فقط اپنے پیر جمانے کی خاطر اس نے اپنی بیوی، اس کے گھر والوں اور اپنے گھر والوں کو سختی سے تاکید کردی کہ کوئی تحقیق کرنے آئے تو کہہ دینا۔ نعیم تو اپنی بیوی کو طلاق دے چکا ہے۔ اللہ میری توبہ...... پیسے کے لیے یہ لوگ کیسے کیسے مقدس رشتوں کو داغ دار کر ڈالتے ہیں۔ میں نے سب سن کر اپنے لب ہی سیے رکھے۔ جھگڑتے بھی تو کس سے۔ پہلے ہماری بچی کے ساتھ دھوکا ہوا۔ الٹا ہم نے ہرجانہ ادا کیا، اب اگر یہ نعیم......''

''پلیز امی جان! چینج دا ٹاپک......'' زہرہ جمال کی فراخ پیشانی پر بڑا نمایاں بل آیا تھا اور لہجے میں کیا کچھ چٹخا تھا کہ بیگم جمال نے لب بھینچ لیے۔

زہرہ کی پہلی شادی بھی حاجی صاحب کے کسی رشتہ دار سے ادھر نیویارک میں ہی ہوئی تھی جسے انہوں نے سٹیل ہونے کے لیے اپنے پاس رکھا تھا۔ زہرہ سے شادی کرتے ہی اس نے آنکھیں پھیر لیں۔ سب کچھ فی الفور اپنے ہاتھوں میں لینا چاہتا تھا، جب زہرہ نے اس کے گھٹیا مطالبات والدین کے سامنے پیش کرنے سے انکار کردیا تو وہ انسان سے شیطان بن گیا ایسے ایسے تشدد اس پر کرتا رہا کہ حاجی صاحب کی بیان کرتے ہوئے داڑھی آنسوؤں سے بھیگ گئی۔

انہوں نے لاکھوں روپے اس لالچی گدھ کو دے کر اپنی بیٹی کی جان چھڑائی اور اب یہ نعیم۔ یہ بیگم جمال کے رشتہ داروں میں سے تھا۔ پڑھا لکھا۔ حاجی صاحب نے ہی بلوا کر نوکری دلوائی کہ خود منہ سے زہرہ کا رشتہ مانگ بیٹھا۔ وہ پہلے سے ڈرے ہوئے تھے۔ سو بیگم جمال کی بہن کی موت بہانا بنی۔ انہوں نے دونوں کو نعیم سے بالا ہی پاکستان ایک ہفتے کے لیے بھجوا دیا اور اگلے روز گھبرا کر مجھے بھی روانہ کردیا کہ کوئی مسئلہ نہ ہو جائے اور مسئلہ ہو ہی گیا۔ نعیم بھی دوہرے چہرے والا نکلا۔ اوپر سے مہذب اور معصوم۔ درحقیقت وہی لالچ حرص طمع کا مارا ہوا۔

''بے چاری زہرہ جمال۔'' گھر کی گلی مڑتے ہوئے میں نے ایک تاسف بھری نگاہ زہرہ کے سادہ سے چہرے پر ڈالی اور گہرا سانس لے کر رہ گیا۔

☆

''اب میں سمجھی تم کیسے وہاں اتنے ''صبر'' سے بیٹھے رہتے ہو، ڈھائی ڈھائی تین سال مڑ کر نہیں دیکھتے۔ مرد ہو کر ایسی برداشت۔ تبھی تو میرا دل یقین نہیں کرتا تھا۔ مدثر میاں! تم تو چھپے رستم نکلے۔ ارے جب ہر گھڑی ایسا معصوم فتنہ صورت کے سامنے ہو تو کس کافر کو بیوی جیسی مدقوق چیز یاد آئے گی۔ بس آج مجھے صاف صاف بتاؤ۔ میں کون ہوں؟ کہاں ہوں؟ اور یہ کون ہے اور تمہارے دل میں کہاں ہے؟ کہاں تک ہے؟''

میرے فرشتوں کو بھی گمان نہیں تھا کہ فریدہ ایسا ہنگامہ کرے گی۔ اگرچہ یہ ہنگامہ رات گئے بند کمرے میں برپا تھا مگر یہ کمرہ کوئی دنیا کے آخری کنارے پر تو تھا نہیں، اسی کمرے میں اس کی دیوار جڑی تھی جس میں بیگم جمال دین اور زہرہ جمال سو رہی تھیں اور فریدہ کی پھٹے بانس جیسی آواز میری گھر کی منت واسطے سب بے کار...... وہ تو بپھری ہوئی شیرنی بنی ہوئی تھی۔

''کیا...... کیا...... ہاتھ آیا مجھ بدنصیب کے...... دیکھو دیکھو۔ اس جدائی نے میری کیا حالت کر ڈالی۔ لوگ ملتے ہیں تو پوچھتے ہیں۔ فریدہ کوئی بیماری تو نہیں لگ گئی تجھے اور میں نصیبوں جلی کیا بتاؤں انہیں۔ مجھے وچھوڑے کا ساڑ لگا ہے۔ اپنے ہی شوہر کو اپنے ہاتھوں خود سے دور کر کے کیا ہاتھ آیا میرے...... میرا بدروح بنتا جسم اس کھنڈر میں پڑا گل سڑ رہا ہے اور وہ...... وہ ڈالر کمانے کے بہانے وہاں عیش کر رہا ہے۔ اسے تو کوئی بیماری، کوئی روگ نہیں لگا۔ بھلا چنگا مجھ سے دونا (دوگنا) پرشباب اور میں۔ میں کیا ہوگئی۔ آج راز ہاتھ لگا تمہارے اس اطمینان کا۔ دلاسوں اور جھوٹی قسموں کا......''

وہ اب رونا شروع ہو چکی تھی۔

''خدا کا واسطہ ہے فریدہ! ایسی کوئی بات نہیں۔ میں اللہ رسول کی قسم کھاتا ہوں۔ تمہارے سر کی قسم......''

میں لجاجت سے دھیمی آواز میں کہتے ہوئے اس کے سر کی طرف ہاتھ بڑھانا ہی چاہتا تھا کہ وہ بدک کر یوں پرے ہوئی جیسے میں کوئی اچھوت ہوں۔

''مرجاؤں گی کچھ کھا کر، اگر تم نے مجھے ہاتھ بھی لگایا۔ جب تک ثابت نہیں کرو

گے، اس سونے کی کان سے تمہارا کوئی تعلق نہیں۔'' وہ منہ زور بنی ہوئی تھی۔

''کیسے...... کیسے ثابت کروں؟'' میں بے بسی کی انتہا پر تھا۔

اور تنگ آ کر میں کمرے سے باہر نکل گیا۔ کچھ دیر صحن میں ٹہلتا رہا پھر شکستہ قدموں سے سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر آ گیا۔ اوپر شاید چودھویں کا چاند تھا۔ ہر طرف دودھیا چاندنی چٹکی ہوئی تھی، خستہ حال اینٹوں کی منڈیروں والی چھوٹی سی چھت جہاں پتنگیں اڑاتے، لوٹتے میرے بچپن کی دوپہریں اور سہ پہریں گزری تھیں اس وقت کیسے اجنبی نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھیں۔

ٹہلتے ٹہلتے تھک کر میں سیمنٹ کے بنے ٹوٹے پھوٹے شہ نشین پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر فریدہ کے اشتعال پر غور کرتے جلتے کڑھتے سوچتا رہا پھر کب وہیں لڑھک کر میری آنکھ لگ گئی۔ مجھے پتا بھی نہیں چلا۔

صبح سورج کی تیز کرنوں نے مجھے جھنجوڑ کر اٹھایا تو تھوڑی دیر میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں ادھر کیسے آیا پھر رات کا سارا منظر یاد آتے ہی میں تیزی سے نیچے زینے کی طرف لپکا۔ وہ بیوقوف عورت نہ جانے ان دونوں سے کیا بک بیٹھے اور......'' اس سے آگے میں کچھ سوچنا نہیں چاہتا تھا۔ نیچے مکمل خاموشی تھی، دونوں کمروں کے دروازے بند تھے۔

میں نے شکر کا کلمہ پڑھا اور صحن میں بنے غسل خانے کی طرف بڑھ گیا۔

☆

پھر باقی کے چار دن فریدہ کا موڈ اسی طرح سیخ پر چڑھے کباب کی طرح جلا بھنا ہی رہا۔ اس کے مزاج کی یہ کیفیت دیکھ کر میں نے بھی اسے دوبارہ نہیں چھیڑا۔

پتا نہیں بیگم جمال اور زہرہ کیا سمجھیں۔ کیا نہیں، بہر حال اگلے دن اپنے عزیزوں سے ملنے چلی گئیں اور تیسرے دن ہی واپس آ ئیں جب اگلی صبح ہماری روانگی تھی۔

میں نے ان دنوں میں پلاٹ کا نقشہ دیکھ کر پسند کرلیا تھا گھر کی بنیادوں کا کافی کام میرے سامنے ہی ہو گیا۔

''جتنے پیسے بنک میں ہیں۔ اس سے بمشکل دیواریں کھڑی ہوں گی۔ باقی کے لیے کیا کریں گے؟''

یہ واحد گفتگو تھی جو فریدہ نے ان تین دنوں کی ناراضی کے دوران ذرا آرام سے کی تھی۔

''دیکھتا ہوں جا کر......'' میں شکستگی سے بولا، حقیقتاً مجھے اس کے رویے نے بہت دکھ دیا تھا۔ وہ مجھے اتنا گرا ہوا سمجھتی ہے، اس کا مجھے علم نہیں تھا۔

بیگم جمال اور زہرہ نے اسے سونے کے سیٹ کا تحفہ دیا تھا جسے اس نے بڑی نخوت سے احسان کر کے لیا تھا، بعد میں، میں نے اسے اشاروں کنایوں میں سمجھایا کہ اسے بھی جاتے ہوئے انہیں کچھ تحائف دینے چاہئیں مگر وہ اَن سنا کر کے پھرتی رہی۔ آخر شام میں خود ہی انار کلی جا کر ان دونوں کے لیے کپڑے پیک کروا کے لے آیا اور فریدہ کے اِدھر اُدھر ہوتے ہی بیگم جمال کو فریدہ کی طرف سے کہہ کر دے دیے۔ اس لمحے زہرہ کے چہرے پر کیسی ذو معنی مسکراہٹ تھی کہ میں خوانخواہ شرمندہ سا ہو گیا۔

اور یہ میری بدقسمتی کہ فریدہ کو ان تحائف کا علم ہو گیا شاید چھوٹی گڑیا نے بتایا ہو، اس کے اندر جیسے کوئی منہ بند آتش فشاں کھولنے لگا۔

''اب تم جا رہے ہو تو بہتر ہے وہاں سے کوئی فیصلہ مجھے لکھ بھیجو۔ میں تمہاری جدائی تو سہ سکتی ہوں پر اپنے سہاگ میں دوئی نہیں برداشت کر سکتی، دوسری عورت خواہ کسی بھی تعلق سے تمہارے نزدیک ہو، میں مر کر بھی گوارا نہیں کر سکتی۔''

اور یہ بھی میری بدقسمتی تھی کہ میں نے فریدہ کو بتا رکھا تھا کہ حاجی صاحب کی بیٹی پہلی شادی کے بدترین تجربے کے بعد اسٹور کے آفس میں آ کر بیٹھنے لگی ہے اور میں اس کے اسسٹنٹ کے طور پر کام کرتا ہوں، اس نے میری بات کو یونہی لیا تھا کہ حاجی صاحب کی بیٹی کوئی عمر رسیدہ، معمولی شکل کی یونہی سی عورت ہو گی یا شاید آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل والا معاملہ تھا اور اب زہرہ کو دیکھ کر تو وہ جیسے پاگل ہی ہو گئی تھی۔ شاید تصوراتی طور پر اس نے میرے اور زہرہ کے بیچ کوئی بہت ہی قریبی، تعلق بنا بھی لیا تھا اور میں اس خیال پر ہی لاحول پڑھتا رہتا۔

صد شکر کہ ہماری روانگی کا وقت آ گیا۔

فریدہ کی ناراضی اور غصے میں ذرا سا بھی فرق نہیں آیا۔ مجھے تو پتا ہی نہیں تھا، وہ یوں دیوانوں کی طرح مجھے چاہتی ہے کہ مجھے تصور میں بھی کسی کے ساتھ شیئر نہیں کر سکتی۔ اس کے غصے پر مجھے غصہ بھی آ رہا تھا اور پیار بھی۔

''اب جا کر حاجی صاحب سے کہوں گا۔ مجھے ایک مہینے کی چھٹی دیں۔ میں اپنے گھر کا کام مکمل کروانا چاہتا ہوں اور اپنی اتنی محبت کرنے والی بیوی کے سارے گلے شکوے دور کرنا چاہتا ہوں۔''

میں ائیر پورٹ روانہ ہونے سے پہلے دل میں ارادہ باندھ رہا تھا اور مجھے نہیں پتا تھا کہ ایک ارادہ قدرت بھی باندھ رہی تھی۔

☆

"میری زندگی اب شاید چھ مہینے ہیں یا سال بھر، ڈاکٹرز کا یہی کہنا ہے کہ پیٹ کا کینسر میرے سارے وجود میں پنجے گاڑ چکا ہے سمجھ میں نہیں آتا اگر میرے اللہ نے میری بیٹی کو یونہی تشنہ لب رکھنا تھا تو مجھے تھوڑی مہلت ہی زیادہ دے دیتا۔ سال دو سال۔ میں کیا کروں مدثر! میرے پاس وقت بہت کم ہے۔"

حاجی صاحب ہماری آمد کے تیسرے دن میرے اپارٹمنٹ پر تشریف لائے تھے اور اسی طرح بھیگی داڑھی کے ساتھ کہہ رہے تھے اور میں تو یہ انکشاف سن کر ہی بھونچکا رہ گیا تھا۔

"یہ...... یہ کیا کہہ رہے ہیں حاجی صاحب آپ، اللہ آپ کو سلامت......" میں نے سنبھل کر کہنا چاہا۔ انہوں نے ہاتھ اٹھا کر مجھے روک دیا۔

"آج تمہارے سامنے جھولی پھیلا کر آیا ہوں۔ میری بیٹی جیسی بھی ہے تمہاری نظروں کے سامنے ہے۔ شرع کسی بھی مسلمان کو چار شادیوں کی اجازت دیتی ہے اگر وہ کفالت کر سکے۔ میرا سارا بزنس، گھر سب زہرہ کا ہے تم...... تم اسے اپنا تحفظ دے دو۔ میں قبر میں لیٹا بھی تمہارے لیے دعا کرتا رہوں گا۔ میرا مان رکھ لو مدثر! میرا بیٹا بن کر مجھے اس اذیت ناک موت سے بچالو۔ اپنی بیٹی کو یوں اس شہر بے اماں میں چھوڑ کر میں آرام سے مر بھی نہیں سکوں گا۔"

وہ ہچکیوں سے رو رہے تھے اور میں گنگ بیٹھا تھا۔

"حاجی صاحب پلیز، حوصلہ کریں اللہ مسبب الاسباب ہے۔ آپ جانتے ہیں میں شادی شدہ ہوں اور میرے جوان ہوتے بچے...... اللہ کوئی نہ کوئی رستہ......۔"

"اللہ کے آگے گڑگڑاتا رہا ہوں، وسیلہ مانگتا رہا ہوں، اب اس کا واسطہ دے کر تمہارے آگے گڑگڑاتا ہوں۔ مجھ پر رحم کرو مدثر! مجھ مرتے ہوئے بوڑھے پر......" وہ جھک کر میرے قدموں پر ڈھیر ہونے کو تھے کہ میں نے لپک کر انہیں اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔

"حاجی صاحب! مجھے گناہ گار نہ کریں۔ پلیز۔ میں سوچتا ہوں۔ آپ کو سوچ کر جواب دوں گا۔ پلیز حوصلہ کریں۔ خود کو سنبھالیں۔" میں انہیں سنبھالتے ہوئے خود بکھر رہا تھا۔

یہ تقدیر نے مجھے کس موڑ پر لا کھڑا کیا تھا۔

اگر حاجی صاحب کے احسانات کو دیکھتے ہوئے ان کے بستر مرگ پر پڑے وجود کا خیال کر کے زہرہ سے شادی کی ہامی بھرتا ہوں تو فریدہ کے شکوک کو یقین میں بدل دوں گا اور اگر حاجی صاحب کو انکار کر کے اپنی محبت کو سرخرو کرنا چاہتا ہوں تو روزی، روزگار سے جاؤں گا، اوہ میرے خدایا یہ کیسا مشکل فیصلہ تھا۔

دو راتیں جاگنے اور دن رات سگریٹ پھونکنے کے باوجود بھی میں کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا۔

"یہ شہر اسی وقت تک آپ کا ہے جب تک آپ کی جیب ڈالروں سے بھری رہتی ہے۔ سر پر اپنی چھت بھی ہے جبکہ فریدہ اور میرے بچے تو اس خستہ حال کھنڈر میں بے اماں پڑے ہیں اگر اس برسات میں زوروں کی بارشیں ہوئیں تو کہیں میرے دامن میں عمر بھر کے پچھتاوے نہ رہ جائیں۔ نہیں نہیں ہرگز نہیں...... میں فریدہ سے اپنی بیوی سے بے وفائی نہیں کر سکتا۔ بالکل نہیں۔"

دوسری رات کے آخری پہر فیصلہ ہو گیا اور میں نے بیگ نکال کر اپنی پیکنگ شروع کر دی اور حاجی صاحب کو بتائے بغیر دو دن بعد سیٹ ملتے ہی پاکستان کے لیے روانہ ہو گیا اور مجھے خوشی تھی۔ اس بات کی کہ یہ میرا پردیس سے اپنے گھر کی طرف حتمی سفر ہے۔ اب میرے اور میری بیوی اور بچوں کے بیچ کوئی سفر، کوئی دوری نہیں آئے گی۔ اسی سرشاری نے ایک بار پھر مجھے محو پرواز ہونے کی طاقت دی تھی۔ کچھ دیر کے لیے میں حاجی صاحب کی بے بسی اور ان کے آنسو بھی بھول گیا۔

اور زہرہ جمال تو میرے خیالوں میں کہیں تھی ہی نہیں!

☆

"پلاٹ اور یہ گھر بیچ کر ہم کوئی چھوٹا سا مناسب گھر لے لیں گے اور جو سیونگ اکاؤنٹ میں تین لاکھ روپے ہیں، ان سے میں کوئی نہ کوئی چھوٹا موٹا کام شروع کر دوں گا، تو کوئی مسئلہ نہیں رہے گا۔"

میں بے حد مطمئن، پرسکون سا ایک بار پھر فریدہ کے پہلو سے لگا ہوا اسے اپنی پلاننگ سے آگاہ کر رہا تھا۔ میرا دل اور دماغ اتنا ہلکا پھلکا جیسے ان پر کوئی وزن تھا ہی نہیں۔

"اور وہ میرے شان دار گھر کے خواب......" مجھے لگا فریدہ کی آنکھوں میں اس ٹوٹتے خواب کی کرچیاں بڑے زور سے چبھی ہیں۔

"کچھ عرصہ انتظار کرلو، تھوڑا سیٹ ہوتے ہی ہم......"

"خدا کے لیے۔" وہ ایک دم سے پھٹ پڑی "کتنی لمبی عمر نظر آتی ہے تمہیں میری کیا لاٹھی ٹیکتی آنکھوں میں بس سائے دیکھنے کی چمک لیے اپنے خواب کی تعبیر دیکھوں گی۔ پچھلے گیارہ سالوں سے تم مجھے اپنے عالیشان محل جیسے خواب سے بہلا رہے ہو اور اب پھر خالی ہاتھ...... خالی دامن لیے چلے آئے ہو نئے خوابوں کے بہلاوے لے کر۔"

وہ کس زاویے سے بول رہی تھی۔ لمحہ بھر کو میں بالکل سمجھ نہیں سکا۔

"اور وہ جو تین لاکھ کا راگ الاپ رہے ہو، خود ہی تم نے کہا تھا، اس میں سے راشد بھائی کو اپنے گھر کی تعمیر کے لیے دو لاکھ روپے دے دو۔ جب ہم بنانا شروع کریں گے تو لے لیں گے اور انہوں نے تو ابھی گھر بنانا شروع ہی کیا ہے۔ وہ کہاں سے لوٹائیں گے۔ باقی ایک لاکھ سے کیا کرو گے۔ بتاؤ ذرا۔ یہاں ایک ڈیڑھ مرلے کا ایک کمرے کا گھر پندرہ لاکھ میں مل رہا ہے اور یہ کھنڈر جسے تم جاتے ہوئے اپنے بڑے بھائی جان کے نام کرنے کا وعدہ کر چکے ہو، وہ کیا تمہیں کرنے دیں گے۔"

وہ بول رہی تھی کہ چیخ رہی تھی۔ گیلی لکڑی کی طرح اس میں سے چنگاریاں اور دھواں نکل رہے تھے اور میں ٹکر ٹکر آنکھوں میں چبھتے دھوئیں کی پروا کیے بغیر اسے دیکھے جا رہا تھا۔

"اور...... اور بچے...... ان کو جو پچھلے سال مہنگے ترین اسکولوں میں داخل کرایا ہے، دو چار سالوں میں کالجوں میں اور پھر ان کی شادیاں...... ساری عمر تو کما کما کر بہن بھائیوں میں لٹاتے رہے ہو۔ اب اپنے بچوں کا ٹائم آیا تو کفایت شعاری، قناعت اور روکھی سوکھی کے سارے درس یاد آگئے۔" وہ ایک کے بعد ایک آئینہ تڑتڑ توڑے جا رہی تھی اور میں کسی بت کی طرح بے حس بیٹھا تھا۔

میری مسلسل چپ پر اس نے آخری حربے کے طور پر پھپک پھپک کر رونا شروع کر دیا۔

وہ روئے جا رہی تھی اور میں ......! میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اسے دلاسا دوں تو کن الفاظ میں ...... اسے اس وقت لفظوں، کھوکھلے لفظوں اور غیر مرئی خوابوں کی ضرورت نہیں تھی۔

"پھر کس چیز کی ضرورت تھی؟" میں نے خالی الذہنی سے اس کے بھیگے ہوئے چہرے کو دیکھا۔

"تو...... تو کیا کروں۔" میری آواز کسی گہرے اندھیرے کنوئیں سے آئی تھی۔

آئی بھی تھی یا میرا واہمہ تھا۔

"تم...... تم...... واپس چلے جاؤ۔" اس نے میرا واہمہ سن لیا تھا۔

"واپس؟" میرے لب بے وقت ہلے۔

"ہاں۔ تم پہلی بار اپنی مرضی سے گئے تھے۔ اپنی خوشی سے۔ اس بار ہمارے لیے، اپنے بچوں کے لیے......"

اس نے پہلی بار جانے کو بھی میری خوشی قرار دے دیا۔ عورت بہت سارے تاوان، ذمہ داریوں کی صورت مرد کے کندھوں پر رکھ دیا کرتی ہے۔

"اور...... واپس جانے کی قیمت...... معلوم ہے تمہیں؟" میں نے تلخی سے اسے دیکھا۔ ہماری گفتگو اسی مقام پر آ کر تھم گئی جہاں سے چلی تھی۔

لمحے ہم دونوں کے بیچ سائیں سائیں کرتے سرکنے لگے۔

"تم جا کر زہرہ جمال سے شادی کرلو ...... میں ...... میں...... میں خود...... خوشی سے اجازت دیتی ہوں۔"

مجھے امید تھی۔ یہ بم پھوڑتے ہوئے وہ دھاڑیں مار روئے گی۔ مگر اس کا چہرہ سپاٹ تھا۔ آنسوؤں سے تھوڑا گیلا تھوڑا خشک مگر بالکل سپاٹ۔

"تم زہرہ جمال سے شادی کرلو۔" اس نے یوں کہا تھا جیسے کہہ رہی ہو۔ تم دوسرے کمرے میں جا کر تیار ہو جاؤ!

"اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں۔ نہ بتانا اپنے قبیلے کنبے کو...... اور بتا بھی دو تو انہیں پروا نہیں ہونا چاہیے جب مجھے پروا نہیں ہو تو...... ہیں۔"

اس نے ذرا دلبر سے انداز میں کہتے ہوئے انگلی سے میرے رخسار کو چھوا۔

میرا سر جھک گیا۔

"ابھی یہاں کسی کو پتا نہیں کہ تم آئے ہو اور تمہارے حاجی صاحب کو بھی شاید نہ علم ہو اور اگر ہو بھی تو کوئی مضبوط بہانہ...... کہ بیوی...... بیوی مرتے مرتے بچی۔ اس کا پتا کرنے گیا تھا یا کہہ دینا۔ وہ مرگئی...... مرگئی......" اس نے بے تاثر سے لہجے میں کہا۔ کچھ دیر مجھے دیکھتی رہی پھر اٹھ کر باہر نکل گئی۔

☆

”عورت کیا چیز ہے اور مرد کا مقدر...... کیا ہے مرد کا مقدر؟ ساری زندگی عورت کی خوشی، اس کی رضا کے لیے بھینٹ چڑھتا رہے اور پھر بھی ...... بے وفا ہرجائی ہی کہلاتا رہے۔ یہ کیسا مقدر ہے مرد کا...... سارے فیصلے...... ظالمانہ کٹھور فیصلے عورت کرے پھر بھی وہی مظلوم کہلائے۔ مرد ظالم جابر...... جیسے جیسے...... سب سنیں گے تو مجھ پر سو بار لعنتیں بھیجیں گے کہ وفادار بیوی کو لات مار کر دوسری عورت کو دولت کی ہوس میں اپنا لیا۔ مجھ سے بڑا ظالم کون ہوگا اور فریدہ سے بڑھ کر مظلوم کون؟

میں یہ سب کچھ جانتا تھا۔ فریدہ کے فیصلے کے آگے سر جھکانے کے باوجود سمجھتا تھا کہ میں خود پر کیا ظلم ڈھانے جا رہا ہوں۔ ساری دنیا کی ملامت سہنے جا رہا ہوں اور اس ظالمانہ فیصلے کی ڈوری جس کے ہاتھ میں ہے، وہ سب کی نظروں میں مظلوم ہوگی بے چاری بے بس ...... اور پھر بھی ...... پھر بھی میں نے اس کے فیصلے پر عمل کیا کھوٹ اس کی محبت میں تھا یا میرے ارادے میں؟ میری قسمیں بودی تھیں یا فریدہ کی محبت کمزور...... یا ان دونوں سے بھی بڑی کوئی حقیقت ہے، اس کرہ ارض کی، اس دور کی سب سے بڑی حقیقت!

عاشق کی پہچان، محبوبہ کی محبت، بے لچک ارادے اور سچی محبت سے طاقت ور...... دولت کی حقیقت ...... ڈالر کی طاقت...... جس کے آگے فریدہ کی محبت سرنگوں ہو کر رہ گئی اور میری قسمیں، وعدے، ارادے سب ...... سب مٹی کا ڈھیر ہو گئے۔

میں جتنا سوچتا ہوں، اتنا الجھتا ہوں۔

ان تین ریشمی دھاگوں کی ڈور الجھتی جا رہی ہے اور میرے ہاتھ، میرا دماغ ان تین ریشمی الجھنوں کو سلجھاتے سلجھاتے لہو ہو رہا ہے۔

محبت، یقین اور دولت ......

”ان میں سے کس کی ڈور سب سے مضبوط اور غالب ہے...... وہ حقیقت جس کو مان کر میں اپنی بیوی، اپنے شہر، اپنے گھر اور گلیوں کو غیر معینہ مدت کے لیے الوداع کہہ آیا ہوں۔ آخر اس غیر متزلزل حقیقت کو میرا دل کیوں نہیں مان رہا۔ شاید محبت اور یقین کی کوئی بجھی ہوئی چنگاری سلگ رہی ہے۔ بجھ جائے گی۔

دولت کے ڈھیر کے نیچے دب کر وہ بھی بجھ جائے گی۔

میں نے تھک کر اپنا سر جہاز کی سیٹ سے ٹکا دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔

❁

پیمانے

رشنا کی بھابھی بھی عجیب عورت ہے۔

میں اکثر سوچتی ہوں اگر مجھے دنیا میں کسی کو غائب کر دینے یا چلیں آپ سے کیا پردہ داری، کسی کو قتل کر دینے کی اجازت ہوتی تو وہ یہ ذات یعنی رشنا کی بھابھی ہوتی کوئی سنے تو یقین نہ کرے کوئی دیکھے تو مانے نہیں وہ تو ایسی گھاگ مجرم تھیں جو اپنے خلاف ایک نشان بھی ثبوت کے طور پر نہیں چھوڑتی تھیں بڑی صاف ستھری دھلی دھلائی معصوم سی بنی رہتیں جیسے ان سے زیادہ معصوم بھولا اور رشنا کا خیر خواہ اس دنیا میں کوئی ہے نہیں۔

میں جب جب رشنا کی اُتری صورت دیکھتی میرے خون میں حدت لمحہ بہ لمحہ بڑھتی ہی جاتی، جی چاہتا کہ بس آج تو اس عورت سے دو دو ہاتھ کر ہی آؤں، اس کے منہ پہ اور کچھ نہیں تو اسے دو چار سنا کر گھٹی میسنی کے وہ معروف نام اسے سنا ہی آؤں، جو اول دن سے اس کے ”کمالات“ سننے کے بعد میرے دل نے رکھ چھوڑے تھے۔

لیکن چھوڑیں جی ہم جیسوں کے جلنے کڑھنے یا خون کھولانے سے کیا ہوتا ہے۔

کسی انسان کی مجال نہیں کہ وہ کسی دوسرے جیتے جاگتے، صحت مند ذہنی شعور رکھنے والے انسان کے حقوق یا بنیادی حقوق غصب کر سکے، جب تک وہ خود اپنی لاچاری، بے بسی اور معذوری کا اظہار نہ کرے۔

ہاں تو ذکر ہو رہا تھا جلنے کڑھنے کا تو اس کی وجہ بھی میری حد سے زیادہ بڑھی ہوئی حساسیت ہے، ورنہ آج کل تو لوگ اس طرح کے خود غرض، اور بے حس ہو چکے ہیں کہ ایسی پسی ہوئی بے چاری حالات کی ماری خواہ کتنی ہی تصویریں دن رات ان کی نگاہوں کے سامنے

متحرک ہوں، ان کے کانوں پہ جوں نہیں رینگتی۔

یہ سارا فتور تو میری سپر سپر حساس طبیعت کا ہے امی جب جب ہر ایسے کسی بھی خون کو تپا دینے والے معاملے پر، مجھے بازو لہرا لہرا کر ہوا میں تلواریں چلاتے بڑے بڑے انقلابی مکالمے بولتے دیکھتی ہیں تو جوتا چپل تو حرکت میں آتا ہی ہے مگر ان کی نگاہوں میں جو حسرت جو افسوس ہوتا ہے وہ ناقابلِ بیان ہے، جیسے خدانخواستہ اللہ نے انہیں کوئی ایب نارمل بیٹی دے دی ہو۔

"فائدہ کیا ہے پرائے دکھوں پر یوں تقریریں کرنے خود کو جلانے بلکہ خود کو بھڑکانے کا، جو کچھ بھی ہے جیسا بھی ہے چلتا رہتا ہے کہ ہر کسی کا اپنا معاملہ ہوتا ہے اور وہ اپنے طریقے سے اسے ہینڈل کرنا پسند کرتا ہے تم کیوں پرائی آگ میں خوامخواہ کود کر جان جلاتی ہو۔"

ہر بار امی کے یہی فضیحتے ہوتے اور اکثر ہی میں سر جھکا کر ان سے آئندہ "شانت" اور کول مائنڈڈ بلکہ "کول بلڈڈ" رہنے کا نہ ایفا ہونے والا وعدہ کر بیٹھتی۔

اور ہر بار رشنا جیسی مظلوم صورت کو دیکھتے ہی یہ پیمان فٹ سے یوں توڑ بیٹھتی، جیسے کوئی جان کر کانچ کا گلاس ہاتھ سے چھوڑ بیٹھے۔

اس میں قصور نہ تو رشنا کی مظلوم صورت کا تھا، نہ میری عہد شکن فطرت کا، بلکہ اس سارے میں دوش اس پُرخلوص دوستی اور دل سے جڑنے والے رشتے کا تھا، جو میرا دل رشنا سے اور رشنا کا دل مجھ سے جڑ چکا تھا۔

اس سارے دیباچے یا ابتدائیے کا پس منظر کوئی بہت خوف ناک، وحشت ناک اور نہ جانے کون کون سی ناک والا ہرگز نہیں بلکہ اس کے پس منظر میں "ناک" تو کہیں ہے ہی نہیں بس "کٹی ناک" ہے جو رشنا بی بی نے پہلے ہی کاٹ چھانٹ کر خود اپنے ہاتھ کے پیالے میں سجا کر اپنی بھابھی جان کے حضور پیش کر دی ہے، بطور تحفہ نہ سہی اپنے تاعمر بے زبان رہنے کا ٹوکن بنا کر ان کے پاس گروی رکھوایا ہے۔

اوہو! کہیں آپ یہ تو نہیں سمجھ رہے کہ رشنا ناک کٹی ہے۔

ہے بھی، لیکن نہیں بھی۔

آپ کہیں گے یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ بھئی آج کل کیا ممکن نہیں آپ خود سمجھ دار ہیں اکثر جو ہوتا ہے وہ نظر نہیں آتا اور جو نظر آتا ہے وہ ہوتا نہیں...... سوری میں پھر پٹڑی سے اتر گئی۔

"بھئی رشنا بی بی نے اپنے تمام خارجی وداخلی معاملات کا مختارِ کل کچھ اس طرح سے اپنی بھابھی جان کو بنایا ہے' کیا کوئی تھوڑی سی بھی عزتِ نفس' رکھنے والا انسان خود کو اس تہذیب یافتہ دور میں غلامی کے لیے پیش کرے گا۔

تو ایسی صورت میں رشنا کو "ناک کٹی" کہنا غلط تو نہیں' آپ خود انصاف کر کے بتائیں۔

رشنا سے میری پہلی ملاقات کب ہوئی ٹھیک سے یاد نہیں شاید بچپن میں یا لڑکپن میں' کسی خاندانی تقریب میں ہوئی ہو گی مگر میرے ذہن میں نہیں جب ابا اپنی نوکری کے دوران ہر دو سال بعد ہونے والی ٹرانسفر کے نتیجے میں ہمیں شہر شہر لے کر گھومتے رہے تو کسی بھی پکے دوست کا بننا اتنا ہی غیر یقینی سا تھا' جیسے ابا کا کسی شہر میں دو سال سے زیادہ رکنا' پھر امی کی تربیت کچھ ایسی تھی کہ دوستی کو اسکول کالج تک رکھو اسے پالتے پالتے گھر تک نہ لے آؤ کہ خود ہماری جان کو آنے لگے۔

یہ ہماری امی کا زریں قول...... بہن بھائیوں کے لیے اتنا ان مٹ اور ضروری تھا جتنا اپنا وجود...... اس معاملے میں امی کسی لاڈلے یا آنکھ کے تارے بچے کو رعایت دینے کو تیار نہ تھیں۔

ابو کا آخری تبادلہ...... اس شہر میں ہوا اور تین سال بعد ریٹائرمنٹ اور ہماری اس جبری ہجرت سے جان خلاصی ہوئی۔

میرا سیکنڈ ایئر میں پہلا دن تھا، اگرچہ ادھر کلاسز اسٹارٹ ہوئے چند دن ہو چکے تھے۔ مگر میں لیٹ کمرز میں سے تھی' ایجوکیشن کی کلاس میں جس سیٹ پر مجھے جگہ ملی، اس کے دائیں طرف بیٹھی لڑکی اتنی حسین نازک سی تھی کہ پہلی نظر میں اس کے بے ضرر ہونے کا مجھے یقین ہو گیا اور اس کو پختگی اس کی صورت پر نظر ڈالتے ہی مل گئی۔

کیا بھولی صورت تھی جیسے کوئی ڈار کونج سے بچھڑ گئی ہو یا کوئی چھوٹی سی میمنی اپنے ریوڑ سے بچھڑ کر پُر ہنگام سڑک پر آنکلی ہو' سہمی سہمی نگاہوں کا ہراس اور ہونٹوں پر جبراً کانپتی مسکان اس کے مزید بے ضرور ہونے پر ٹھپہ لگا گئی۔ مجھے اس کی طرف دیکھنے اور اس کا گھبرا کر شرما کر نظریں چرانے کا منظر لطف دینے لگا۔

ایجوکیشن کا چالیس منٹ کا پیریڈ اس لکن چھپن میں گزر گیا' میں اس کی طرف بڑے اعتماد سے مسکرا کر دیکھتی اور وہ جھینپ کر یوں زاویہ نگاہ بدل لیتی جیسے گلی کے کسی آوارہ لڑکے نے اسے آنکھ ماردی ہو۔

وہ ایسی ہی تھی پہلی ملاقات سے لے کر آج تک ڈری سہمی تھوڑی خوف زدہ مگر بے حد کم گو کم آمیز۔

یہ میں ہی تھی عافیہ شفیق جس نے پہلے پیریڈ کے بعد اس کی طرف بڑے اعتماد سے

جو دوستی کا ہاتھ بڑھایا تو آج تک میری ثابت قدمی اور مستقل مزاجی کی وجہ سے یہ ہاتھ رشنا کے
ہولے ہولے مسلسل لرزتے رہنے والے ہاتھ کو تھامے ہوئے تھے۔

''تمہارے ساتھ مسئلہ کیا ہے؟''

میں نے تیسرے دن میں اس کی گھبراہٹ' شرماہٹ اور جھینپے چلے جانے کی مسلسل
کیفیت کو تاڑتے ہوئے پوچھ لیا تھا۔

''کیا مسئلہ؟ کوئی مسئلہ نہیں۔''

اس کے لہجے میں تھوڑی سی اجنبیت اور تھوڑی سی گھبراہٹ در آئی۔

گویا محترمہ اپنے مسئلے کی طرف جلد پکڑائی نہیں دیں گی' اس کے انداز سے میں نے
فوراً اندازہ لگالیا۔

عافیہ بی بی! ابھی اس سہمی ہرنی کا اور بھی دل جیتنا ہوگا بلکہ اس کے ڈرے سہمے دل
کے اندر اترنا ہوگا۔ پہلی ملاقات کے چھوتھے دن تیسرے پیریڈ کے بعد وہ میرے ساتھ گراؤنڈ
کے عقب میں جہاں پانی کی بھاری موٹر گھر گھر کر چلتی تھی۔ اس کی جھاڑیوں میں بیٹھی اپنی
فائل کو بار بار کھولتی' بند کرتی آنکھوں میں اُمڈتی برسات کو ٹالنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔

''میں نے موٹر بند کر دیتی ہوں، تم ٹنکی کے اوپر جا کر بیٹھ جاؤ۔'' میں نے چند لمحے
اس کی کشمکش کا نوٹس لیا اور پھر اسے بے دریغ مشورہ دے ڈالا۔

''کیوں؟'' اس نے بھرے بھرے نین کٹورے اوپر اٹھائے۔

''بھئی' موٹر چلا کر بجلی ضائع کرنے کیا ضرورت۔
تم ٹنکی کے اوپر بیٹھ کر اپنے اشکوں کی برسات سے بآسانی ٹنکی فُل کر سکتی ہو،
قومی بچت کے اس کار خیر میں حصہ لینے کے لیے اتنی کشمکش کا ہے کو؟''

میرا اتنا کہنے کی دیر تھی کہ چھما چھم بغیر گھٹاؤں کے بدریا برسی کہ الاماں الحفیظ!

''اگر اب تم چپ نہ ہوئیں تو میں ٹنکی پر چڑھ کر وہ دھاڑیں مار مار کر روؤں گی کہ
سارا کالج اکٹھا ہو جائے گا ہمارے غم میں شریک ہونے کے لیے۔'' میری دھمکی کارگر ثابت ہو
گی۔ پھپھک پھپھک کر روتی' رشنا سوں سوں کرتی ناک رگڑتی بالآخر چپ ہو ہی گئی۔

رونے کے بعد کیسا گلابی نکھارا آ گیا تھا اس کے چہرے پر جیسے ابھی ناریل دودھ
اور عرق گلاب سے منہ دھو کر آئی ہو۔ (میں ان دنوں نوخیز حسن کو نکھارنے کے لیے ایسے ہی
ٹوٹکے استعمال کر رہی تھی۔ سو وہی تشبیہ استعارہ میرے دماغ میں آسکا۔)

شفاف آنکھوں کے نیلگوں فرش پر تیرتے سرخ پتلے پتلے ڈورے اس کی آنکھوں کو کیا
قاتلانہ روپ بخش رہے تھے۔ اگر میں لڑکا ہوتی تو اب تک اچھی خاصی گڑبڑ ہو چکی ہوتی۔

''اب اس بن بادل برسات کی وجہ بیان کروں گی؟''

میں نے اس کی قاتل نگاہوں اور گلابی چہرے سے نظریں چرا کر کہا۔

''کل شام کو میں انگلش کا ٹیسٹ یاد کر رہی تھی کہ بھائی جان آفس سے ذرا جلدی
آگئے اور آئے بھی کب' یہ بھی مجھے پتہ نہیں چلا اور بھابھی نے کس وقت اتنے ڈھیر گندے
کپڑوں کا لگا کر مشین لگائی' اس کا مجھے پتہ نہیں چلا اور بھائی جان گھر اس لیے جلدی آگئے تھے
کہ بھابھی کو چیک اپ کے لیے ڈاکٹر کے پاس لے جانا تھا' اس کی صبح سے طبیعت اچھی
نہیں تھی، اس لیے کالج سے جاتے ہی کھانا بھی بنا لیا تھا آٹا بھی گوندھ لیا تھا صرف چاول
پکانے رہ گئے تھے وہ تو ظاہر ہے رات کو ہی بننے تھے اس لیے میں فارغ ہو کر پڑھنے بیٹھ گئی
اور بھابھی نے چپکے سے مشین لگالی بھائی جان نے...... بھائی جان نے......''

اس نے گھٹ گھٹ کر پھر رونا شروع کر دیا۔

''کیا کر دیا بھائی جان نے' تمہاری بھابھی کو ڈانٹا یا تمہیں شاباش دی۔''

میں نے اکتا کر کہا مجھے اس کے رونے کا سبب قطعی غیر دلچسپ لگا تھا۔

''بھائی جان نے مجھے ہڈحرام' بے حس' خود غرض' احسان فراموش کہا جو وہ مجھے اور
بھائی کو ابا امی کے بعد اس گھر میں نہ رکھتے تو ہم دونوں یقیناً سڑکوں پر دھکے کھاتے' اور کسی یتیم
خانے میں پلتے اگر تمہاری بھابھی تم لوگوں پر اس درجہ مہربان نہ ہوتیں تو تم جیسے احسان
فراموشوں اور...... اور...... آستین کے...... اف میرا دل چاہا عافیہ کہ میں زمین میں سما جاؤں۔''

وہ پھر رو رہی تھی۔

''اور بھابھی مسلسل انہیں منع کرتے ہوئے نڈھال ہوئی جا رہی تھیں، بھابھی بہت
اچھی ہیں پھر ان کی زرد پڑتی رنگت اور خراب حالت کو دیکھتے ہوئے بھائی جان نے ڈانٹ
ڈپٹ موقوف کی اور انہیں ڈاکٹر کی طرف لے کر بھاگے نیلما اور ان کی ڈانٹ ڈپٹ سن کر اٹھ
گئی اور رونے لگی' ادھر سے مشین اور گندے کپڑوں کا ڈھیر۔

جب بھابھی اور بھائی جان لوٹے تو میں کپڑے دھو چکی تھی مگر پھر بھی بھائی جان کا
خراب موڈ ٹھیک نہیں ہوا، بھابھی کی طبیعت ابھی بھی اچھی نہیں تھی پھر بھی انہوں نے مجھے گلے
لگا کر پیار کیا اور کہتی۔ ''تم نے کپڑے کیوں دھوئے صبح ماسی کو آ ہی جانا تھا۔''

"اگر یہی بات تھی تو تمہاری بھابھی صاحبہ نے پہلے مشین لگا کر خوامخواہ اپنے میاں صاحب کو تاؤ کیوں دلایا۔"

میں بہرحال رشنا کی طرح بے وقوف نہیں تھی' پہلی ہی نظر میں بھابھی صاحبہ کی چالاکی و معصومیت کو تاڑ گئی۔

انہوں نے صرف بھائی جان اور اجو بھائی کے چند کپڑوں کے لیے مشین لگائی تھی اور جو گندے کپڑوں کا ڈھیر تھا وہ تو انہوں نے صبح ماسی کے لیے نکال کر الگ کیا تھا۔

وہ بھابھی صاحبہ کی ہمدردی میں مدح سرا تھی۔

"اور یہ اجو بھائی کون ذات شریف ہیں۔"

مجھے اس کی دوغلی بھابھی کی مدح نہیں سننا تھی' اس لیے موضوع بدل کر بولی۔

"میرے بھائی اور کون؟"

وہ ذرا برا سا مان کر بولی تو میں نے کندھے اچکا کر لاپروائی کا اظہار کیا۔

"تمہاری بھابھی صاحبہ کی طبیعت کو کیا ہوا خیر سے۔"

میں چند لمحوں بعد یونہی اس کی دلجوئی کرنے کو بولی۔

"وہ پریگنیٹ ہیں نا اس لیے۔"

وہ نگاہیں جھکا کر شرگیں لہجے میں بولی۔

"ڈاکٹر نے اس بار کسی پیچیدگی کا کہا ہے' جس کی وجہ سے انہیں بیڈ ریسٹ کا کہا ہے اب میرا کالج...... یہ چھٹیاں ذرا جلدی ہو جائیں تو بے چاری بھابھی کو میں کچھ ریسٹ کروا سکوں۔"

وہ فکرمندی سے بولی۔

"چلو چلتے ہیں۔"

میں اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔

"کہاں؟"

وہ حیرانی سے بولی کیونکہ اگلا پیریڈ شروع ہونے میں ابھی دس منٹ باقی تھے۔

"پرنسپل صاحبہ کے پاس۔"

میں سنجیدگی سے بولی۔

"وہ کیوں۔"

وہ اٹھتے ہوئے ذرا گھبرا کر بولی۔

"بھئی ان سے ہاتھ باندھ کر دست بستہ درخواست کریں گے کہ اس بار روٹین سے ہٹ کر کوئی ایک آدھ مہینہ چھٹیاں فرما دیں تاکہ رشنا اپنی بھابھی صاحبہ کو ریسٹ کروا سکیں۔"

میں شرارت سے بولی تو وہ مجھے دھپ لگاتے ہوئے ہنس دی۔

اور ایمان داری کی بات ہے اس کے روئے روئے چہرے کی طرح اس کی ہنسی بھی بڑی سجیلی کھنک دار اور کچھ کچھ معطر سی لگی مجھے...... اس کی وجہ صرف اس بھولی لڑکی کی معصومیت ہے، میں نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے خود ہی توجیہہ پیش کی۔

☆

رشنا کو ہر نئے دن رونے کے لیے ایک کندھا چاہیے ہوتا تھا اور مجھے ایک اچھی دوست کی ضرورت تھی۔ سو ہم دونوں ایک دوسرے کے قریب آتے چلے گئے۔

"اس میں ساری چالاکی تمہاری بھابھی کی ہے۔"

میں ہر بار اس کے منہ سے بھابھی کا ہمدردانہ رویہ اور رشنا کے لیے چاہت سن کر فوراً کہہ ڈالتی اور وہ اتنی ہی شدت سے تردید کر دیتی۔

"نہیں عافیہ میری بھابھی ایسی نہیں ہیں' وہ تو ہر طرح سے میرا خیال رکھتی ہیں' بس میں ہی تھوڑی سی کم عقل ہوں' خود سے کچھ بھی نہیں سمجھ پاتی اور کچھ نہ کچھ گڑبڑ ہو جاتی ہے۔"

وہ ہر بار اس عورت کی طرف داری اور اپنی کوتاہی بیان کرتی۔

"مجھے تو پتہ ہی نہیں تھا کہ وہ عورتیں کسی رشتے وشتے کے سلسلے میں گھر آ رہی ہیں اور بھابھی نے مجھے دو تین بار اچھے کپڑے پہننے یا ڈھنگ سے تیار ہونے کو کیوں کہا ہے' بلکہ انہوں نے مجھے ایک دو اشارے بھی دیئے' میرا ہی دماغ میڈم فرحت کے ٹیسٹ میں الجھا ہوا تھا۔ بھابھی نے تو چھوٹے مانی کو سلا دیا تھا' میں سر جھاڑ منہ پھاڑ ٹیسٹ یاد کرتے ہوئے کتاب میں سر دیئے بیٹھی تھی جب بیل بجی اور میں نے بال تک سلجھانے یا سوٹ کا ہم رنگ دوپٹہ تک پہننے کی زحمت نہیں کی اور دروازہ کھولنے چل دی بس......

بھائی جان تو اچھے خاصے خفا ہوئے ان کے دوست کی کزن کی والدہ تھیں اور ان کی بہن تھیں، جبکہ بھابھی جان نے کہا بھی کہ معصوم ہے ہماری رشنا ابھی ان باتوں کو نہیں سمجھتی' آپ ہی کو جلدی پڑی ہے اور اسے تھوڑی سمجھ تو آ لینے دیں پھر یہ سلسلے دیکھے جائیں گے۔

مگر بھائی جان ایک ہی بات کہے جا رہے تھے کہ امی ابا مجھ پر جو ذمہ داری ڈال گئے ہیں، وہ جلد سے جلد اس سے عہدہ برآ ہونا چاہتے ہیں اور میری عمر کی لڑکیاں شادی کے بعد

گھر بار، پورے سسرال سنبھالے بیٹھی ہیں اور میں احمقوں کی طرح اپنی معصومیت کو ٹیگ بنائے ان کے لیے مشکلات کا پہاڑ کھڑا کر رہی ہوں وغیرہ وغیرہ۔"

اور نجانے کیوں پہلی بار مجھے رشنا کی بھابھی اتنی بُری نہیں لگیں کہ میرا خون کھولنے لگتا۔

"وہ تو اس کی بھابھی اور بھائی ہیں' انہیں اتنی جلدی رشنا کے ہاتھ پیلے کرنے کی فکر لگ گئی' اتنی جلدی رشنا کے ہاتھ پیلے کرنے کی فکر لگ گئی، جبکہ میری تو امی ابا کو ابھی یہ خیال جیسے چھو کر ہی نہیں گزرا دونوں آپاؤں کی تو ایف اے کے فوراً بعد شادی بھی کر دی گئی تھی اور میں اب تھرڈ ایئر میں ہوں، عجیب سی خود ترسی میرے اندر گھر کرنے لگی تھی۔ میں چپ چاپ اس کے پاس سے اٹھ آئی پھر یہ سارا قصہ وقتاً فوقتاً دہرایا جانے لگا۔

خاص مہمان، آتے کبھی رشنا انجان ہوتی کبھی بھابھی بھول جاتیں کہ مہمانوں کو آنا ہے تو خاص اہتمام کرنا ہے رشنا کو بھی سنوارنا ہے یا اور کچھ نہیں تو گھر پر ان کو موجود ہونا چاہیے، وہ بے وجہ کسی بڑی شاپنگ پر نکل گئی ہوتیں۔

کبھی لڑکے والوں کو رشنا کی بے وقوف سی شکل پسند نہ آتی اور کبھی لمبے جہیز کے امکان دکھائی نہ دیتے، یوں رشنا کے لیے جو اتنی جلدی یہ سلسلہ شروع کیا گیا تھا وہ ان دو سالوں میں بھی وہیں کھڑا تھا جہاں سے چلا تھا۔ ہاں بھابھی کے بچے دو سے چار ہو چکے تھے۔

اور رشنا کی گھریلو ذمہ داریوں میں چار گنا سے آٹھ گنا اضافہ ہو چکا تھا۔

اس کے رونے دھونے اور آنسوؤں میں ٹھیک ٹھاک ٹھہراؤ آ چکا تھا اب وہ ایسے کسی بھی چھوٹے موٹے واقعے پر نہ تو روتی نہ ہمدرد طلب نگاہوں سے دیکھتی، بس سر گھما کر بات سنا ہکر ادھر ادھر لاتعلق سی ہو کر دیکھنے لگتی۔ مجھے اس پر بے تحاشا ترس آنے لگتا۔ ان تین سالوں میں وہ کتنا بدل گئی تھی۔

اس کے چہرے کا گلابی پن سارے کا سارا جیسے اس کے بہتے آنسوؤں کے ساتھ کہیں ڈھل گیا تھا اور آنکھوں کے نیلگوں فرش کیسے اکھڑے اکھڑے ویران سے لگنے لگے تھے' جیسے ان پر امید کی ایک بھی کونپل اب نہ پھوٹ سکے گی۔ اس کی ہنسی کے کانچ اب نہیں کھنکتے تھے' نہ وہ معطر سی لگتی پتہ نہیں تبدیلی کہاں آئی تھی۔

اسے اتنا زیادہ جاننے کے باوجود میں اس تبدیلی کا ماخذ نہیں جان سکی تھی۔

دو بار میرا رشنا کے گھر جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ بہت خوبصورت' کشادہ ہرے بھرے پودوں اور پھولوں کی بیلوں اور باڑوں میں گھری ہوئی چار دیواری کے اندر اسٹائلش انداز میں

بنا، جدید طرز کا گھر ہر آنے والے کی توجہ اپنی جانب ضرور کھینچتا تھا پھر خوبصورت اور قیمتی طرز رہائش قطعاً رشنا جیسی مسکین اور ہونق صورت سے میل نہیں کھاتا تھا۔ اس میں کمال کس کا تھا میں فوری طور پر جان نہ سکی اتنے آرٹسٹک خیالات اور چوائس اس کی بھابھی کی تھی یا رشنا کی، کیونکہ گھر میں دو ہی عورتیں تھیں اور رشنا کی بھابھی کیا زبردست عورت تھی۔ جس طرح کی تصویر رشنا نے میرے آگے پینٹ کی تھی' اس سے قطعاً مختلف، ایک بے حد اسمارٹ، ویل ڈریسڈ، خوش اخلاق، بے حد مہذب عورت وہ بہت لچھے دار گفتگو نہیں کرتی تھی مگر رشنا کی طرح کم گو یا خشک بھی نہیں تھی، پاس بیٹھ کر جس اخلاق اور شائستگی سے آنے والے کا حال احوال دریافت کرتی، پھر جس محبت سے رشنا کو تکتے ہوئے پکارتی کوئی بھی آؤٹ سائیڈر ان کے رویے سے اس کے باطن کا دھوکہ نہیں کھا سکتا تھا۔

کوئی بھی شخص اندر اور باہر سے بہرحال اتنا مختلف نہیں ہو سکتا۔ میں اس کے باہر جاتے ہی معترف ہوئی تھی' پھر جس طرح انہوں نے میری تواضع کی' جیسے میں کوئی بڑی وی آئی پی ہوں۔

"رشنا! تمہاری دوست تو بڑی زبردست ہے اور تم نے کبھی اسے گھر انوائٹ ہی نہیں کیا۔ اچھے دوست زندگی میں بار بار نہیں ملا کرتے اور ہر کسی کو تو ملتے بھی نہیں تو لکی ہو' جو تمہیں اتنی پیاری صورت اور سیرت والی دوست ملی ہے۔"

رشنا کی بھابھی نے پہلی ہی ملاقات میں میرا دل جیت لیا تھا مگر اگلے روز رشنا کی صورت اتری ہوئی تھی اور میرا تھوڑا سا ہی کریدنے پر بہت دنوں بعد اس نے رونے کا شغل اختیار کیا تو میں نے ٹھٹک گئی۔

"بھابھی کہتی ہیں دوستیوں کو کالج سے گھر تک نہ لاؤ' تمہیں خوار کر دیں گی' کسی سے بھی اتنا بہناپا گانٹھنے کی ضرورت نہیں کہ تمہارے ہر راز سے واقف ہو جائے' ہر کمزوری جان کر تم پر کسی دن وار کر ڈالے اور یہ لڑکی عافیہ تو......"

وہ اس سے جو بولی میرا خون کھول گیا ایسے بھی دو غلے چہرے ہوتے ہیں۔

"پھر بھائی جان بھی مجھے ڈانٹنے لگے کہ کیا ضرورت ہے فضول میں دوستیاں بنانے کی، تمہارا کالج میں ایک سال ہے' میں تو ایف اے کے بعد تمہیں آگے نہیں پڑھانا چاہتا تھا مگر تمہاری بھابھی، اسے تمہارا گریجوایشن ہر قیمت پر گوارا ہے' خود چاہے سارا دن اسے گھر اور بچوں کے ساتھ کھپنا پڑے تمہاری پڑھائی پر آنچ نہیں آنی چاہیے تو تمہیں بھی اپنی بھابھی کی باتوں کو ماننا چاہیے تم کو، شکل سے ایسی بدھو لگتی ہو کہ کوئی بھی تمہیں بآسانی بے وقوف بنا سکتا ہے۔"

وہ رو رہی تھی اور پہلی بار میرا جی چاہا کہ اس کی دوستی پر دو حرف بھیج کر اٹھ جاؤں اور دوبارہ اس فضول لڑکی کی کبھی صورت نہ دیکھوں۔

مگر پھر اس کے تواتر سے بہتے آنسو اور گھٹی گھٹی ہچکیوں پر مجھے رحم آ گیا۔

''اور پھر بھابھی کہنے لگیں، یہ بے چاری بھی اپنے دل کی بات کس سے کرے اس کے لیے کوئی دوست، کوئی غم گسار تو ہونا چاہیے، میں لاکھ اس سے محبت جتاؤں اس کی دوستی کے قابل تو نہیں ہو سکتی' اس کی عمر میں تو دوستی کے پیمانے ہی اور ہوتے ہیں، پھر بھلا بے چاری بھابھیاں اپنا جگر بھی بھون کر پیش کر دیں تو دوستی اور بھروسے کے قابل نہیں ہو سکتیں۔''

اس کی اگلی باتوں نے مجھے وہیں ٹھٹھکا دیا۔

اس کی بھابھی کتنی زبردست ایکٹر ہے اس کا اندازہ جوں جوں مجھے ہو رہا تھا اپنے بے وقوف بننے کا احساس شدید تر ہو رہا تھا جو خود کو بہت عقل مند' ہوشیار سمجھتی تھی کس آسانی سے اس کی ایکٹر بھابھی کی میٹھی چھری جیسی فطرت سے مار کھا گئی تھی۔

بھائی جان' بھابھی کے دل گرفتہ ہونے پر انہیں تسلیاں دینے لگے اور میں رات کے کھانے کے برتن دھونے کے لیے اٹھ کر گئی' ورنہ انہیں یاد آ جاتا تو انہیں کسی اور ہی ڈھنک سے مجھے ڈانٹ پڑوانے کا ارادہ باندھ لیتا تھا۔ مجھے وہ سمجھ میں نہیں آتے کبھی دھوپ کبھی چھاؤں کبھی ماں کی طرح مہربان کبھی دشمن کی طرح تہہ تیغ کرنے پر آمادہ...... بہت ڈر لگتا ہے مجھے ان سے۔''

وہ آخر میں خود ہی اپنا چہرہ رگڑنے لگی۔

''تم اپنے بھائی جان کو ان کا اصل روپ کیوں نہیں دکھاتیں۔''

میں نے تھوڑا تپے ہوئے انداز میں کہا، بلکہ اسے مشورہ دینا چاہا۔

''بھائی جان اور ان کو بتاؤں...... دکھانا تو دور کی بات۔''

''چھوڑو جیسے گزری ہے باقی بھی گزر جائے گی۔'' اس نے سر اٹھا کر آسمان کی طرف تکتے ہوئے قدرے لاپرواہ انداز میں کہا۔

''اور وہ تمہارا پچھلے ہفتے پرپوزل آیا تھا اس کا کیا بنا؟''

مجھے اس دکھی سی' بے زبان لڑکی سے ...... دلی ہمدردی تھی۔

''جو پہلے آنے والے کا بنا چلو اٹھو کلاس اسٹارٹ ہونے والی ہے۔''

وہ بات ٹالتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی تو میں نے بھی اس کی تقلید کی مگر صرف اٹھتے

میں......

اس کی ایکٹر بھابھی سے تو میرے دل نے باندھ لیا ایک مکار عورت...... اس کے سامنے میرے جیسی ہوشیار لڑکی بے وقوف بن گئی تو بے چاری رشنا کیا چیز ہے۔

گھر آ کر میں نے سب کچھ امی کو بتاتے ہوئے اس کی بھابھی کی غائبانہ خوب ہی شان میں اضافہ کیا' امی مجھے ٹوکتی رہیں اور میں اس عورت کو خوب ہی برا بھلا کہہ کر اپنا کھولتا خون ٹھنڈا کرتی رہی۔ مگر اس کی بھابھی سے دوسری ملاقات نے ایک بار پھر مجھے اپنے خیالات بدلنے پر مجبور کر دیا۔

☆

امی کی کسی کزن کی بیٹی کی شادی تھی، جہاں میں بالکل غیر متوقع طور پر رشنا کو اپنے سامنے دیکھ کر حیران رہ گئی۔

''ارے تم یہاں کہاں؟''

وہ مود کلر کے نفیس کام کرنے والے فینسی سوٹ میں خاصی مختلف رشنا لگ رہی تھی' میچنگ سلور جیولری اور سلور نازک سینڈل کے ساتھ پہلی ہی نہیں دوسری تیسری بلکہ ہر نظر میں اچھی لگ رہی تھی اور دوسرا جھٹکا مجھے پیچھے مڑ کر دیکھنے میں لگا۔

امی رشنا کی بھابھی کے ساتھ بڑے گرم جوش انداز میں مل رہی تھیں اور رشنا کی بھابھی کے چہرے کے رنگ ہی اور تھے اور اس شام کا رنگ ہی کچھ ایسا تھا کہ ہر چیز بدلی بدلی مگر بے حد بھلی اور نئی نویلی سی لگ رہی تھی۔

''ارے اس گھٹیا کے مرض کا برا ہو کہیں آنے جانے کے قابل نہیں چھوڑا' قریبی عزیز رشتہ داروں سے ملے بھی سالوں گزر جاتے ہیں اب یہی دیکھ لو آخری بار قدیر بھائی سے ملاقات تمہاری شادی پر ہوئی اور اس کے بعد ان کی وفات پر بعد میں دل میں دس بار ارادے باندھتی رہی مگر اس بیماری نے اجازت ہی نہ دی کہ آ کر تم لوگوں کا حال معلوم کر لیتی' یوں بھی اس شہر میں سکون سے آ کے بیٹھے بھی تو دو چار سال ہوئے ہیں۔''

امی کیا پیار بھرے اپنے سے انداز میں رشنا کی بھابھی کو ساتھ لگائے کہے جا رہی تھیں۔

''اور آنٹی جی دیکھ لیں' میں نے آپ کو پہلی نظر میں پہچان لیا۔''

وہ فوراً اس پیار کا جواب مٹھاس بھرے لہجے میں دیتے ہوئے بولیں۔

"ماشاءاللہ کیا حافظہ ہے' پہلی نظر میں تو نہیں پہچان نہیں سکی تھی اور سناؤ اطہر کا' کیا حال ہے رشنا کدھر ہے۔"

یوں یوں کہہ رہی تھیں' جیسے ان کے بچھڑے ہوئے بھتیجے بھتیجی انہیں اس اچانک موقع پر مل گئے ہوں۔

رشنا میرے ساتھ حیران سی کھڑی تھی، اس کی سمجھ میں بھی شاید یہ اچانک پیدا ہونے والی رشتہ داری نہیں آ رہی تھی۔

اپنی بھابھی کے اشارے پہ وہ آگے بڑھ کر امی کو سلام کرنے لگی۔

"ماشاءاللہ جیتی رہو' کیسی بڑی ہو گئی قدیر بھائی کی وفات پر تو ابھی بچی تھی اللہ نصیب اچھے کرے۔"

امی اسے ساتھ لگائے پیار کر رہی تھیں' امی کی نظر مجھ پر پڑی۔

"ارے عافیہ سے ملیں تو رشنا! اور ثروت یہ میری بیٹی ہے۔"

امی کو میرا تعارف کرانے کا خیال بھی آ گیا میں مسکراتی ہوئی آگے بڑھی۔

"ارے یہ تو اپنی عافیہ ہے' رشنا کی دوست دیکھو' اس دن گھر آئی تو کوئی ذکر نہیں کیا کہ یہ آپ کی بیٹی ہے۔"

رشنا کی بھابھی مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے اسی میٹھے لہجے میں بولیں جس سے میں پہلی ملاقات میں دھوکا کھا گئی تھی۔

"ارے آج کل بڑے ملنے میں سالوں لگا دیتے ہیں تو بچوں کا کیا قصور' آج کل کی نسل تو یوں بھی مصروف بہت ہے' ہر وقت کی کمی کا رونا روتی رہتی ہے' ٹی وی کمپیوٹر' موبائل کے لیے ان کے پاس وقت ہی وقت ہے بس انسانوں سے ملنے کا وقت نہیں ہے۔"

امی جو شروع ہونے جا رہی تھیں' کسی خیال سے چونک کر رکیں۔

"یہ وہی رشنا ہے تمہاری کالج کی سہیلی۔"

انہیں ایک دم سے یاد آیا تو بڑے غور سے پہلے رشنا کو اور پھر اس کی بھابھی کو دیکھنے لگیں ان کی نگاہوں میں خود بخود جذبہ ترحم سا ابھر آیا تھا رشنا کے لیے، میں کھسیا کر سر ہلانے لگی۔

"ہوں" امی نے یوں سر ہلایا جیسے کہہ رہی ہوں۔" اچھا یہ وہی رشنا ہے جس کی ہمدردی کا بخار تمہیں گھر میں بھی چین نہیں لینے دیتا اور جس کی بھابھی کے خلاف تمہاری تقریریں تمام نہیں ہوتیں۔"

"رشنا!"

وہ ادھر ادھر دیکھ رہی تھی شاید امی کی نگاہوں سے گھبرا کر......

"آؤ رشنا! تمہیں اپنی کزنز سے ملواؤں۔"

اس سے پہلے کہ امی کے منہ سے کوئی کلمہ حق نکلتا میں رشنا کا ہاتھ کھینچ کر اسے وہاں سے لے گئی۔

"یہ رشنا ہے۔"

تعارف سنتے ہی سب کے منہ سے حیرت بھرا پہلا جملہ یہی نکلتا تھا۔

میں اچھی خاصی مصیبت میں پھنس گئی تھی۔

جو بھی ذرا قریبی تھوڑا ہمدرد دوست آشنا تھا' اس کے سامنے رشنا کی مظلومیت اس کی بھابھی کی دوغلی فطرت اور کمینے پن کے دکھڑے میں رکھے تھے۔

اب ہر ایک کے منہ سے اچھا یہ رشنا ہے نکلنا تو لازم تھا۔

لگا ساری محفل اس ایک سوال کی بارش میں بھیگ گئی ہے میں شرمندہ ہو کر اسے لیے ایک طرف بیٹھ گئی۔

"تم نے ہر جگہ میرا اچھا خاصا غائبانہ تعارف کرا رکھا ہے۔"

رشنا بہرحال اتنی بھی بدھو نہیں تھی کہ اچھا یہ رشنا ہے کہ پیچھے چھپے معنی خیز سوالیہ انداز کو نہ جان سکتی۔

"عافیہ یہ اچھی بات نہیں۔"

وہ بہت دیر بعد سر اٹھا کر بولی تھی' سر جھکائے نہ جانے اتنی دیر کون سے مراقبے میں گم ہو رہی تھی۔

"کون سی بات؟"

میں غائب دماغی سے سامنے بیٹھی امی اور رشنا کی بھابھی کو خوب گھل مل کر باتیں کرتے دیکھ رہی تھی۔

"مجھے اچھا نہیں لگا کہ سب مجھ پر ترس بھری نظریں ڈال کر خاموش ہمدردی جتائیں۔"

"ہیں!"

وہ کیا بولی تھی میں بھونچکی سی رہ گئی۔

"لو بھلا میں نے کیا برا کیا' یا تمہارا برا چاہا یوں بھی برے کو برا کہنا کون سا غلط ہے'

اب اپنی بھابھی صاحبہ کو دیکھ رہی ہو، کیا مٹھار مٹھار کر امی سے باتیں کر رہی ہیں، جیسے ان سے اچھا مہربان، خوش اخلاق اور نیک فطرت اور کوئی ہے ہی نہیں۔"

میں ایک دم سے جوش میں آ کر بولی۔ رشنا نے عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھا۔

"عافیہ! وہ میری بھابھی ہیں اور مجھ سے ان کا جو بھی رویہ ہے' وہ میرے لیے ہے' میں اگر تمہیں اپنی مخلص دوست جان کر ذرا دل ہلکا کر لیتی تھی تو...... اور یہ میری ہی غلطی ہے مجھے اپنے گھر کی بات تم سے کیا کسی سے بھی کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔"

اس کی آنکھیں برسنے کو تھیں۔

"یہی تمہارا سرینڈر کرنے والا رویہ انہیں شہہ دینے کو کافی ہے۔"

میں حسب عادت چمک کر بولی۔

"تم کیوں ان کی غلط باتوں پر انہیں منہ پر جواب نہیں دیتیں' کیوں بولنے کے موقع پر منہ سی لیتی ہو' آخر وہ تمہارے باپ کا گھر ہے' تمہارے بھائیوں کا اور شادی ہو جانے تک تمہارا بھی' انہیں کوئی حق نہیں پہنچتا کہ وہ تم سے یوں ملازموں جیسا سلوک کریں' تم سے اپنی اور اپنے بچوں کی چاکری بھی کروائیں پھر اپنی ٹانگ اونچی رکھتے ہوئے سب پر یہ تاثر دیں کہ یہ سب کچھ اپنی خوشی سے کرتی ہو' ورنہ انہیں کوئی مجبوری نہیں' تم نے ان کے اس دوغلے عجیب سے رویے کے خلاف پہلے دن آواز اٹھائی ہوتی زبان کھول کر سب کے سامنے حقیقت بیان کر دی ہوتی تو آج تمہیں نہ یوں بیٹھ کر رونا پڑتا اور نہ اپنے دل کے دکھ اور درد گھر کی باتیں کسی سے بھی بیان کرنے کی ضرورت پڑتی۔"

میں جوش میں بولی تو بولتی چلی گئی۔ اس نے اپنا چہرہ ٹشو سے صاف کر لیا۔

"تم یہ سب باتیں کہہ سکتی ہو اور بڑے جوش میں کہہ سکتی ہو کہ تمہارے سر پر تمہارے ماں باپ کا سایہ ہے لیکن سچ اور حق پر ہوتے ہوئے بھی خود کو ثابت نہیں کر سکتی اور اگر کروں تو کوئی میری بات نہیں مانے گا مان بھی لے تو معلوم ہے...... پھر......"

وہ رکی۔

"وہ گھر بے شک میرے باپ اور میرے بھائیوں کا ہے مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ مجھ جیسی کمزور لڑکی ایسا کوئی بھی دعویٰ کر کے زبان دراز، گستاخ اور باغی جیسے خطاب تو پا سکتی ہے' اپنی جگہ بھی اس گھر میں کھو سکتی ہے' گھر کی چھت سے بڑھ کر' اپنے بھائیوں کی پناہ سے بڑھ کر مجھے کچھ بھی عزیز نہیں۔"

وہ خشک لہجے میں دوٹوک بولی تھی۔

"چاہے اس چھت اور پناہ کے نیچے روز تمہاری انا کا خون ہو اور تمہاری عزت نفس کو جوتوں تلے روندا جاتا رہے۔"

میں طنز سے بولی۔

"یہ سب محسوس کرنے اور سر پر سوار کرنے باتیں ہیں' کسی بھی چیز کو ہم معمولی یا غیر معمولی جان کر اس کو بڑھا بھی سکتے ہیں اور گھٹا بھی سکتے ہیں اور میرے نزدیک...... یہ کوئی ایسی بات نہیں کہ میں اپنی پناہ گاہ کو داؤ پر لگا دوں ارے بھائی آ گئے لگتا ہے گھر جانے کے لیے بھابھی سے کہنے آئے ہیں۔"

وہ اپنی رندھی ہوئی آواز کا گلا گھونٹ کر ایک دم سے اٹھ کھڑی ہوئی تو میں بھی بددل سی اس کے پیچھے چل پڑی۔

امی کسی سے مل رہی تھیں۔

"قدیر بھائی کے بعد مظہر سے تو انجم آپا کے چہلم پر ملاقات ہوئی پر اجو تو اتنے سالوں بعد آیا ہے۔"

امی کہتے ہوئے کسی اونچے لمبے نوجوان کے جھکے سر پر پیار دے رہی تھیں۔ کیمل کلر کی شرٹ میں اس کے چوڑے کندھے اور دراز قد ایک وجیہہ جوان ہونے کا بتا رہے تھے۔

"ماشاء اللہ قدیر بھائی کی جیتی جاتی تصویر ہے' اللہ زندگی اور رزق میں برکت دے علم میں اضافہ کرے کیا کرتے ہو آج کل؟"

امی تو یہاں بچھڑے ہوئے رشتہ داروں سے مل رہی تھیں' جیسے برسوں ان سے ملنے کی حسرت دل میں لیے بیٹھی تھیں، ویسے کبھی ان کے منہ سے ان کا ذکر نہ سنا تھا۔

"آنٹی جی! ابھی اسی سال ایم بی اے مکمل کیا ہے اجو نے ماشاءاللہ گولڈ میڈلسٹ ہے آپ کا بھتیجا۔"

مظہر بھائی اور رشنا کی بھابھی ساتھ ساتھ ہی بولے تھے' بات مکمل رشنا کی بھابھی نے کی تھی۔

وہ جوان سے تھوڑا کترا کر بیٹھا تھا کیونکہ امی ایک بار پھر چٹا چٹ اس کی بلائیں لینے لگی تھیں۔

وہ پلٹا اور مجھے یوں لگا پھر چراغوں میں روشنی نہ رہی۔

یہ رشنا تو کتنی احمق بدھو اور بے وقوف سی ہے اسے تو کسی کو Convey بھی نہیں کرنا آتا۔

''اجو میرے بھائی ہیں۔''

بار بار اس کا سادہ مگر طنزیہ لہجہ گونجتا اس کے اجو کہنے سے جیسے کسی کم گو، معمولی شکل وصورت کے ہونق سے سراپے کی تشبیہہ دماغ میں ابھرتی تھی مگر اجو یعنی اظہر تو مردانہ وجاہت کا مکمل شاہکار مگر بہن کی طرح کم آمیز جھینپو گھبرایا شرمایا کترایا سا نوجوان تھا۔

اس کی یہ شرماہٹ گھبراہٹ ہی شاید سامنے والے کے دل پر پہلا وار کرتی تھی اور دوسرا وار...... اس کی وجاہت' ابھرے ابھرے سے نقوش ہلکی ہلکی سبز رووں والا تازہ خط شدہ چہرہ جس پر اس شرماہٹ کی ہلکی ہلکی لالی اسے دوسرے بے باک اور نظر باز لڑکوں سے ممتاز و منفرد بناتی تھی اور تیسرا وار تو سب سے کاری تھا۔

اس کی ایم بی اے کی گولڈ میڈلسٹ ڈگری اور اس پر نئی نئی شاندار نیشنل کمپنی میں زبردست جاب میں اپنے معصوم دل کو اس کے کس کس وار سے بچاتی اس کا گھائل ہونا تو لازم تھا۔

جس طرح میرے تعارف پر اس نے نیچی نظروں سے سر ہلا کر میرے سلام کا جواب دیا تھا اور جس تندہی اور محویت سے اس نے میرے پیروں اور ان میں پڑی سینڈلز کا جائزہ لیا تھا، مجھے یقین تھا اس نے مجھے قطعاً نہیں دیکھا ہوگا مگر اس کے اتنے عمیق معائنہ کے دوران میں نے بڑے بے خوف سے انداز میں' اس کا بھرپور جائزہ لے ڈالا تھا اور اس بھرپور جائزے نے سمجھیں میرے دل کا بیڑا غرق کر ڈالا۔

پہلی رات کی نیند تو گئی مگر اس سے اگلی راتیں بھی رت جگھوں میں ڈھلنے لگیں۔

اور یہ محبت وہ بھی نظر کی محبت ...... محبت بھی اتنی شاید کہ عشق سے کوئی قریبی تعلق جڑتا نظر آتا ہو ایسی محبت تو کیا...... محبت کرنا ہی ہماری کلاس میں ابھی اس کا فیشن اتنا پروان نہیں چڑھا تھا۔

لڑکوں کی پسندیدگی عرف عام محبت عشق کا کوئی خال خال قصہ تو خاندان میں سننے کو مل جاتا تھا مگر کوئی لڑکی کسے لڑکے کے لیے اپنی زبان سے محبت و پسندیدگی کا اقرار کرے' یہ انہونی ابھی تک ہمارے خاندانی ریکارڈ میں کہیں بھی درج نہیں تھی جو لگتا تھا میں درج کروانے جارہی ہوں، کیسا باغیانہ فعل ہوسکتا تھا یہ۔ میں کیا کرتی میری تو اس لمحے سے جیسے آنکھوں کی نیند دل کا چین ہی کہیں کھو گیا تھا۔

کتابیں کالج پڑھائی کچھ بھی ہوش نہیں رہا تھا۔

احمق سی رشنا کی بچی کیا نادر و نایاب ہیرا گدڑی میں چھپائے بیٹھی تھی اور کبھی جو اس نے منہ سے پھوٹا ہو کہ اس کا بھائی کیسا قاتل سراپا رکھنے کے علاوہ کیسا ذہین قابل ہے وہ تو بس ہروقت بھابھی نامہ سے دکھڑے ہی روتی رہتی تھی۔

مجھے رہ رہ کر رشنا پر ہی غصہ آتا۔

اب تین دن سے اس کا فون بھی نہیں آیا' میں کالج نہیں گئی تو اس نے بھی پتہ نہیں کروایا' آخری دنوں میں پڑھائی کا لوڈ کتنا زیادہ ہوتا ہے مجھے بھی خیال نہیں آیا' اب اگر دل کو درد ملا ہے تو اس کی دوا بھی تو کرنا ہوگی کہ یونہی جلتے تڑپتے کمرے میں بند اس درد کو سینے سے لگا کر ہائے وائے کیا جائے گا نکلو عافیہ بی بی درد کا درماں ڈھونڈو ورنہ تو تم اس درد کے ہاتھوں دنیا سے چل بسو گی اور کسی کو خبر بھی نہ ہوں گی۔

ایسی جواں مرگی کا سوچ کر ہی آنکھیں بھر آئیں۔

سو اگلے ہی روز اٹھ کر نئے عزم نئے خوابوں کے ساتھ تیار ہو کر کالج چلی آئی اور بے چینی سے رشنا کا انتظار کرنے لگی اس نے بھی لگتا تھا مجھے تڑپانے کی قسم اٹھائی ہے۔

پہلے پیریڈ میں وہ موجود نہیں تھی' میرا دل مایوسیوں کے اندھیرے میں ہاتھ پاؤں مارنے لگا' خود پر ایسا ترس آرہا تھا کہ ابھی رو پڑوں گی۔

شاید رو ہی پڑتی جو رشنا کو بیس منٹ لیٹ کلاس میں داخل ہو کر ٹیچر سے اجازت مانگتے اور ڈانٹ کھاتے دیکھ لیتی وہ آخری نشستوں پر جا کر بیٹھی تو میرے دل کو قرار آیا۔

☆

''اف تم اس روز شادی میں کتنی زبردست لگ رہی تھیں کہ تم پہ نظر نہیں ٹھہر رہی تھی دل میں اتنی بار خیال آیا کہ آج تم سے کہے بغیر رہ نہیں سکی۔''

میں اس کے چپ چپ موڈ کی پروا کیے بغیر اپنی پاکٹ منی سے چاٹ کھلانے کے بعد اسے اپنے پسندیدہ گوشے میں لے آئی۔

''تو کیا؟''

بظاہر وہ غیر حاضر دماغ لگ رہی تھی' گھاس نوچتے ہوئے آہستگی سے بولی۔

''اگر میرے دونوں بھائیوں کی شادی نہ ہو گئی ہوتی تو میں یقیناً تم جیسی اتنی پیاری دوست کو اپنی بھابھی بنا کر گھر لے آتی۔''

میں نے اپنے درد دل کی دوا کرنے کی ہی کوشش کی۔

"ہوں۔"

اس کے چپ چپ چہرے پر ہلکی سی سرخی دوڑی اور بس اسی طرح گھاس نوچ نوچ کر ڈھیر لگاتی رہی' جیسے آج مالی نے اس کے ذمے یہی کام لگایا ہو۔

"کیا بات ہے موڈ اچھا نہیں پھر بھابھی سے کوئی بات ہوگئی۔"

مجھے اس کے چپ چپ موڈ کا نوٹس لینا ہی پڑا۔

"ہوں۔نہیں تو؟"

وہ جبراً مسکرائی۔

"پھر!"

آخر میں اس کی اکلوتی مخلص ہمدرد دوست تھی اس کے دکھی مزاج کی دل جوئی کرنا میرا فرض تھا۔

"نہیں کچھ خاص نہیں۔"

اس نے پھر کوئی سرا نہیں پکڑایا۔

"خفا ہو"

میں تھوڑی دیر بعد سوچ کر بولی۔

"کس بات پر۔"

وہ جیسے سوتے سے اٹھ کر آ گئی تھی۔

"اس شام جوسب نے تمہیں دیکھ کر...... تمہیں شاید ناگوار گزرا تھا۔"

میں نے ہولے سے کچھ شرمندہ لہجے میں کہا۔

"نہیں وہ بات اس وقت ختم ہوگئی تھی' مجھے برا لگا میں نے تم سے فوراً کہہ ڈالا تھا۔"

وہ صاف گوئی سے بولی۔

اور یہ سچ بھی تھا وہ کوئی بات بری لگتی تو میرے منہ پر کہہ دیتی تھی مگر اس میں جرأت صرف منہ پر کہنے کی تھی۔

"پھر اداس کیوں ہو؟"

"یونہی اس دن تمہاری امی کا محبت بھرا سلوک دیکھا تو پتہ نہیں کیوں امی کی یاد آئی کہ...... بس اس دن ہی سے طبیعت پر ایسی اداسی طاری ہے' کسی سے بھی بولنے بات کرنے کو جی نہیں چاہتا' اس لیے دو دن کالج بھی نہیں آئی۔ابھی بھابھی نے زبردستی بھیجا کہ ہفتے دس دن

بعد تو چھٹیاں ہو ہی جانا ہے ایگزام کے لیے تو جا کر نامکمل نوٹس مکمل کرلاؤں۔"

وہ آہستہ آہستہ اس طرح گھاس نوچتے ہوئے بولی تو مجھے اس کا دکھ اپنے دل کے بے حد قریب محسوس ہوا۔

اکیلی تھی نہ ماں کی ہمدرد دوستی نصیب نہ بابل کی شفقت بس تیرے میرے جیسی کی زبانی کلامی ہمدردی...... اس پر بھی بے چاری پھونک پھونک کر اعتبار کرتی ہے اور سوکھے پتے کی طرح کانپتی رہتی ہے۔

میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے دل گرفتہ سا ہوئی۔

"کم آن رشنا کیوں دکھی ہوتی ہو یار! میں ہوں نا پھر میری امی تمہاری بھی تو کچھ لگتی ہیں آج تیسرے پیریڈ کے بعد ہماری کوئی خاص کلاس تو ہے نہیں میرے ساتھ گھر چلو' امی تمہیں دیکھ کر بہت خوش ہوں گی' تمہارا بھی دل بہل جائے گا اور ان تین سالوں میں اتنی بار تم سے کہتی رہی کہ ہمارے گھر چلو مگر تمہارے سر پہ تو بھابھی جان کے خوف کا بھوت سوار رہتا تھا۔"

میں اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے اس کی دل جوئی کر رہی تھی۔

"اب تو انہیں بھی کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

زبانی لفاظی اپنی جگہ مگر فزیکل ٹچ یا ہمدردی بھرا لمس دوسرے کے دکھ کو کتنا کم کرتا ہے، اس کا اندازہ مجھے اگلے لمحے رشنا کی کھلی کھلی سی مسکراہٹ کو دیکھ کر ہوا۔

"نہیں بھابھی نے تو پہلے بھی کبھی خاص منع نہیں کیا تھا' پھر بھی میں انہیں بلاوجہ اعتراض کا موقع نہیں دینا چاہتی تھی' یوں بھی ہم روز تو کالج میں مل لیتے ہیں اس لیے مجھے کبھی ایسی ضرورت ہی محسوس نہ ہوئی کہ تمہارے ساتھ گھر چلتی۔"

وہ میرا ہاتھ اسی محبت سے دبا کر بڑے اپنائیت بھرے لہجے میں بولی گویا اسے میرے دلی خلوص کا پورا علم تھا۔

"چلو اب چلی چلو' یوں بھی اس ہفتے کالج بند ہو رہا ہے آج گھر دیکھ لینا تو پھر چھٹیوں میں بھی کچھ نوٹس یا اسٹڈیز کے لیے تمہیں میری یا مجھے تمہاری ضرورت پڑ سکتی ہے' گھر دیکھا ہوگا تو چاہے تم اپنے کسی بھائی کے ساتھ آجاؤ۔"

میں نے اپنے دل کی بات کہی۔

"نہیں وہ تو مسئلہ نہیں بھابھی جان نے تم لوگوں کا گھر دیکھ رکھا ہے۔"

وہ آہستگی سے بولی۔

''تو پھر پرسوں یا کل شام ہی آجاؤ' امی بھی تمہارا ذکر بڑی محبت سے کر رہی تھیں۔''
میں اسے گھر آنے پر آمادہ کرنا چاہ رہی تھی۔

''بھائی جان یا بھابھی سے ذکر کروں گی تو پھر ان دونوں میں سے کسی کے ساتھ آ جاؤں گی۔''

وہ اس طرف نہیں آ رہی تھی' جس طرف میں اسے لانا چاہ رہی تھی۔

''تم نے کبھی ذکر ہی نہیں کیا تمہارے بھائی ایم بی اے کر رہے ہیں۔''

میں خود ہی ڈھیٹ بنی۔

''اس میں ذکر کرنے کی کیا ضرورت تھی بھلا۔''

وہ الٹا معصوم بن کر سوال کرتے ہوئے بولی تو میں کچھ شرمندہ سی ہو گئی۔

''گولڈ میڈل تو بڑی بات ہے۔''

میں نے اپنی ڈھٹائی پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی۔

''ہاں یہ مجھ سے غلطی ہوئی' اصل میں جن دنوں بھائی کا رزلٹ آیا تو میں نے ایک ہفتے کی کالج سے چھٹیاں لی ہوئی تھیں' جب چھوٹے شاہ زیب کو نمونیہ ہو گیا تھا بس اس پریشانی میں تمہیں بتا نہ سکی۔''

''اس بات پر تو ٹریٹ ہونا چاہیے نا۔''

''ہاں بنتی تو ہے جب تم کہو۔''

وہ مان ہی گئی۔

''تو چلو ہمارے گھر آجاؤ کسی دن، وہیں کچھ مل کر پکائیں گے۔''

میں نے بے تکی سی بات کی تو وہ چپ کر گئی۔

''نہیں ٹریٹ تو کالج میں ہی دوں گی، وہ صائمہ وغیرہ بھی کہہ رہی تھیں، صائمہ کا کزن بھائی کا کلاس فیلو تھا انہیں تو پہلے سے پتا تھا روز تقاضا کرتی ہیں تو ان کا بھی منہ بند ہو جائے گا۔''

وہ گھر آنے پر کسی صورت راضی نہیں تھی' سو میں نے بھی بعد میں اصرار نہیں کیا۔

مگر اپنے دل کا کیا کرتی جو کسی صورت چین نہیں لے رہا تھا' جیسے اس کی کوئی قیمتی متاع چرائے لے جا رہا ہے۔

پھر ان ہی دنوں گھر میں خاص مہمانوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا میں خاصا جھنجلائی' امی سے لڑی بھی کہ ''آپ کو بھی میرے ایگزام کا انتظار تھا یہ سلسلہ شروع کرنے کے لیے۔''

''ہم کون سا رشتہ طے کر کے بارات منگوا رہے ہیں ابھی تو دیکھنے کا سلسلہ ہے' اللہ کرنے جلد ہی کوئی بات بنے اب لگیں گے تو کہیں سال چھ مہینے میں کچھ ہوتا نظر آئے گا' تم دھیان سے پڑھو بس گھڑی بھر کو آ کر سلام ہی کرنا ہوتا ہے سو کر جاؤ۔''

امی یوں بولیں جیسے کوئی ہوا میں مکھی اڑاتا ہے۔

''اچھی مصیبت ہے میرے چودہ سال کی محنت ہے اب آخر میں آ کر خاک بندہ یکسوئی سے پڑھ سکے گا' ایک دو ہفتے صبر بھی کیا جا سکتا ہے۔'' میری بڑبڑاہٹ پر امی مجھے گھور کر رہ گئیں۔

''اور سناؤ وہ تمہاری دوست رشنا اس کی کہیں بات بنی۔''

امی کو جیسے یاد آیا۔

''نہیں اس کی بھابھی بھی ہی مخلص نہیں۔''

میں بے دلی سے بولی۔

''اچھا اب یونہی نہ ہر موضوع پر منہ کھول لیا کرو دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں پھر خاندان کا معاملہ ہے اور بھابھی نند کی چپقلش کس گھر میں نہیں ہوتی' تمہیں زیادہ بیچ میں گھس کر قاضی بننے کی ضرورت نہیں'

امی نے موقع ملتے ہی مجھے لتاڑا۔

''مجھے کیا ضرورت ہے کسی کے بیچ گھسنے کی۔''

میں بڑبڑائی یوں بھی ان دنوں میرا دل بھنا تا ہی رہتا تھا۔

''بھائی اس کا اچھا ہے۔''

میں جو یونہی بیٹھی کڑھ رہی تھی' امی کی آواز پہ میرا دل جیسے بلیوں اچھلا تھا۔

''کون......؟''

میں نے انجان بن کر پوچھا۔

''وہی جس نے ٹاپ کیا ہے اجو کیا نام ہے اس کا بھلا سا اظہر'' امی پر سوچ نظروں سے کسی نادیدہ نکتے کو گھورتے ہوئے آہستہ سے بولیں۔

''ہاں اس دن رشنا بھی کہہ رہی تھی۔''

میں نے کھنکھار کر کہا۔

''کیا کہہ رہی تھی۔''

امی اپنے خیال سے باہر نکلیں۔

یہی کہ وہ اپنے بھائی کے لیے کوئی اچھی سی لڑکی تلاش کر رہے ہیں۔'' میں نے ہوا میں تیر چلایا۔

''اچھی سی لڑکی۔''

امی لبوں میں بڑبڑائیں۔

''دیکھا بھالا خاندان ہے پھر کوئی بھری پُری سسرال بھی نہیں ایک جیٹھ جٹھانی اور ایک نند سال بھر میں بیاہی جائے گی اپنا گھر بار اور شاندار نوکری پھر لڑکا بے حد نیک شریف مہذب اور صورت کا بھلا آج کل کے تیز طرار لڑکوں سے ہزار گنا سادہ اور نیک طبیعت کا۔''

امی خود سے کہے جارہی تھیں اور میرا دل جیسے ٹکٹکی پر چڑھا تھا۔

''دو چار جگہ گئی بھی ہیں وہ لوگ لڑکی دیکھنے مگر کچھ خاص پسند نہیں آئی انہیں لڑکی یا کسی جگہ گھر اور فیملی بیک گراؤنڈ۔''

میں نے راکھ سے چنگاری کریدنے کی کوشش کی۔

''ہوں۔''

امی پرخیال نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھیں۔

''کرتی ہوں بات صفیہ آپا سے۔'' وہ پھر خود سے بولیں۔

''کون صفیہ آپا۔''

میں جلدی سے بولی۔

''تمہیں کیا تم اپنا پڑھو۔''

وہ ناگواری سے بولیں تو میں کندھے اچکا کر اٹھ آئی۔

مگر مجھے لگتا تھا امی کے دل تک میرے دل کی بے چین دھڑکنوں نے اپنا پیغام پہنچا دیا ہے اور امی کے دل نے اسے وصول بھی کر لیا ہے' کیونکہ اس کے بعد کتنے دن' کتنے مہینے کوئی بھی خاص مہمانوں کا ٹولا نہیں آیا نہ کوئی دوسری مشکوک سرگرمی مجھے گھر کی متوازن فضا کو غیر متوازن کرتی دکھائی دی۔ اس دوران ہمارے ایگزام بھی ہو گئے۔

دوسرے چوتھے روز میں رشنا کو فون کر لیتی یا اس کا دس پندرہ دن میں ایک بار فون آجاتا' وہ اس معاملے میں بھی خاصی محتاط تھی یوں بھی اپنے دل کے ہاتھوں مجبور تھی' اپنی غرض کے باعث ہی جلد جلد فون کر لیتی کہ شاید کسی طرح اس سے بھی کبھی ہائے ہیلو ہو جائے مگر ایسا

صرف ایک بار ہوا وہ بھی اس نے ''ہولڈ کریں میں رشنا کو بلاتا ہوں۔''

کہہ کر معاملہ اسی طرح ون وے ٹریفک والا رکھا۔

میرے بے حد اصرار پر رشنا صرف دو بار ہمارے گھر آئی تھی، وہ بھی ایک بار بھابھی کے ساتھ اور ایک بار اپنے بڑے بھائی کے ساتھ۔

اس کی بھابھی کے سامنے تو اور کسی کی دال کم ہی گلتی تھی' یوں بھی اسے ان کے ساتھ ڈرائنگ روم میں ہی بیٹھے رہنا پڑا اور ایک بار میں نے اندر چلنے کو کہا تو اس کی بھابھی نے بھی خوب میٹھے لہجے میں اسے اندر جانے کو کہا جسے اس نے ان سنا کر دیا۔

''تمہیں تکلیف کیا تھی میرے کمرے میں' بس کھڑے رکیں جبکہ تمہاری بھابھی صاحبہ بھی فرما رہی تھیں اندر جا کر گپ شپ کر لو۔''

میں بعد میں فون پر غصہ ہوتے ہوئے بولی۔

''تمہیں ابھی بھی سمجھ میں نہیں آیا۔''

وہ ذرا ٹھہر کر بولی۔

''سب کے سامنے تو وہ اجازت دے رہی تھیں بعد میں انہوں نے دس بار مجھے جتانا تھا کہ میں کونے کھدروں میں چھپ کر گھر کی باتیں تمہیں بتاتی ہوں' اپنی مظلومیت کے قصے سنا کر ہمدردی بٹورتی ہوں اور میرے ظلم کی کہانی سنا کر مجھے ظالم ثابت کرنا چاہتی ہو حالانکہ......''

اس کی آواز حسب عادت رندھ گئی۔

اور میں دل میں یہ بھی نہ کہہ سکی کہ کہتی تو وہ ٹھیک ہیں۔

میں صرف ایک بار ان کے گھر گئی وہ بھی خوب تیار ہو کر مگر ایسی سادگی کے ساتھ جو بالکل نیچرل لگے' دن بھی اتوار کا تھا مگر اس کے باوجود اس ظالم اظہر عرف اجو سے ملاقات تو درکنار اس کے درشن بھی نہ ہو سکے' وہ گھر میں موجود نہیں تھا' ہاں جب ہم آرہے تھے تو وہ گھر میں داخل ہو رہا تھا۔

امی نے اپنی ساری شفقتیں، محبتیں اس پر وہیں چوکھٹ پر کھڑے کھڑے لٹا دیں اور میں ...... میری دید نے جی بھر کر اپنی سیری کی کیونکہ وہ تو توقع کے عین مطابق میرے اور امی کے پیروں کا ایکسرے کرنے میں مصروف تھا۔

''بیٹا اتنی دیر تمہارا انتظار کیا کسی دن چکر لگاؤ نا ہمارے گھر۔''

امی کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اسے اپنے دوپٹے کے پلو سے باندھ لیں یا اپنے بیگ نما شولڈر پرس میں ڈال لیں۔

"مائیں بیٹیوں کے دلوں سے کتنی قریب ہوتی ہیں۔"

مجھے ان لمحات میں اندازہ ہوا' امی اور میں دونوں ہی سرشار لوٹے تھے۔

امی کیوں خوش تھیں مجھے تو معلوم نہیں مگر دل تو جیسے ہواؤں میں اڑ رہا تھا' لمبی مناجات کے بعد تو دل کے صحرا میں دید کی بارش برسی تھی' میرا من من اس بارش میں بھیگا جا رہا تھا مجھے اردگرد کا ہوش نہیں تھا تو امی کے بدلے سے انداز کہاں سوچتے۔

"ہم بھائی کے لیے لڑکی ڈھونڈ رہے ہیں۔"

جب میں نے امی سے یہ بے پر کی بات کہی تھی اس وقت شاید قبولیت کی گھڑی پاس ہی کھڑی تھی' جو اس دن رشنا مجھ سے فون پر بولی۔

"ہم بھائی کے لیے لڑکی ڈھونڈ رہے ہیں۔"

"ہیں اور تم تو کہہ رہی تھیں تمہارے بھائی کہتے ہیں پہلے تمہارا رشتہ کریں گے۔"

میں بجھے دل سے بولی۔

"وہ تو لگے ہی ہوئے ہیں مگر بھائی کا بھی تو کرنا ہے لڑکی کون سی آرام سے مل جائے گی' ڈھونڈنے میں اتنے دن لگ جاتے ہیں۔"

وہ اسی بھولپن سے کہہ رہی تھی' جو اس کا خاصہ تھا اور جو مجھے پسند بھی تھا مگر آج...... میرا تو جیسے دل ہی ٹوٹ گیا تھا۔

"اچھی لڑکی...... تو کیا میں اچھی لڑکی نہیں تھی۔"

وہ لڑکی ڈھونڈنے نکلیں گے تو کیا میں ہر روز اس سے بات کرتی ہوں' آئے دن آنے والے مہمانوں کے بارے میں بتاتی ہوں تو کیا اسے پتا نہیں چلتا کہ میں جو اس سے ہمدردی اور محبت کے اظہار کرتی ہوں اس سارے کا کیا مطلب ہے؟"

میرا دل جیسے درد کے مارے پھٹنے کو تھا۔

"اگر اسے میری دوست ہو کر میرے دل کی حالت کا علم نہیں تو ایسی دوستی کا کیا فائدہ؟ لعنت بھیجو ایسی دوستی پر۔"

میں نے فوری طور پر فون بند کر دیا۔

ہم دونوں کا رزلٹ آ گیا تھا اور ہم دونوں فرسٹ ڈویژن میں پاس ہو گئی تھیں۔

"میں جاب کر رہی ہوں غوری صاحب بھائی جان کے دوست بھی ہیں اور بڑا اچھا امریکن سسٹم اسٹارٹ کر رہے ہیں' میں وہاں جاب کر رہی ہوں تم بھی کر لو' کب تک بھابھی کا دل جیتنے کے لیے خود کو گھر چولہے ہانڈی میں گھساتی رہو گی۔"

اب تو میں اس سے بات بھی کرتی تھی تو خفا خفا روٹھی سی...... مگر وہ احمق پھر بھی نہیں سمجھی۔

"ہاں جاب اس نے کر لی میرے ساتھ۔ غوری صاحب کا اسکول ہم دونوں کے گھروں کے درمیان میں تھا سو آنے جانے کی زیادہ دقت نہیں تھی خالی ذہنوں کو کچھ مصروفیت بھی مل گئی۔

"عافیہ ہم نے بھائی کے لیے لڑکی ڈھونڈ لی ہے۔"

ہماری جاب کو ابھی چار ماہ بھی نہیں ہوئے تھے کہ ایک صبح رشنا نے مجھے بڑے جوش سے یہ خوشی کی خبر سنائی۔

"تم نے سنا نہیں کچھ۔"

میری گہری چپ پر دوبارہ بولی۔

"ہوں اچھا مبارک ہو میں ذرا ابھی آتی ہوں۔"

میں...... ایک دم سے اٹھ کر باہر نکل آئی۔

اس سے زیادہ بہادر تو نہیں تھی میں اور اس دن رشنا کے فارغ ہونے سے پہلے ہی میں طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر کے گھر چلی آئی اور مجھے نہیں پتہ تھا کہ شام کو ہمارے گھر میں خوشیوں کی بارات آنے والی ہے۔

میں تو اسکول سے گھر آ کر جو کمرہ بند کر کے لیٹی تھی، شام کو میری بھابھی نے دروازہ زور زور سے کھٹکھٹا کر مجھے اٹھایا۔

"جلدی سے نہا دھو کر آ جاؤ ڈرائنگ روم میں امی بلا رہی ہیں۔" وہ خود ایمرجنسی میں تھیں' پیغام دے کر میرا جواب لیے بغیر چلی گئیں میں غصے میں دروازہ بھیڑ کر پھر بیڈ پر آ کر لیٹ گئی۔

"ارے میری بنو! کیا ابھی سے مایوں بیٹھ گئیں اٹھ کر کم از کم آ کر اپنے بے چارے سسرالیوں سے مل تو لو۔"

رشنا کی کھلی ہوئی آواز سن کر اچھل ہی تو گئی تھی۔

اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ تو میرے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا' میں اپنے خوابوں کے سچے ہونے کے بارے میں اس قدر مشکوک تھی کہ کبھی کھل کر قبولیت کی دعا مانگی نہ انہیں

مجسم کسی خواب میں دیکھ سکی۔

مگر ہمیں پیدا کرنے والا تو ہماری شہ رگ سے بھی زیادہ ہم سے قریب ہے تو پھر کیسے ممکن ہے اسے ہمارے دل کی لگن پتا نہ ہو ہمارے خوابوں ہماری بن مانگی مگر بے تاب دعاؤں کا علم نہ ہو۔

سو میرے ساتھ بھی یہی ہوا بن مانگی دعائیں میری جھولی میں تعبیر بن کر آ گری تھیں، اس میں کسی کی کاوش کسی کی کوشش تھی' نہ مجھے اس کی جستجو تھی نہ جاننے کی آرزو۔

البتہ ثروت بھابھی نے اس رشتے میں اچھے خاصے روڑے اٹکانے کی کوشش کی کہ وہ اپنی کسی کزن کو دیورانی بنا کر لانا چاہتی تھیں' مگر تقدیر کے لکھے پر کس کا زور چلا ہے۔

میری بے قراریاں تھیں کہ امی کی دعائیں اور وظیفے یا کسی صفیہ آپی کی کوششیں یا رشنا کا کوئی ہاتھ مگر ٹھیک سات ماہ میں دلہن بن کر اس کے گھر میں آ چکی تھی، جس کو پہلی نظر دیکھتے ہی میرے دل نے چپکے سے اس میں بسنے کی آرزو کی تھی۔

ہے نا عجیب سی بات کہ جو چیز ہمارے مقدر میں ان مٹ تحریر ہوتی ہے' وہ نہ جانے کیسے ہمارے دل سے ہماری طبیعت سے خود بخود میل کھانے لگتی ہے' دل ادھر ہی کو مائل ہونے لگتا ہے۔

جیسے اس گھر کو پہلی نظر میں' میں نے دل سے سراہا تھا اور کہیں اپنے دل میں طے کیا تھا کہ اگر میرا گھر مستقبل میں ہوگا تو وہ ایسا ہی ہوگا جدید اسٹائلش اور پھولوں پودوں سے ڈھکا ہوا۔

پھر رشنا کا پرخلوص ساتھ اس کی دوستی کی طرف کیسے پہلے ہی دن میرا دل لپکا تھا اور سب سے بڑھ کر اظہر ...... اجو...... اونہوں...... میں نے سختی سے پہلی رات اجو ...... اور انہوں...... اظہر کو اور بعد میں رشنا سے کہہ دیا تھا کہ اب انہیں کوئی "اجو" نہ کہے مجھے پسند نہیں اور رشنا تو یوں بھی آنکھیں بند کر کے میری ہر بات مانتی تھی اور میرے تو یہ گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس کا بھائی جسے پہلی نظر میں پسند تو کر چکی تھی مگر تھوڑا احمق تھوڑا بدھو شرمیلا گھبرایا جس سے میں کچھ خائف بھی تھی' پہلی ہی رات اپنے دل میں چھپی میری محبت کے کیسے ان کہے قصے بیان کرنے لگا کہ مجھے اپنے جذبے اس کی شدت کے سامنے ہیچ محسوس ہونے لگے ہیں اس کی محبت میں پور پور ڈوبی تھی اور وہ سینے تک میری چاہت میں غرق تھا۔

محبت کی سلطنت کا تخت و تاج پہلی ہی رات اس نے میری جھولی میں ڈال دیا تھا۔

میں کیسی خوش نصیب تھی' کیسی بھاگوان جیسے بغیر کسی خاص بڑے نیک عمل کے ایسا اچھا شاندار

انعام ملا تھا کہ میرے پیر زمین پر نہیں ٹکتے تھے' بس ہواؤں ہی میں اڑی جا رہی تھی۔

ثروت بھابھی کے ماتھے پر کچھ بل تھے مگر مجھے ان "بلوں" کی نہ پہلے پروا تھی نہ اب...... اب تو میں اظہر کے دل کی ملکہ ہی نہیں' اس گھر میں ان کی برابر کی شریک تھی اور سب سے بڑھ کر رشنا جیسی بے ضرر نند کا مہرہ بھی میری جیب میں تھا۔ مجھے یوں لگتا تھا جیسے ساری دنیا میری مٹھی میں آ گئی ہو اور اس میں کوئی جھوٹ بھی نہیں تھا' میں خوش تھی بے حد خوش! میرے دل نے جو چاہا سو پا لیا مجھ سے بڑھ کر خوش نصیب اور کون ہوگا؟

☆

دن مہینوں میں مہینے سالوں میں یوں ڈھلتے چلے گئے کہ ان کے گزرنے کا نہ ان کے ڈھلنے کا مجھے کچھ احساس ہوا' نہ میں نے کوئی حساب رکھا اور سچ پوچھیں تو حساب رکھنے کا تو میرے پاس ٹائم تھا بھی نہیں۔ شادی کے ٹھیک تیرہ مہینوں بعد شہیر اور معیز ٹوئنز کی شکل میں میری گود میں تھے۔ قدرت نے میرے لیے خوشیاں بھی بونس کی شکل میں جمع کر رکھی تھیں' اور اب وہ پے در پے مجھے مل رہی تھیں۔

امی تو ہمہ وقت میری بیٹی کو نظر نہ لگ جائے۔ اللہ میری بیٹی کو نظر بد سے بچائے کے وظائف کرتی رہتیں۔ ان کی طرف جاتی یا وہ میری طرف آتیں کبھی پھٹکری توے پر جلا کر اس کا پتلا بنتے دیکھ کر کسی حاسد سے تشبیہ دیتے ہوئے میری ازدواجی زندگی کی نظر اتارتیں تو کبھی سرخ مرچیں جلاتیں میں ان کی وہمی شکی طبیعت کا ہنس ہنس کر مذاق اڑاتی مگر دل ہی دل میں خود بھی اپنی خوشیوں کو نظر نہ لگ جانے کی دعائیں مانگتی رہتی۔ شہیر اور معیز کے بعد کم از کم چار سال کا وقفہ کرنا چاہتی تھی مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

وہ دونوں ابھی ڈیڑھ دو سال کے تھے کہ رمشا میری گود میں آ گئی۔ کتنا لڑی تھی میں اظہر سے اور پھر ہم دونوں نے اس بات کا پکا بندوبست کیا کہ یہ تین سے چار نہ ہونے پائیں مگر...... اف ان تینوں نے مجھے تگنی کا ناچ نچا دیا تھا۔

سوچتی ہوں جو رشنا میرا ساتھ نہ دیتی تو جانے میں پاگل سی ہو جاتی اگرچہ صفائی کے لیے اور کپڑے دھونے کے لیے الگ الگ ماسیاں آتی تھیں مگر ایک تو ان کے نخرے پھر آئے دن کی چھٹیاں...... گھر کے سارے ہی کام ضروری ہوتے ہیں کہ ایک سے بھی فرار ممکن نہیں' ایسے میں ان تینوں میں سے کوئی بیمار پڑ جاتا تو میری جان عذاب میں آ جاتی۔

ثروت بھابھی تو دو سال پہلے ہی اوپر شفٹ ہو کر اپنا کچن علیحدہ کر چکی تھیں اس لیے اپنا

کچن گھر کے سارے کام پھر تینوں بچوں کو سنبھالنا لوہے کے چنے چبانے کے مترادف تھا۔

رشنا نے جاب رکھی تھی' اسکول سے آتے ہی وہ پہلے میرے ساتھ کچن کا کام کرواتی ماسی کوئی چھٹی پر ہوتی تو صفائی یا کپڑوں کا کام کرواتی بچوں کے کپڑے بھی تو روز ہی دن میں بے شمار گندے ہو جاتے تھے پھر استری کا ڈھیر اور نہ جانے کیا کیا۔

رشنا اچھی تو بہت تھی مددگار مگر اس کی ہیسنی عادتیں مجھے اب سخت زہر لگنے لگی تھیں' کام کے انبار لگے ہوتے اور وہ چپکے سے میری نظر بچا کر اوپر ثروت بھابھی کی طرف چلی جاتی تو گھنٹوں نیچے نہ اترتی بلکہ اکثر کیا روز ہی ان کا رات کا کھانا وہی پکا کر آتی تھی' صرف کھانا کیا کپڑے دھونا استری کرنا بچوں کو پڑھانا بھابھی گھر پر نہ ہوں تو ان کو سنبھالنا سب اس کے ذمہ ہوتا اور وہ یوں ان کے ساتھ گھل مل کر کام میں جتی رہتی' جیسے وہی اس کی سب سے بڑی ہمدرد ہیں اور میں غیر......

اب تو وہ کبھی مجھ سے اپنے دل کی کوئی بات نہیں کرتی تھی ساتھ ساتھ کام بھی کر رہے ہوتے تو بس ہی روزانہ کی سرسری باتیں یا بچوں کی باتیں...... وہ تو اسکول کی بھی کوئی بات مجھ سے نہیں کرتی تھی' اگرچہ اس نے وہاں ایک دوست بنا ہی لی تھیں۔

رشتہ اس کا اب بھولے سے آجائے تو آجائے ورنہ تو جیسے کسی نو کوئی دلچسپی ہی نہیں رہی تھی' چار سال تو میری شادی کو ہونے آئے تھے۔ چھبیسویں سال میں وہ لگ چکی تھی اور مسلسل چپ گپ رہنے سے اس کے چہرے پر کیسا پکا پن سا آ گیا تھا' جیسے کسی ستر برس کی بڑھیا کا چہرہ ہو۔

وہ کسی مشین کی طرح کام میں لگی رہتی فارغ ہوتی تو اپنے کمرے میں گھس جاتی اور ایسی فراغت تو اسے رات گیارہ بجے کے بعد ہی ملتی تھی۔

''تم جاب چھوڑ دو' تھک جاتی ہو گی۔''

شروع شروع میں جب شہیر اور معیز کو سنبھالنا میرے لیے ناممکن سا تھا میں نے اس کی ہمدردی میں اسے یہ مشورہ دیا تھا جسے اس نے رد کر دیا تھا دوبارہ کسی نے اسے یہ مشورہ نہیں دیا یوں بھی اسے اب اچھی خاصی تنخواہ ملنے لگ گئی تھی' سینئر ٹیچر کی سیٹ جو مل گئی تھی اور اس کی تنخواہ سے اکثر بچوں کے قیمتی کپڑے کھلونے جوتے آجاتے یا وہ اپنا خرچ نکال لیتی یوں کسی پر بوجھ بھی نہیں تھی۔

''ہمارا تین روزہ ورکشاپ ہے اسلام آباد میں اور غوری صاحب نے میرا نام لسٹ

میں ڈال دیا ہے۔''

اس رات بائے چانس سب اکٹھے تھے' جب اس نے گویا دونوں بھائیوں کو اطلاع دی دونوں نے کوئی تبصرہ نہیں کیا البتہ ثروت بھابھی نے کچھ معنی خیز انداز میں پہلے اسے اور پھر مجھے دیکھا۔

''ایسی کون سی ورک شاپ ہے' رہنے دو تم وہ بھی تین دنوں کے لیے۔'' میں نے فوراً کہا۔

''جانے دو بھئی ذرا رشنا کی بھی آؤٹنگ ہو جائے گی اور تین دنوں کی کیا بات ہے۔''

اظہر صاحب نے حاتم طائی کی قبر پر لات ماری' میں نے ایک دو جملے معترضہ کہے کچھ ثروت بھابھی نے بھی اختلاف کیا مگر کوئی خاص دلیل تھی نہیں اس لیے رشنا کو جانے کی اجازت مل گئی کیونکہ ان ہی تاریخوں میں اظہر کو بھی اسلام آباد جانا تھا' سو رشنا کا جانا اظہر کے ساتھ طے پایا گیا۔

وہ دونوں اکٹھے ہی تین دن بعد واپس آئے تھے۔

میں مسلسل کام کے بوجھ سے ان تین دنوں میں پاگل سی ہو گئی تھی۔ ماسی نے بھی ان تین دنوں میں ایک چھٹی مار لی تھی۔ رشنا کچھ اور بھی چپ گم صم سی ہو گئی تھی، دو ایک بار ٹوکا بولی کچھ نہیں اور اس کی چپ کا راز اگلے ہفتے کھل گیا۔

غوری صاحب کے کزن کا پرپوزل آیا تھا رشنا کے لیے جس کے اسلام آباد مری اور شمالی علاقہ جات میں تین ہوٹلز تھے۔ ہوٹل مینجمنٹ میں اس نے ماسٹر کے علاوہ ڈپلومے بھی لے رکھے تھے' دیکھنے میں گڈ لکنگ اور چارمنگ تھا کہ پہلی نظر میں مَیں بھی دھک سے رہ گئی' بالکل اسی طرح جیسے اظہر کو دیکھ کر رہ گئی تھی۔

''کیا اب رشنا کے لیے کسی ڈھابے والے کا رشتہ قبولا جائے گا ہم لوگوں کا کوئی اسٹیٹس کوئی اسٹینڈرڈ نہیں۔''

ان دونوں بھائیوں کی خوشی کو میرے ایک ہی جملہ اعتراض نے بھک سے اڑا دیا تھا' پھر ثروت بھابھی کی چہ میگوئی۔

''یہ رشنا کا اسلام آباد جانا، وہیں جواد احمد کا ملنا اور پرپوزل بھیجنا بھی وہ غوری صاحب کا کزن ہے' آنا جانا تو ہو گا ان کے اسکول میں، رشتہ کر دیا تو سوچیں لوگ کہاں تک نہیں سوچیں گے اور کیا کیا باتیں نہیں بنائیں گے، اتنی عزت اور غیرت کی پروا تو ہونی چاہیے۔''

ثروت بھابھی کا اعتراض مجھ سے بھی وزنی تھا' سو خاموشی کا ایک لمبا وقفہ آ گیا۔

اس دوران کئی بار مجھے لگا رشنا کی آنکھوں کے نیلگوں فرش پر سرخ ڈوروں سے کسی نے کڑھائی کر دی ہو، اس کے چہرے پر ایسی لالی اور سفیدی کھلی تھی جیسے وہ عرق گلاب اور نمکین پانیوں سے منہ دھو کر آئی ہو۔

"مظلوم بننے کا شوق ہے اور کیسی گھنی جو دل کی بات کرتی ہو، خود ہی آنکھ مٹکا کر کے اب مظلوم بنی پھرتی ہے۔"

میرے دل میں ان چاہا سا تنفر بھر گیا تھا۔

ان ہی دنوں میری کزن ناجیہ تین دن کے لیے کراچی سے آئی اس کے ہسبنڈ کو یہاں کوئی کام تھا۔

اس کے آنے کی مجھے ایسی خوشی ہوئی جیسے کوئی برسوں بعد بچھڑا اپنا آن ملا ہو ہم دونوں نے پرائمری تک اکٹھے پڑھا تھا' یعنی جہاں ابا کا تبادلہ ہوا عموماً وہیں خالو بھی بھیج دیے جاتے' یوں ہم دونوں اتفاقاً ہر کلاس میں اکٹھے ہو جاتے اور ہم لاہور آ گئے تھے۔ اب جیسے بچپن لڑکپن کے بھولے بسرے دنوں کو یاد کرنے کا موقع ہمیں مل گیا تھا' اس کا میاں صبح اپنے کام سے نکل جاتا اور ہم دونوں اپنے اپنے بچے اور گھر کے سارے کام ایک طرح سے رشنا پر ڈال کر جو ناشتے کے بعد چائے کے مگ لے کر بیٹھتیں تو عموماً دوپہر کے کھانے کی خوشبو پر ہی اٹھتیں' جو کچن میں تیار ہونے کے آخری مراحل میں ہوتا۔

میں نے ناجیہ اور اس کے بچوں کے لیے بڑے اچھے گفٹ خریدے' وہ بھی میرے لیے اور میرے بچوں اور اظہر کے لیے تحائف لائی تھی سو ریٹرن تو لازمی تھا۔

صبح اس کو چلے جانا تھا' نو بجے کی فلائیٹ تھی آج اس کی ادھر آخری رات تھی اور ہمیں یوں لگ رہا تھا جیسے ابھی کئی جنم کی باتیں ادھوری ہیں۔ بچوں کو اپنے اپنے میاؤں کے حوالے کر کے ہم دونوں اوپر ٹیرس پر چلے آئے۔

"رشنا! زبردست سی چائے کے دو کپ تو ذرا اوپر دے جانا۔"

میں اوپر آتے ہوئے رشنا سے کہہ آئی تھی' جو کچن میں ڈنر کے بعد ہونے والے برتنوں کا انبار دھونے میں لگی تھی' وہ دس منٹ میں ہمیں چائے اوپر پہنچا گئی۔

"اف تین دن تو جیسے پر لگا کر اڑ گئے تمہیں کم از کم ہفتہ بھر کے لیے تو آنا چاہیے تھا۔"

میں نے فضا میں گہرا سانس لیتے ہوئے کہا' آج موسم خلاف معمول اچھا تھا' نرم سی

ہوا چل رہی تھی جس میں ٹھنڈک بھی تھی۔

"اب تم آنا کراچی اور کم از کم پندرہ دن کے لیے۔"

اس نے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔

"تم تین دنوں کے لیے اور میں پندرہ دنوں کے لیے واہ۔"

میں نے احتجاجاً کہا۔

"کامران بھائی کو بھیج دو' تم ہفتہ بعد چلی جانا۔"

"ناممکن۔"

"یار! چائے بڑی زبردست ہے۔"

"ہوں۔"

میں نے بھی تائید کی۔

"عافیہ! رشنا تمہاری وہی دوست ہے نا جو کالج میں تھی اور تم ہمیشہ مجھے خط میں فون پر کہا کرتی تھیں کہ تمہیں فخر ہے دنیا میں تمہارا ایک ایسا مخلص اور دل سے محبت کرنے والا دوست بھی ہے' جو ہر مشکل گھڑی میں تمہاری ڈھارس بن سکتا ہے۔"

ناجیہ نے اتنے اچانک کہا کہ میں فوراً کوئی جواب ہی نہیں دے سکی۔

"او...... تم بھی اس سے ایسی ہی بے لوث دوستی اور محبت کی دعوے دار تھیں کہ تم دنیا کی اس کی واحد خیر خواہ اور...... یہ کہ رشنا کی بھابھی دنیا کی عجیب ترین عورت ہے' دوغلی اور خود غرض اپنے مفاد کے لیے اس سے کسی غلام اور لونڈی کی طرح بیگار لینے والی اور دنیا کے سامنے ایسے جیسے اس سے بڑی رشنا کی ہمدرد اور کوئی ہے نہیں اور اگر تمہیں دنیا میں اگر کسی شخص کو مارنے کی اجازت ہوتی تو وہ تم رشنا کی بھابھی کو مار کر اپنے اس حق کو استعمال کرتیں کہ وہ اس بے زبان بھولی لڑکی کو جس طرح سے ایکسپلائٹ کر رہی ہیں اسی سلوک کی مستحق ہیں۔"

ناجیہ سانس لیے بغیر کوئی موقع دیے بغیر بولتی چلی جا رہی تھی۔

"اور رشنا بے زبان جانور کی طرح اس کے ہر فریب کو محض بھائیوں کی پناہ اور گھر کی چار دیواری کی خاطر سہے جا رہی ہے اور احتجاج کے لیے اس کے منہ پر ایک جملہ نہیں آیا' اس کی بھابھی جو بظاہر اس کی سب سے بڑی خیر خواہ بنتی ہیں اسے پھنسانے کے لیے آئے دن خاص مہمانوں کی دھوم مچائے رکھتی ہیں کہ لوگوں کو پتا چلے کہ وہ اس کی کتنی فکر کرتی ہیں۔ یہی سب کچھ تم کہا کرتی تھیں نا اپنی اس اکلوتی قابل رحم حالات میں صابر شاکر رہ کر کسی پر ظاہر

کیے بغیر بھائیوں کی عزت سنبھال کر بیٹھنے والی' رشنا کے بارے میں۔''

وہ رکی۔

اور اب یہاں آکر تین دن رہنے کے بعد مجھے ایسے لگ رہا تھا رشنا کی بھابھی، ثروت بھابھی نہیں تم تھیں۔ اگر وہ ایسی تھیں تو تم' اس منصب پر آتے ہی ان جیسی بن گئیں، یاد ہے تم نے آخری بار مایوں میں بیٹھے مجھے کیا کہا تھا کہ ناجیہ! شاید قدرت نے رشنا کے لیے کسی آسان زندگی کا فیصلہ کرلیا ہے جو میں اس کی بھابھی بن کر جا رہی ہوں' دیکھنا میں کیسے اس کی زندگی کو بدل کر رکھ دوں گی۔

اور میری دوست! مجھے بہت افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے کہ تم نے اس کی زندگی کو واقعی ''بدل'' کر رکھ دیا ہے۔ پہلے اسے ایک بھابھی کی طرف سے دکھ ملتے تھے تم نے ان کو ڈبل کر دیا اور اس سے دکھ سکھ کہنے والی ''دوست'' کو بھی چھین لیا۔

کیا تمہیں اس کی آنکھوں کی ویرانی اور چہرے کی وحشت نظر نہیں آتی اپنے کاموں کے انبار' اپنے مفاد اپنی ضروریات اور خود غرضی کے آگے شاید وہ تمہیں ایک مسیحی صورت لگتی ہے' جو کبھی تمہارا دم بھرتی ہے تو کبھی ثروت بھابھی کا...... کبھی سوچا تم نے، کس طرح اس کی زندگی کو ہزار مشکلوں سے دوچار کر دیا ہے اور اس کے لیے فرار کی ایک بھی راہ نہیں چھوڑی۔

معمولی رشتہ تم لوگ ''رشنا'' کے قابل نہیں کہہ کر ٹھکرا دیتے ہو اور خاص رشتے جیسا تم نے ڈھابے والے کا رشتہ کہہ کر شاید کسی حسد یا رقابت میں آکر مسترد کروایا کہ یہ معمولی بے وقوف بدھو سی رشنا ایک دم سے چھ ہوٹلوں کے مالک خوبرو ویل ایجوکیٹڈ شخص کی بیوی بن کر کیسے تم سے برتر ہو جائے گی' یہ تو تم برداشت نہیں کر سکو گی۔

میں تمہاری دوست ہوں عافیہ! اور یہ باتیں بہت سخت ہیں اور کوئی دوست سے نہیں کہتا اگر وہ اس سے مخلص نہیں...... میں تمہیں بہت اچھا بہت نیک فطرت' حساس اور دوسروں کی پست حالت پر کڑھنے اور ان کی بہتری کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے والا سمجھتی تھی مگر تم تو رشنا کی بھابھی بنتے ہی اپنا اصلی چہرہ بھی مسخ کر بیٹھیں۔

میں تم سے یہ سب کبھی نہ کہتی اگر میرے دل میں تمہاری محبت نہ ہوتی ویسی عارضی اور دکھاوے کی محبت نہیں' جیسی تم رشنا سے کرتی تھیں' یہ چلتی پھرتی آرزوؤں کی زندہ لاش ذرا خود کو اس جگہ پر رکھ کر سوچو اور ذرا اگر تمہیں برا نہ لگے دل پر ہاتھ رکھو اور سوچو خدانخواستہ اگر رمشا کے ساتھ شہیر اور معیز کی بیویاں ایسا سلوک کریں گی تو تم پر......''

''پلیز چپ کر جاؤ۔''

میں روتے روتے پھٹی ہوئی آواز میں بولی تھی۔

''عافیہ میری دوست میں تمہیں مظلوم کی آہ سے بچانا چاہتی ہوں' ہم خود کو معمولی برائیوں میں انوالو کرتے اتنے بے خبر ہو جاتے ہیں کہ پھر ہمیں اپنے وجود میں پنجے گاڑ کر بیٹھی یہ برائیاں برائیاں ہی نہیں لگتیں' اپنے وجود کا حصہ لگنے لگتی ہیں' تمہیں جو برائیاں کل تک ثروت بھابھی میں نظر آتی تھیں' جنہیں تم دیکھ کر کڑھا کرتی تھیں' آج تم ان کا چلتا پھرتا اشتہار بن چکی ہو اور تمہیں اس کا احساس تک نہیں۔

دوستی کے رشتے کو تو شاید تم نبھانے کے قابل نہیں' ایک بھاوج کے رشتے کی لاج رکھ لو...... ورنہ شاید رشنا کی خاموش ریاضتیں اس کی ویران راتوں کی سسکیاں خدانہ کرے تمہاری اس ہنستی بستی جنت کو...... پلیز......''

ناجیہ میرا کندھا ہلا رہی تھی اور میں روئے جا رہی تھی یہ کیا ہوا کس نے میرے آگے اتنا سچا کھرا آئینہ رکھ دیا ہے اور اس آئینے میں نظر آنے والے بھیانک عکس کا پرتو کیا میں ہو سکتی ہوں' مجھے اس آئینے میں دیکھنے سے خوف آ رہا تھا۔

ہم اپنے پیمانے صرف اپنے لیے سیٹ کرتے ہیں جب دوسروں کے بارے میں سوچنا ہوں تو ہم جھٹ سے پیمانے بدل لیتے ہیں' میں نے بھی پیمانے بدل لیے تھے' اپنے لیے اور رشنا کے لیے اور ناجیہ ابھی بھی کچھ کہہ رہی تھی مگر مجھے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا' میں تو بس روتے ہوئے اس بھیانک عکس کو مٹانے کی کوشش میں لگی تھی' جو اس کے سامنے آئینے میں جڑا تھا اور مجھے یہ بھی پتا ہے یہ عکس آنسوؤں سے نہیں مٹے گا بلکہ جس چیز سے مٹے گا اس کا بھی مجھے علم ہو چکا ہے۔

مجھے اب ناجیہ سے کوئی عہد نہیں باندھنا نہ خود سے...... بلکہ اب مجھے کوئی زبانی یا خاموش عہد نہیں کرنا...... بلکہ عملی طور پر کچھ کرنا ہے کچھ ایسا کہ رشنا کی آنکھوں کے نیلگوں فرش پر مجھے دوبارہ سرخ ڈوروں والی کڑھائی کبھی نظر نہ آئے' مجھے صرف اس کا اہتمام کرنا ہے، اور مجھے یقین ہے اس میں اب اور دیر نہیں ہوگی۔

❁

پرکھ

"کیا ہوا امی؟"

وہ سوکھے ہوئے کپڑوں کا ڈھیر ٹوکری میں لادے لاؤنج سے گزر رہی تھی، جب امی کو اردگرد سے بے خبر سر جھکائے کسی گہری سوچ میں ڈوبے دیکھ کر وہ ٹھٹھک کر رک گئی تھی۔ ٹوکری ٹیبل پر رکھتے ہوئے تشویش بھرے انداز میں پوچھنے لگی۔ ابھی وہ کپڑے لینے ٹیرس پر گئی تھی تو وہ فون پر کسی سے بات کر رہی تھیں۔ نامعلوم کون تھا، کیا بات ہوئی جو وہ ایسی پریشان گم صم سی بیٹھی تھیں۔

"آں!" انہوں نے ایک گہرا سانس لیتے ہوئے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ "نہیں کچھ نہیں۔" تین حرفی جواب دے کر ایک اور گہرا سانس لیا۔

"کس سے بات کر رہی تھیں ابھی آپ؟" اسے کریدنے کی عادت تو نہیں تھی مگر اس وقت ان کی پریشان صورت اس کے کمزور سے دل کو ہراساں کر گئی تھی۔

"کوئی نہیں، کپڑے سوکھ گئے تھے؟" ان کا انداز صاف ٹالنے والا تھا۔

"جی، اتنی تو تیز دھوپ تھی آج۔ اچھا خاصا موسم بدل گیا ہے، دو تین گھنٹوں میں سوکھ گئے۔ چائے پئیں گی آپ؟" اس نے ٹوکری اٹھاتے ہوئے پوچھا۔ وہ جان گئی تھی کہ وہ اب نہیں بتائیں گی۔

"نہیں، اب مغرب کی اذان ہونے والی ہے اور تم بھی نہیں پینا۔ ابھی گھنٹہ بھر پہلے تو پی ہے، چائے پی پی کر رنگ جلاتی رہتی ہو۔ چولہا بند کر دیا تھا ہنڈیا کے نیچے؟"

وہ بظاہر اس سے بات کر رہی تھیں مگر ان کا چہرہ ابھی بھی اسی اضطراب کی چغلی کھا

رہا تھا، جو چند لمحے پہلے ان کے پورے چہرے پر گھٹا بن کر چھایا ہوا تھا۔

"جی چاہ رہا تھا، نماز پڑھ کر بناؤں گی۔" وہ اٹھ گئی۔ چائے کے بغیر اس سے رہا نہیں جاتا تھا اور امی منع کیے بغیر نہیں رہتی تھیں اور آج کل یہ منا ہی کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی تھی۔

"اور سنو" انہوں نے اسے جاتے جاتے پھر آواز دی۔ وہ رُک کر انہیں دیکھنے لگی۔

"اب کپڑے نہ استری کرنے لگ جانا۔ صبح سے کام میں لگی ہوئی ہو۔ تین گھنٹے تو مشین میں لگ گئے۔ ابھی تمہارے ابو آنے والے ہیں تو روٹیاں بھی پکانی ہوں گی۔ وہ دونوں تو بس کالج سے آ کر ہم پر جیسے احسان کرتی ہیں۔ کتابوں کے سوا اور کوئی غرض نہیں۔" وہ آخر میں بڑبڑانے لگیں۔

"امی! صنوبر کے ایگزام میں اب دن ہی کتنے رہ گئے ہیں اور ثوبیہ کا بھی سیکنڈ ائیر فائنل ہے۔ گھر کے کام ہو تو جاتے ہیں۔ آپ ہیں، میں ہوں پھر صبح سلامت بی بی آ جاتی ہے، اور کام کون سے اتنے زیادہ ہوتے ہیں۔ بس تھوڑے سے کپڑے اب استری کر لیتی ہوں۔ باقی صبح کر لوں گی۔"

امی نے محبت لٹاتی نظروں سے اتنی اچھی سمجھ دار، ہمدرد طبیعت کو بیٹی کو دیکھا۔ وہ جب سے گریجویشن کر کے بعد گھر بیٹھی تھی اسی طرح سارے گھر کی ذمہ داری سنبھالے ہوئے تھی اور اب تو اس کے جانے کا سوچ کر ہی ان کی طبیعت پریشان ہونے لگتی تھی۔

"اس کے بعد سب کام کیسے ہوں گے بھلا؟ اللہ مالک ہے۔" پھر خود ہی دل کو تسلی بھی دیتیں۔

"بس یہ صنوبر دے لے امتحان، لگاتی ہوں اسے بھی گھر کے کاموں میں۔ یہ عدیل ابھی تک نہیں آیا میچ کھیل کر۔ اس کے ابو گھر آ گئے تو ہنگامہ کر دیں گے۔ میچ کی خاطر اس نے اکیڈمی سے چھٹی کی ہے۔ انہیں پتا چل گیا تو بس ...... پتا نہیں اس لڑکے کو کھیل کا کیا جنون ہے۔ امتحان سر پر ہیں۔ ہزاروں روپے باپ نے اکیڈمی کے ایڈمیشن اور ٹیوشن فیس پر لگا دیے اور اسے پرواہ ہی نہیں۔" وہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔ مغرب کی اذان ہونے لگی تھی۔

"ہو جائے گی پرواہ امی! ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے؟"

"عمر نہ سہی، امتحان تو اہم ہے نا! میٹرک کا امتحان یونہی تھوڑا ہوتا ہے تم بہنوں نے ماشاء اللہ فرسٹ ڈویژن لی تھی۔ اس امتحان میں، اور یہ لڑکا ان دو سالوں میں بھی بس پاس ہی ہوتا رہا اور اب سالانہ امتحان ہیں۔ دیکھو، کیا تیر مارتا ہے۔"

''ابو نے اسے یہ کہہ کر اور لاپروا کر دیا کہ چاہے ایم اے بھی کر لے، سنبھالنی تو اسے ابو کی دکان ہی ہے۔ بس اسی دن سے وہ بے فکر ہو گیا ہے کہ فیل ہوں یا پاس، کیا فرق پڑے گا۔ بزنس تو مل ہی جائے گا پیر جمانے کے لیے۔''

''ہاں بس، اپنی جلد بازیاں ہیں تمہارے ابو کی۔ لے کر اچھے بھلے محنتی لڑکے کو پڑھائی سے اکھاڑ دیا۔ پہلے کہتا تھا امی مجھے انجینئر بننا ہے آٹھویں میں نہیں بورڈ کے امتحان میں تیسری پوزیشن لی! تمہارے ابو نے اس کا ذہن ہی خراب کر دیا ہے، چاہے کاروبار ہو یا عملی زندگی، دونوں کے لیے تعلیم کتنی ضروری ہے۔ انہیں کون سمجھائے۔ خود چوتھی جماعت سے بھاگ کر جو باپ کی دکان سنبھالی تو سمجھتے ہیں یہ بھی دسویں کر کے دکان پر بیٹھ جائے گا۔ ان کے حساب سے تو اس نے بہت پڑھ لیا۔ یہ نہیں دیکھتے آج کل زمانہ کدھر جا رہا ہے ہر طرف تعلیم کے چرچے ہیں اور یہ بس دکان کی گدی کو ہی تخت نشینی سمجھتے ہیں جس نے یہ گدی سنبھالی، دنیا فتح کر لی اس نے۔'' وہ بڑبڑاتے ہوئے وضو کرنے چل دی تھیں۔ سمیعہ نے کپڑوں کی ٹوکری آئرن اسٹینڈ کے پاس رکھی اور کچن کی طرف آ گئی۔

صنوبر چائے کا پانی رکھ رہی تھی۔

''ایک کپ میرے لیے بھی۔'' اس نے دروازے میں ہی کھڑے ہو کر فرمائشی انداز میں کہا۔

''بنا چکی ہوں بس۔ اب خود آ کر بنا لو۔'' وہ بے مروتی سے بولی۔

''پلیز بہنا! تھوڑے کپڑے پریس ہو جائیں گے ورنہ امی کہہ رہی تھیں صنوبر سے کہو، ابو کے کپڑے نکال کر پریس کر دے۔'' اس نے فوراً بات گھڑی۔ صنوبر نے گھور کر اسے دیکھا۔

''بلیک میلنگ نہیں چلے گی۔''

''پلیز۔'' اس نے ناک سکوڑ کر ذرا منت سے کہا تو صنوبر نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''نماز پڑھ لو، لے کر آ رہی ہوں۔''

''تھینک یو۔'' وہ کہتے ہوئے وضو کرنے چل دی۔

وضو کرتے ہوئے اس کی نظریں بے اختیار اپنی دونوں ہتھیلیوں کی بجھتی ہوئی مدھم سی پیلے رنگ کی مہندی پر پڑی۔ دل ایک بار پھر زور سے دھڑکا تھا۔ اس نے چہرے پر پھسلتے پانی کے قطروں کو صاف کرتے ہوئے بائیں ہاتھ کی تیسری انگلی کو پلٹ کر دیکھا۔

ریڈ روبی وائٹ گولڈ کے بیچ ایسے مسکرا رہا تھا کہ بے اختیار جھینپتے ہوئے اس نے

چہرے پر پانی کے چھپکے مارنے شروع کر دیے۔

☆

ایک پرانا موسم لوٹا دیا جھری پروائی بھی
میرے ساتھ چلا آیا آپ کا ایک سودائی بھی
ایسا تو کم ہی ہوتا ہے وہ بھی ہو تنہائی بھی
خامشی کا حاصل بھی اک لمبی سی خامشی بھی

جگجیت سنگھ کی آواز مدھم سروں کے ساتھ اس کے گیان و دھیان کو کسی اور ہی سمت اڑائے لیے جا رہی تھی۔ ہاتھ تیزی سے کپڑے استری کر رہے تھے۔ کپڑوں کے گرم ہوتے ریشوں سے اٹھتا ہلکا سا دھواں اس کا سر کچھ بوجھل کر رہا تھا مگر غزل کے بول اور جگجیت کی بھاری آواز جیسے ٹھہرے پانیوں میں ہلکے ہلکے سے دائرے بنا رہے تھے۔ خالی ذہن کے ساتھ ان میٹھے بولوں میں کھوئی ہوئی تھی۔

امی اندر بیٹھی سبزی بنا رہی تھیں۔ ابھی ملازمہ صفائی کر گئی تھیں۔ ناشتے کے برتن صاف کرتے ہی وہ کل کے بچے باقی کپڑے پریس کرنے لگی تھی۔ کوئی بھی ادھورا نامکمل کام اسے بے چین کیے رکھتا تھا جب تک وہ پورا نہ ہو جاتا۔

''سمیعہ! گوشت فریزر سے نکال دیا تھا؟'' امی سبزی کی ٹوکری اٹھائے اس کے پاس سے گزرتے ہوئے کچن میں جا رہی تھیں۔

''جی امی! نکال دیا تھا اور آپ بس سبزی رکھ دیں اندر، میں کر لوں گی۔ دو چار ہی کپڑے رہ گئے ہیں۔''

اسے پتا تھا امی کچن میں جا کر کھانے کی تیاری شروع کر دیں گی۔ جب سے ان کا بی پی کا پرابلم ہوا تھا وہ انہیں کچن میں کام نہیں کرنے دیتی تھی۔

''میں ہنڈیا تو رکھ لوں چولہے پر...... یا تمہارا نشہ ٹوٹ رہا ہے چائے کے لیے وہ بنانی ہو گی۔'' وہ جاتے جاتے رک کر بولیں تو وہ بے اختیار مسکرا دی اور سر ہلا دیا۔

''بس کرو، مت اتنی چائے پیا کرو۔ اب تو تمہیں جوس اور فروٹ لینے چاہئیں زیادہ سے زیادہ۔'' وہ اپنے مخصوص انداز میں بولیں جو آج کل وہ زیادہ ہی اپنائے ہوئے تھیں۔

''اب کیا ہو گیا ہے بھلا؟ اور فروٹ اف...... پلیز امی! صرف ایک کپ چائے کا بنا دیں۔ باقی سب میں کر لوں گی۔'' وہ ہاتھ روک کر ملتجی لہجے میں بولی۔

"ہرگز نہیں، میں سیب کاٹ کر لاتی ہوں یا جوس نکال لاؤں۔"

"پلیز امی! سیب تو بندہ بڑھاپے میں کھاتا ہے جب ڈاکٹر...... اچھا رہنے دیں۔ ابھی تو میں نے ناشتہ کیا ہے۔"

وہ ان کی گھوری پر جملہ دانتوں تلے دبا کر پھر سے تیز تیز ہاتھ چلانے لگی۔

اسی وقت فون کی بیل بج اٹھی۔

"میں سوچ رہی تھی۔ آج صنوبر اور ثوبیہ آتی ہیں۔ کالج سے تو ہم دونوں ذرا بازار کا چکر لگالیں گے۔" وہ جیسے خود سے کہتی ہوئی فون ریسیو کرنے چل دیں۔

"اف! یہ بازار جانا بھی کتنا اسٹوپڈ کام ہے اور وہ بھی امی کے ساتھ۔ جہیز کی چادریں، رضائیاں، کمبل، برتن اور نہ جانے کیا کیا فضولیات...... صنوبر کو بھیج دوں گی۔ وہ ایسی شاپنگ بہت پُرجوش ہو کر کرتی ہے۔ امی گئیں...... اب چائے بن سکتی ہے۔"

امی فون ریسیو کرتے ہوئے صوفے پر ایزی ہو کر بیٹھ گئی تھیں یعنی لمبی بات کرنے کا ارادہ تھا اور چہرے کی مسکراہٹ بتا رہی تھی کہ کوئی پسندیدہ شخصیت ہے۔

وہ آہستہ سے سوچ آف کرتے ہوئے کچن میں چائے بنانے چل دی۔

"سمیعہ ادھر آؤ بیٹے!" وہ چائے مگ میں انڈیل رہی تھی جب امی کی پکار پر جلدی سے مگ آئرن اسٹینڈ کی سائیڈ پر رکھتے ہوئے ان کے پاس آگئی اور اشارے سے پوچھنے لگی "کون ہے" کیونکہ ریسیور ابھی بھی ان کے کان سے لگا تھا۔

"روبینہ کا فون ہے۔" انہوں نے ریسیور اسے تھماتے ہوئے آہستگی سے بتایا۔

پل بھر کو اس کا دل زور سے دھڑکا تھا اور ہاتھ ریسیور تھامنے میں متامل سے ہوئے تھے۔

"امی!" اس نے احتجاج بھرے انداز میں انہیں دیکھا۔

"کرلو بات۔" وہ پیار بھری گھرکی سے بولیں۔

"ہیلو السلام علیکم۔" اس نے بے زاری سے انداز میں کہا تھا، آواز کچھ اور بھی ڈوب سی گئی تھی۔ دوسری طرف اس کی ہونے والی نند چہکتی آواز میں جواب دے رہی تھی۔

"بھئی کیسی ہیں ہماری اکلوتی ہونے والی بھابھی جان! کبھی خود سے خیال نہیں آیا کہ آپا سے بات ہی کرلوں۔" وہ فوراً پیار جتاتے ہوئے بولیں۔ وہ جزبز سی ہو کر رہ گئی۔ امداد طلب نظروں سے پاس کھڑی امی کو دیکھا تو وہ رخ پھیر کر کچن کی طرف چلی گئیں۔

"جی بس، کام ہی اتنے ہوتے ہیں ٹائم......" وہ جان چھڑانے والے انداز میں

بولی اور بات ادھوری چھوڑ کر چپ کر گئی۔

"اونہوں، آخر ایسے کون سے کام آنٹی جان ہماری نازک بھابھی سے کرواتی ہیں کہ اسے ٹائم ہی نکالنا مشکل ہوتا ہے۔" وہ بھی بات پکڑنے کی ماسٹر تھیں پھر وہی جتانے والا انداز۔

"نہیں، ایسے کام تو کوئی نہیں بس آپ سنائیں کیسی طبیعت ہے آپ کی۔" اس نے بات بدلنے کی کوشش کی۔

"اللہ کا شکر ہے ہم تو اچھے بھلے ہیں۔ تمہارے منگیتر صاحب کو البتہ چین نہیں آرہا جب سے تصویریں اور مووی بھیجی ہے منگنی کی، ناک میں دم کر دیا ہے فون کر کر کے......" وہ ایک دم سے بولیں تو اس بار اس کا دل ہی زور سے نہیں دھڑکا تھا، ہاتھوں میں بھی پسینہ آگیا تھا اور کان تپنے لگے تھے۔ چور نظروں سے امی کا محل وقوع جانچنا چاہا مگر وہ کچن میں جا چکی تھیں۔

"بھئی سنی نہیں ہماری بات کیا؟" وہ پھر سے شوخ لہجے میں بولیں تو وہ کاٹتے ہوئے جواب سوچنے لگی۔

"آپ...... بچے تو اسکول گئے ہوں گے؟" اسے موضوع بدلنے کی ایک بار پھر کوشش کرنی پڑی۔

"ظاہر ہے، اس وقت ہی تو دو گھڑی کا سکون ملتا ہے کہ بندہ کسی سے بات کر سکے ورنہ بچے...... اللہ جزا دے ان اسکول والوں کو جو ان بے چین روحوں کو چند گھنٹوں کے لیے قابو میں کر لیتے ہیں۔ بھلے ہماری جیبیں فیسوں کے نام پر خالی کرالیتے ہیں۔ پوچھیں گے تم سے جب اپنے ایک دور ہو جائیں گے۔" وہ پھر اپنے پسندیدہ ٹاپک پر آگئیں۔

وہ ان کی بات سن کر پھر چپ سی ہوگئی۔

"افوہ سمیعہ! تم تو بھئی بہت ہی شرمیلی ہو ورنہ آج کل کی لڑکیاں قسم سے ایسی ہیں ادھر منگنی ہو ادھر منگیتر جیب میں آجائے۔ ایسے ادائیں ایسی باتیں کرتی ہیں اور لڑکے تو مانوں آج کل کے ویسے ہی باؤلے ہوئے پھرتے ہیں ان اداؤں کے۔ کم بخت اسی لیے تو یہاں......"

"اف کیسی کھلی باتیں کرتی ہیں یہ روبینہ باجی بھی، حد ہوگئی یعنی کہ......" وہ اپنی جگہ بل کھا کر رہ گئی۔

"اچھا سنو، شرم و حیا اچھی چیز ہے مگر آج کل کے زمانے میں اتنی شرم کہ بندہ لپٹا لپٹا یا ہی رہ جائے اور اگلا کسی اور طرف منہ کر جائے، تھوڑی بولڈنیس ہونا چاہیے اور پھر تم تو پڑھی لکھی ہو، کون سی جاہل پینڈو ہو، بھئی سچی بات ہے مجھے تو تمہاری یہی شرم و حیا اور معصومیت

بھائی تھی، جو ہزاروں لڑکیاں دیکھنے کے بعد بھی چند ایک میں بھی نہ مل سکی تھی، تمہارے گھر کے مہذب و مذہبی ماحول، تمہاری امی کا اور تمہارا سلیقہ، میں تو پہلی نظر میں ہی سب کچھ ڈن کر چکی تھی، پھر اللہ کا شکر ہے، شہروز کو بھی تم پسند آ گئیں اور میرا کام آسان ہو گیا ورنہ ان چار سالوں میں تو سمجھو میری جوتیاں گھس گئی تھیں اس کے لیے لڑکیاں دیکھ دیکھ کر۔''

اس نے دور پڑے چائے کے مگ کو دیکھا یقیناً چائے ٹھنڈی ہو چکی تھی، امی ایک بار آ کر اسے دیکھ گئی تھیں بلکہ نظروں میں بات مختصر کرنے کی، تنبیہہ بھی کر گئی تھیں مگر وہ کیا کرتی روبینہ بات سے بات نکالے جا رہی۔

''میری باتیں تمہیں بری تو نہیں لگ رہیں۔'' کتنی دیر بعد انہیں اپنے لگا تار اور بے تکا بولنے کا احساس ہوا تو پوچھنے لگیں۔

''نہیں۔'' ابھی دنیا سے مروّت عنقا نہیں ہونی چاہیے۔ اس کے دل نے سرد آہ بھری تھی۔

''میں لگاؤں گی دو چار دِنوں میں تمہاری طرف چکر بچے بھی ممانی سے ملنے کو بے چین ہیں اور مجھے تمہارا چوڑی کا ناپ بھی چاہیے تھا، ویسے تو بری میں کہنے کو صرف کپڑے اور زیور ہی ہوتا ہے مگر وہ بھی بنانے والا اکیلا ہو تو آدمی ہلکان ہو جائے۔ میں نے شہروز سے کہا تو بھئی اس نے صاف کہہ ڈالا کہ آپا یہ کپڑے اور زیور سمیعہ نے ہی پہننے ہیں، لہٰذا سب کچھ اس کی پسند کا ہی بنوا لیجیے گا۔ بھئی سچی بات ہے پہلے تو مجھے اس کی صاف گوئی اور تھوڑی سی بے شری کھٹکی، پر سوچنے بیٹھی تو اس کی عقل پر رشک بھی آیا آخر وہ اتنی محنت سے ادھر پیسہ کما رہا ہے۔ کتنا دکھ ہو جب محنت کا کمایا گیا پیسہ ضائع ہو جائے بھئی جب کپڑے، جوتے، جیولری تمہیں ہی پسند نہیں آئے گی تو لامحالہ الماریوں، صندوقوں میں ڈال دو گی تو سب ضائع ہی ہوا نا پھر۔ اس لیے میں نے تو سوچا ہے جب بھی شادی کی شاپنگ شروع کروں گی، تمہیں ہی ساتھ لوں گی۔ اب اتنا تو میرا ساتھ دے ہی سکو گی نا!'' وہ خود ہی فیصلے کر کے اس کو سنائے جا رہی تھیں اور آخر میں اس طرح اس کی رائے جاننا چاہتی تھیں کہ وہ نہ ہاں کر سکے نہ ناں۔

''جی..... اصل میں مجھے شاپنگ کا زیادہ (تجربہ کہوں یا شوق؟ سسرالی رشتوں کے ساتھ گفتگو کے دوران لفظوں بلکہ مناسب لفظوں کا چناؤ کتنا دشوار ہوتا ہے اس کا اندازہ اسے ان بیس بائیس دِنوں میں ٹھیک ٹھاک ہو گیا تھا) پتا نہیں صنوبر ہی زیادہ تر امی کے ساتھ جاتی ہے۔'' تیسرا مناسب ڈپلومیٹک لفظ اسے سوجھ ہی گیا۔

''خیر یہ تو نہ کہو، شاپنگ کا شوق کس لڑکی کو نہیں ہوتا۔ اچھا چلو کسی دن چکر لگا تو تمہاری امی سے بات کروں گی اور کیا کرتی رہتی ہو سارا دن۔'' اف گویا وہ از سرِ نو گفتگو کا آغاز کرنا چاہ رہی تھیں، اس نے تپ کر ٹھنڈے پڑتے چائے کے مگ کو دیکھا۔

''بس یونہی گھر کے کام...... آپ امی سے بات کریں گی، میں شاید استری بند کرنا بھول گئی تھی۔ لائٹ بھی جانے والی ہے، آپ کی طرف کب جاتی ہے۔'' اسے جان چھڑانا مشکل ہو رہا تھا۔

''یہ پوچھو آتی کب ہے۔ بھئی روشنی اور اندھیرے کی ایسی آنکھ مچولی ہم نے تو اپنی زندگی میں نہ دیکھی نہ سنی، پچھلے دِنوں تو تمہارے بہنوئی اتنے عاجز آئے کہ باہر ہی کہیں سیٹل ہونے کے بارے میں سوچنے لگے۔ میں تو کہوں گی تم خوش نصیب ہو جو شادی کے بعد اس پس ماندہ ملک سے تو نکل جاؤ گی ورنہ......''

اس کے دل میں زوردار غصے کی لہر نے سر اٹھایا تھا، وہ محبت حب الوطنی نہیں تھی نہ ملنے والی بنیادی سہولتوں، ان کی کٹوتیوں بے وجہ ملنے والی زیادتیوں، مہنگائی بلوں کے ہوش ربا چارجز، لوریٹ آف لٹریسی، گندگی پسماندگی نہ جانے کون کون سے دکھ تھے جو اکثر ہی اس ملک میں رہنے والے ہر شہری کی طرح اس کے دل میں بھی اٹھا کرتے تھے، پھر بھی وہ برملا کبھی اپنے وطن کو برا بھلا نہیں کہتی تھی، یا یہاں سے بھاگ جانے کو اپنی زندگی کے لیے جنت نہ سمجھتی تھی، اور کوئی اس کے منہ پر اس کے ملک کو برا بھلا کہے ..... یہ سننا بھی اس کے لیے مشکل ہی نہیں ناممکن بھی تھا، وہ مقابل کے منہ پر کھری کھری سنا سکتی تھی مگر اب مقابل کون تھا؟ کھری کھری کیا...... اسے تو تردید بھی مہنگی پڑ سکتی تھی، وہ ابھی بھی بول رہی تھی۔

''اچھا بھئی۔ خاصا ٹائم ہو گیا۔ بچوں کے آنے میں بھی گھنٹہ ہی رہ گیا۔ میں اب کھانے کی فکر کروں۔ اپنا خیال رکھنا اور کبھی بھولے سے خود بھی ہماری خیریت دریافت کر لیا کرو، اپنوں سے شرم کیسی۔ اللہ حافظ۔''

اف کس قدر باتونی خاتون ہیں حالانکہ منگنی سے پہلے اور بعد میں وہ اسے اتنی چٹر پٹر تو نہیں لگی تھیں مگر آہ بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے۔

''کیا کہہ رہی تھی روبینہ ابھی۔'' امی ٹٹولتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

''کچھ خاص نہیں۔ بس اِدھر اُدھر کی باتیں۔'' وہ نظریں چراتے ہوئے ریسیور رکھ کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"لڑکا اچھا ہے پھر ایسا رشتہ اور اتنے سالوں بعد...... پانچ سال ہو گئے تمہیں بی اے کر کے گھر بیٹھے۔ بس اللہ کی طرف سے دیر تھی ورنہ کون سی کمی ہے تم میں چلو اللہ کا شکر ہے دیر سے سہی اس نے ہماری بھی سن لی ورنہ تو مجھے دن رات ایک ہی فکر ہولائے دیتی تھی، دو چار ماہ میں صنوبر بھی گھر بیٹھنے والی تھی اور دو سال بعد ثوبیہ بھی۔ اللہ بڑا مسبب الاسباب ہے، نہ میری بہن اور تمہاری پھوپھی بیلم غیروں سے بہوئیں لاتیں۔ دونوں کو تم نظر نہ آئیں۔ کیسا بے درد زمانہ آ گیا ہے، اپنوں کے دلوں سے اپنوں کا احساس مٹ گیا ہے بس اسی وقت سے ڈر لگتا تھا، وہ آ ہی گیا۔ یہ لوگ ہیں تو اچھے، بظاہر کوئی لمبا چوڑا جھنجھٹ بھی نہیں سسرال کا، دونوں بس بھائی اور بس آگے اللہ خیر کرے۔"

امی کو بھی روبینہ آپا والی بیماری لگ گئی ہے شاید۔ وہ ان کی بے جوڑ باتوں کو اَن سنی کرتے ہوئے آئرن سٹینڈ کے پاس چلی آئی۔

چائے کے مگ کی اوپری سطح پر جمی ڈارک براؤن رنگ کی ملائی کی تہ اس کا جی جلا گئی۔ گرم کر کے چائے پینا اسے کبھی بھی پسند نہیں تھا اور دوبارہ بنانا...... اس نے سر اٹھا کر وال کلاک دیکھا، صنوبر اور ثوبیہ کے آنے میں بمشکل گھنٹہ تھا اور دونوں کو آتے ہی کھانا تیار ملنا چاہیے ہوتا تھا، وہ تیزی سے کپڑے استری کرنے لگی۔

کچن سے ہنڈیا کی مہک آ رہی تھی۔ گویا امی سالن تو چڑھا آئی تھیں اسے تسلی ہوئی۔

"ایسی محبت کرنے والی ماں اور ایسا اچھا مہربان گھر...... پتا نہیں آگے کیا ہوگا۔ پہلی بار نہیں منگنی کے بعد بار ہا اس کی ذہنی رو اس نقطے پر آ کر بھٹکی تھی۔

اس نے سر گھما کر امی کو دیکھا، وہ بڑے مگن انداز میں اس کے جہیز کے سوٹ کے دوپٹے کی کروشئے پر بیل بنا رہی تھیں۔ وہ کتنی دیر تک ماں کے منہمک چہرے کو تکتی گئی۔

شادی کے بعد تو سب لڑکیوں کو ماں باپ کا ساتھ چھوڑنا پڑتا ہے مگر اتنی دور پردیس...... بس یہی سوچ کر وہ چھپ چھپ کر کئی بار رو چکی تھی، اب پھر اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

☆

اور یہ اس دن کے بعد تیسری شام کا ذکر تھا۔

وہ ٹیرس سے واک کر کے اتری تھی۔ اس نے ہاتھ میں پکڑی میرون موتیوں والی تسبیح الماری کے ریک میں رکھی اور آخری بار درود شریف پڑھ کر اپنے سینے پر پھونک ماری۔

یہ اس کا روزانہ کا معمول تھا۔ شام کو آدھا گھنٹہ چھت پر واک کرنا اور ساتھ تسبیح

کرتے جانا، جب امی، ابو، خالہ اور پھوپھو کے بیٹوں کی غیر فیملی میں شادی ہو جانے پر از حد رنجیدہ تھے اور خاندان بھر میں چہ مگوئیاں ہو رہی تھیں کہ کیسی خالہ اور پھپھی تھیں، جنہیں خوب صورت خوب سیرت، سلیقہ شعار بھانجی، بھتیجی نظر نہ آئی۔ ان دنوں اس کے گھر کی فضا کیسی اداس، کیسی سوگوار رہتی تھی، جو اِدھر اُدھر سے رشتہ آتا دیکھ داکھ کر چلتا بنتا اور دوبارہ کبھی آنے کا قصد بھی نہ کرتا، وہ اپنی ہی جگہ ٹوٹ پھوٹ کر رہ گئی تھی، اپنے ماں باپ کی نظروں میں چور سی ہو گئی تھی۔ شرمندہ شرمندہ گھر کے کاموں میں جتی رہتی۔ ابو امی کے خیر خواہوں نے اب دبی دبی زبان میں ان سے کہنا شروع کر دیا تھا کہ اس کا رشتہ کسی نے باندھ رکھا ہے، کسی پیر فقیر اللہ والے سے اس کا توڑ کرائیں۔ لڑکی میں تو کوئی کمی ہے نہ خرابی پھر کیا وجہ ہو سکتی ہے؟

اور اس کے اتنے مذہبی پختہ عقیدے کے ماں باپ بھی ڈگمگا کر رہ گئے تھے۔ ابو نے مسجد کے مولوی صاحب سے اور امی نے اپنی کسی جاننے والی کے توسط سے تعویذ، نقش منگوا کر پانی میں گھول کر اسے پینے کو دیے۔ امی نے کئی وظیفے شروع کر دیے۔ کچھ آیات اسے بھی پڑھنے کی تاکید کرتیں تو اسے لگتا وہ بیمار ہے، مفلوج ہے یا اس میں کوئی کمی ایسی ہے جو بظاہر عام آنکھ کو دکھائی نہیں دیتی، صرف رشتہ لے کر آنے والوں کو نظر آئی تھی۔

مولوی صاحب نے ابو سے کہہ کر اسے بڑا گوشت کھانا منع کر دیا۔ ماش کی دال اور نہ جانے کیا کیا۔

"میرے دور کی بیٹیوں کے مقدر کس نے باندھ رکھے ہیں کوئی یہ بتا دے کھلے ہوئے کب تھے، جو ستارے باندھ رکھے ہیں کہیں جہیز کی کمی، کبھی قد میں تو کبھی رنگ میں کمی ہے دنیا کے خداؤں نے انکار کے سو بہانے باندھ رکھے ہیں بھاگ بھاگ جائیں گے، اب میری بیٹی کے، ماں کہتی ہے کتنے تعویذ پیر جی نے اس کے پلو سے باندھ رکھے ہیں پیر جی کا تو یہ دھندا ہے، پر تم تو ایمان رکھتی ہو ماں کیسے کہوں، ستاروں کے بہروپ میں انگارے باندھ رکھے ہیں۔ آنے والے اچھے دنوں کا سن کر اب دھڑکنوں میں ہلچل نہیں ہوتی۔ انتظار کے سیاہ آنچل تلے چاندی کے تار باندھ رکھے ہیں اس معاشرہ بے رحم میں زود رنج فقط ماں باپ ہی نہیں بیٹیوں نے بھی پلکوں کے پیچھے آنسوؤں کے دریا باندھ رکھے ہیں۔ خدا کو مانتے ہیں پھر کیوں بھول جاتے ہیں ہم بار بار اس کی حکمت نے زندگی اور موت کے دن باندھ رکھے ہیں۔"

اخبار میں چھپی یہ نظم پڑھ کر وہ کتنا روئی تھی۔

یہ جو درد ہم کو ملا، یہ درد زمانے میں بھی عام ہے۔ وہ اپنے آنسو خود ہی پونچھ کر جرا

مسکرائی تھی اور پھر دل میں عہد کیا تھا کہ وہ کوئی تعویز، کوئی نقش، کوئی الٹا سیدھا وظیفہ نہیں کرے گی مگر اس کا یہ عہد زیادہ دیر پا نہیں تھا کہ امی ابو کے چہروں اور آنکھوں کی بے بسی اسے مجبور کر دیتی، پھر بھی وہ دامن بچا کر ہی چلتی تھی۔

ہاں اب روز شام کو چھت پر واک کے دوران وہ تسبیح کرتی اور پھر پورے دھیان گیان کے ساتھ اس معمول نے اسے اس سخت ترین دور میں کیسے ڈھارس دی تھی۔ یہ اس کا دل ہی جانتا تھا، پھر تو یہ اس کا ایسا پکا معمول بنا تھا کہ آندھی طوفان میں بھی چھت پر جا کر تسبیح کرنے کو دل بے چین ہو اٹھتا۔ اس معمول نے اسے اپنا رشتہ نہ ہونے جیسے احمقانہ دکھ بھری شرمندگی سے نکال دیا تھا اور وہ بہت مطمئن ہو گئی تھی۔

اور پھر اس اطمینان بھرے لمبے انتظار کے بعد شہروز کا رشتہ آیا تھا۔ امی ابو اسے تعویزوں اور وظیفوں کا کرشمہ سمجھتے تھے جبکہ وہ خود...... اس معین وقت کی اور بھی دل سے قائل ہو گئی تھی جس کے بارے میں رب تعالیٰ نے اپنی کتاب میں جگہ جگہ ارشاد فرمایا تھا۔

"امی کو کیا پریشانی ہے بھلا؟" چادر کی بکل ذرا سی ڈھیلی کرتے ہوئے اس کی نگاہ امی کے جھکے ہوئے سر اور افسردہ چہرے پر ٹھٹکی تھی۔

"کیا ہوا امی؟" وہ ان کی پریشان صورت دیکھ کر یونہی بے چین ہو جایا کرتی تھی۔

انہوں نے جواب میں کچھ نہیں کہا، اسے خالی خالی نظروں سے دیکھ کر رہ گئیں۔

"امی! کیا بات ہے؟" وہ ان کی ایسی نگاہوں پر اور بھی مضطرب ہو کر پاس بیٹھ کر پوچھنے لگی۔

"کچھ نہیں بیٹا! کھانا تیار ہو گیا۔ شاید تمہارے چچا آج آئیں تمہارے ابو کے ساتھ۔ اس لیے کچھ میٹھا بھی بنا لینا۔" وہ اسے ایک دم سے تھکی تھکی نڈھال، عمر رسیدہ نظر آئی تھیں۔ کوئی بات تھی ضرور، مگر وہ اسے بتانا نہیں چاہ رہی تھیں۔ وہ چند لمحے اسی انتظار میں بیٹھی رہی کہ شاید وہ کچھ کہیں۔

مگر انہوں نے اپنی چپ نہیں توڑی، بس ایک دو ٹھنڈی سانسیں لیں اور منہ میں اللہ اکبر، استغفر اللہ کہتی رہیں تو وہ اٹھ کر کچن میں آ گئی۔

"یقیناً امی کی پریشانی کا تعلق اسی سے بنتا تھا۔ اس نے اوپر واک کے دوران فون کی بیل سنی تھی، کس کا فون ہو سکتا تھا۔"

"چائے پیو گی؟" صنوبر اچانک ہی ٹپکی تھی، وہ بھی اس کی طرح چائے کی رسیا تھی۔

"ہاں بنا لو...... صنوبر! ابھی تھوڑی دیر پہلے کسی کا فون آیا تھا؟"

"پتا نہیں۔ میں تو پڑھ رہی تھی، امی نے سنا تھا، امی سے پوچھ لو۔" اس نے لاعلمی کا اظہار کیا۔

"کل درس ہے باجی فاطمہ کی طرف۔ چلو گی؟" اس نے چند لمحوں بعد پوچھا۔

"جانا تو پڑے گا کیونکہ امی جائے بغیر رہیں گی نہیں، پھر ابو بھی شام کو ضرور پوچھیں گے بھئی کیا مسئلہ پیش کیا گیا تھا درس میں اور کیا سمجھیں۔"

"اف میرے تو پیپرز ہیں۔ میں تو نہیں جاؤں گی۔" صنوبر سر جھٹک کر بولی۔

"ہاں تم نہ جانا، امی نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ صنوبر نہ جائے۔ یوں بھی گھر میں کسی کو رہنا چاہیے۔ ثوبیہ تو ہمارے ساتھ ہی جائے گی۔"

"بھئی، آج وہ تمہاری نند صاحبہ کا فون نہیں آیا، آج ان کی غیر حاضری لگ گئی ہے، فون کر کے بتا دو۔" وہ شرارت سے بولی۔

"بدتمیز! بڑی ہیں تم سے۔"

"صرف عمر میں...... ورنہ عقل میں تو...... سولہ سال کی لگتی ہیں جب بے چاری معصوم بہنوں کو بھائیوں کی شادی کا کیسا پُر جوش سا ولولہ ہوتا ہے ان کا بس چلے تو اس ہفتے تمہیں رخصت کرا کے لے جائیں۔ کیا ساری نندیں شادی سے پہلے اتنی ہی والہ وشیدا ہوتی ہیں؟"

"بھئی۔ میں تمہاری معلومات میں کوئی اضافہ نہیں کر سکتی۔ میرا بھی یہ پہلا پہلا تجربہ ہے۔"

"اوہو! مجھے یاد آیا وہ انگیج منٹ والی البم تو مجھے پرسوں کالج جاتے ہوئے دینا۔ بینا کے گروپ نے تو تصویریں دیکھی نہیں۔" اسے ایک دم یاد آیا تھا۔

بس رہنے دو، چار بار تم البم کالج لے جا چکی ہو تو پھر بینا کا گروپ اس مفت کے شو سے محروم کیسے رہ گیا۔ اب نہیں لے کر جانے دوں گی، اتنی فضول اور چھچھوری حرکت لگتی ہے نا مجھے یہ منگنی شادی کی تصویریں لڑکیوں کے جمگھٹے میں بیٹھ کر دیکھنے اور تبصرہ۔" وہ ناک چڑھا کر بولی۔

"یہ بھی تو شو مارنے کا ایک طریقہ ہوتا ہے بہنا! وہ جو منگنی شدہ ہوتی ہیں دکھا دکھا کر تیسری انگلی میں پڑی انگوٹھی کو گھماتی ہیں، ان کو بتانے کے لیے بھئی ہمیں بھی ایسا گیا گزرا نہ سمجھنا۔ بہن کی منگنی شادی ہو گئی ہے، اب لائن میں ہمارا نمبر آ چکا ہے۔" صنوبر چائے ڈالتے ہوئے بولی۔

"بے شرم! بھلا فخر کی کون سی بات، چھوٹے بچوں جیسی ذہنیت۔" وہ واقعی نہیں سمجھتی تھی۔
"تمہیں موقع نہیں ملا نا کالج لائف کے دوران جبکہ ہم یہ، بھی یہ موقع خدا خدا کر بلکہ ہزار منتوں کے بعد آیا ہم کیوں نہ شو ماریں۔" وہ اپنا بیگ اٹھا کر باہر نکلتے ہوئے کہہ گئی تو سمیعہ لمحہ بھر کو سن سی رہ گئی۔

☆

ابو اور چچا کی محفل رات گئے تک جمی تھی۔
"بھئی، کب تک کہہ رہے ہیں وہ شادی کے لیے؟" وہ انہیں قہوہ دے کر باہر نکل رہی تھی، جب چچا نے وہ موضوع چھیڑا جس پر آج کل اس کے دل کی دھڑکنیں خوب ہی منتشر ہوتی تھیں۔
"جلد ہی، بس چار چھ ماہ کے اندر۔" اس نے ابو کا جواب سننے کے لیے تو قدموں کی رفتار ہلکی کی تھی۔
"بس دیر نہ کرنا۔ آج کل تو ایسا نازک وقت آ گیا ہے، ادھر ذرا منگنی لگی کوئی نہ کوئی اڑچن آ گئی، پھر یہ تو لڑکے کے پردیس میں ہونے کا معاملہ ہے، تم نے اچھی طرح تحقیق وغیرہ تو کروالی ہے نا، آخر بچی کے دور جانے کا معاملہ ہے۔" وہ اب لاؤنج کے باہر ادھر اُدھر سے چیزیں اٹھانے لگی تھی، امی بھی اندر ہی موجود تھیں۔
"الحمدللہ۔ جہاں سے بھی پتا کروایا، تسلی بخش جواب ہی ملا۔ لڑکا چھ سالوں سے برلن میں ہے، جاب بھی اچھی ہے اور اپارٹمنٹ بھی اپنا لے رکھا ہے، نیک، شریف اور سلجھا ہوا ہے جتنے میرے کسٹمر ہیں بیرون ملک بڑے اچھے جاننے والے۔ سب کے توسط سے پتا کرایا۔ اللہ کا شکر ہے، کوئی غلط بات پتا نہیں چلی، اتنے سالوں سے جرمنی میں ہے۔ گلزار صاحب تو بتا رہے تھے، وہ دوستوں کی محفل میں بھی پینے پلانے سے پرہیز کرتا ہے۔
اب رشتے کی مجبوری نہ ہوتی تو میں تو غیر ملک میں رشتے کرنا ہی نہیں چاہتا تھا پھر یورپی ممالک۔ مجبوری ایسی بنی بیٹی کو کب تک ...... چلو اللہ نے نیک سبب لگایا۔ آگے بھی وہ بہتر کرے گا، میں نے اس پر توکل کر کے استخارہ بھی کیا۔ تمہاری بھابھی نے بھی۔ اللہ نے ہماری رہنمائی ہی فرمائی بس اس لیے چاہ رہا ہوں، دو چار ماہ میں ہی شادی کر دی جائے۔" ابو نے مفصل جواب دیا تھا۔
"چلیں اللہ اچھا کرے۔ ہماری بچی بھی اتنی نیک طبیعت، صوم وصلوٰۃ کی پابند اور

باصبر ہے یقیناً اللہ نے اس کے نیک نصیب ہی لکھے ہوں گے۔ میرا اطہر ذرا بڑا ہوتا تو میں سمیعہ کو کہیں جانے ہی نہ دیتا۔"
ان دونوں کی عمروں میں فقط دو سال کا فرق تھا اور ان کٹھن دنوں میں جب یہ سارا گھر مایوسی کی انتہا پر تھا امی ابو نے تو اس رشتے کے بارے میں بھی سوچنا شروع کر دیا تھا۔ چچا نے بھی اشارۃً حامی بھر لی تھی مگر پھر جیسے ہی چچی جان کو پتا چلا، انہوں نے خاندان کی ایک دو تقریبات میں اس طرح منہ بھر بھر کر اس کی دو سال بڑی عمر کو کئی سال بڑا ظاہر کیا اور کہا اطہر تو ابھی بچہ ہے ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے کہ میں اس بے جوڑ رشتے پر ہامی بھر لوں۔" امی ابو نے لب سی لیے تھے۔
"اور باران رحمت کا وقت کہیں بھی درج نہیں، جب اس کی رحمت جوش میں آتی ہے تو پھر سارے دکھ دور ہو جاتے ہیں وہ واقعی بے نیاز ہے۔"
وہ سوچتی ہوئی عشاء کی نماز کے لیے وضو کرنے چل دی۔
"سونے لگی ہو۔" وہ عشاء کی نماز کے بعد سورۃ ملک اور سورۃ واقعہ لازمی پڑھا کرتی تھی۔ پڑھ کر بستر پر بیٹھی تھی کہ امی آ گئیں۔
"جی کوئی کام تھا؟" اس نے ہاتھ میں پکڑی تسبیح تکیے کے نیچے رکھ دی۔
"نہیں۔ کام تو کوئی نہیں، وہ دونوں پڑھ رہی ہیں۔"
صنوبر اور ثوبیہ ڈرائنگ روم میں بیٹھی پڑھ رہی تھیں۔ اس کمرے میں تینوں سوتی تھیں اور یہ لاؤنج سے ملحق تھا، چچا اور ابو کی باتوں سے ڈسٹرب نہ ہوں۔ اس لیے وہ کتابیں اٹھا کر ڈرائنگ روم میں چلی گئی تھیں۔
"کل ایک تو درس پر جانا ہے، وہ تو صبح گیارہ بجے سے بارہ بجے واپسی ہو جائے گی، میں کہہ رہی تھی، کل دوپہر کھانے کے بعد بازار چلیں گے تمہارے ابو نے بھی کچھ رقم دی ہے کہ اب جلدی تیاری شروع کریں۔"
"اُفوہ امی! یہ بازار کے کام سے مجھے بڑی الجھن ہوتی ہے۔"
"اب یہ تو کرنا پڑے گا، پھر روبینہ کہہ رہی تھی، اگلے ہفتے وہ تمہیں اپنے ساتھ بازار لے کر جائے گی زیور کے ڈیزائن پسند کروانے اور کچھ کپڑے جوتے۔"
"امی! میں نہیں جاؤں گی۔" وہ فوراً گھبرا کر بولی۔
"بے وقوف! ایسے منہ پھاڑ کر انکار نہیں کر دیا کرتے، شاید وہ پرسوں چکر بھی

لگائے، ذرا بے تکلفی سے کھل کر ان کے پاس بیٹھا کرو۔ آج کل کی لڑکیاں کتنی تیز طرار ہیں۔ چلو پہلے کی بات اور تھی، دیکھنے دکھانے کا سلسلہ تھا، تمہارا تکلف بھرے انداز میں ملنا درست تھا مگر اب تو ان کے ساتھ رشتہ جڑ چکا پھر بڑی محبت چاہت کرنے والی ہیں۔ تصنع اور بناوٹ سے دور ورنہ تو سسرالیوں اور خاص طور پر نندوں کے نخرے اور تقاضے ہی تمام نہیں ہوتے یہ بے چاری تو سادہ ہے۔ بڑی اپنائیت کا اظہار کرتی ہے تو جواباً ہمیں بھی اسی طرح ملنا چاہیے نہ کہ تمہاری طرح ''صم بکم'' کی تفسیر بنے۔''

پتا نہیں امی اب اسے کون سی نئی تربیت کا پہلا سبق دے رہی تھیں، پہلے تو وہ کہا کرتی تھیں لڑکیوں کو چھچھوروں کی طرح نئے جڑنے والے رشتوں سے اتنا بے تکلف نہیں ہونا چاہیے کہ ان کے اوپر ہی گرتے جاؤ۔ بے تکلفی سے منہ پھاڑ کر قہقہے لگاؤ اور بے شرمی سے بہانے بہانے سے چھٹنے بات سے بات نکالنے کی کوشش کرو۔'' اور نہ جانے کیا کیا...... اور وہ فرمانبردار، سمجھ دار بیٹی بنتے ہوئے ان کی ساری نصیحتوں کو پلو سے گرہ پہ گرہ دیے سنبھالے جا رہی تھی کہ اب؟

''اور سنو۔'' وہ اس کا متذبذب چہرہ دیکھتے ہوئے کچھ کہتے کہتے رُک گئیں۔

''جی۔'' اس کے فقط لب ہل سکے تھے۔

''وہ روبینہ کا فون آیا تھا شام میں۔'' وہ پھر بات ادھوری چھوڑ کر اسے دیکھنے لگیں۔

''وہ کہہ رہی تھی ...... بلکہ کہہ بھی کیا رہی تھی۔'' وہ ہلکا سا ہنسیں جیسے کوئی کھسیا کر شرمندہ ہنسی ہنستا ہے۔ ''آج کل کا زمانہ ہی ایسا ہے۔ ہمارے وقتوں کی شرم وحیا اور تقدیر کے لکھے کو دل کی خوشی بنا کر ساری زندگی ہنسی خوشی بتا دی سب لد گئی اب تو ...... خیر اس میں قصور کسی کا بھی نہیں، زمانے کے رجحانات ہوتے ہیں جو سب ہی کو اپنی لپیٹ میں لیتے ہیں پھر برائی بھی برائی نہیں رہتی۔ ضرورت لگنے لگتی ہے اور یہ بھی آج کل کی ضرورت بنتی جا رہی ہے ناگزیر ضرورت۔'' وہ پھر رُکیں سمیعہ ان کی باتوں سے الجھنے لگی تھی۔

''یہی لڑکی لڑکے انڈر اسٹینڈ نگ کی بات۔ اس کے بغیر ...... اور اچھا ہے شادی سے پہلے ایک دوسرے کے مزاجوں کے بارے میں پتہ چل جائے تو پھر نبھانا بھی آسان ہو جاتا ہے ورنہ ابتدائی دنوں میں تو عورت بے چاری جس کو پہلے، اس شخص کے بارے میں کچھ پتا ہی نہ ہو، بہت سی مشکلوں میں گرفتار ہو جاتی ہے، شاید آج کل کے پڑھے لکھوں نے عورت کو ہی ان آئندہ مشکلات سے بچانے کے لیے انڈر اسٹینڈ نگ کی اصطلاح نکالی ہے اور یہ ایسی

بری بھی نہیں ......''

وہ پھر رکیں۔

''شہروز تم سے بات کرنا چاہتا ہے، اس کے آنے میں پانچ یا چھ ماہ ہیں تو اس دوران وہ ٹیلی فونک رابطہ ...... میں روبینہ کو ٹالے جا رہی تھی، وہ بھی ہمارے گھر کے ماحول، تمہارے ابو کی سخت طبیعت کو سمجھتی ہے اس لیے دو تین دفعہ تو اشاروں کنایوں میں سمجھاتی رہی اور میں بے وقوف بالکل نہیں سمجھی اور میرا بھی قصور کیا۔ ہم نے تو پہلے کبھی اس انڈر اسٹینڈ نگ کا نام بھی نہیں سنا تھا کہ کس چڑیا کا نام ہے جس کو قابو کیے بغیر ہم پچیس پچیس تیس سال ہنسی خوشی اسی کھونٹے سے بندھے رہے جس سے ماں باپ نے باندھ دیا۔ چلو ہمارے زمانے گزر گئے اب یہ نئے وقتوں کے تقاضے ہیں نبھانے تو پڑیں گے۔''

وہ پھر وہی شرمندہ سی ہنسی چہرے پر زبردستی لا کر بولیں۔ تو سمیعہ انگلیاں چٹخانے لگی۔

''امی! میں ...... میں نہیں بات کر سکوں گی۔ کیسے کروں گی پلیز، آپ منع کر دیں انہیں۔'' وہ متذبذب سا ہو کر روہانسی آواز میں بولی تھی۔

''منع تو کیا تھا...... کوشش بھی کی تھی...... کیا کروں۔'' وہ بے بسی سے بولیں۔

''بس مجبور ہیں وقت کے ہاتھوں ...... پھر اتنی مشکلوں سے تو ایسا اچھا رشتہ ملا...... تم ہمت کر لو بس، زیادہ بات نہ کرنا اور اچھی بات ہے۔ وہ تمہاری طبیعت کو سمجھ گیا تو شاید خود ہی پیچھے ہٹ جائے گا، بس دو چار ماہ کی تو بات ہے۔ ہفتے میں ایک آدھ بار چند منٹ ...... بس اپنے ہوں تو یہ مسائل نہ ہوں کہ سمجھنے سمجھانے کے لیے اگلے کی قوت برداشت کا امتحان لیا جائے یا ان کو بندہ منع بھی کر دے۔ توڑنے تاڑنے پر اتر آتے ہیں۔ کون سا لہو کا رشتہ ہوتا ہے کہ ایک توڑنے کی بات کرنے پر سو جاں گسل مراحل میں رہ میں پڑے دکھائی دیں ...... کیا کر سکتے ہیں بیٹی'' وہ اب کوشش کے باوجود وہ بے بس سی ہنسی بھی لبوں پر نہ لا سکیں۔

''ابو...... ابو کو پتا چلا؟'' وہ خشک لبوں کو تر کرتے ہوئے بولی۔

''انہیں نہ پتا چلے تو اچھا ہے۔ ان کی طبیعت کو تم بھی جانتی ہو، سوچے سمجھے بغیر سب کچھ ختم کر ڈالیں گے سو فتوے جاری کر دیں گے ...... تمہیں ہی تھوڑا سمجھوتہ ...... اور کون سا کوئی مشکل کام ہے۔ اچھا اب پریشان نہ ہو وہ کل شام کو فون کرے گا۔ سلام دعا کر لینا اور کیا باتیں کرنی ہیں، بھلا۔ اچھا اب تم سو جاؤ لائٹ آف کر دوں۔'' وہ بے ربط سے جملے بولتے ہوئے کھڑی ہو گئیں۔

"ہاں کردیں۔" وہ گم صم سی ان کی شکل دیکھتے ہوئے بولی۔ اگلے پل کمرہ زیرو پاور کے ملگجے اندھیرے سے ڈوب گیا۔

"میں کیسے بات کروں گی بھلا...... کیسے؟" اسے نیم دراز ہوتے ہوئے تکیے کے نیچے سے تسبیح اٹھانا بھی بھول گئی۔

"نہیں، میں نہیں کروں گی بات وات...... کہاں گیا امی ابو کا وہ سب کہنا...... نامحرم سے بات کرنا، خوشبو لگا کر بازار جانا، عشوہ و ناز و ادا دکھانا سب زنا کے زمرے میں آتا ہے اور اب خود...... خود سے کہہ رہی ہیں۔ اس نامحرم سے بات کرلوں...... انڈر اسٹینڈنگ کے نام پر...... امی یہ کیا دوغلا پن ہے پہلے ہر گھڑی گناہ ثواب، اجر عذاب، دوزخ، آگ کے ڈراوے دے دے کر گناہ کے رستے سے ہٹایا جائے اور اب مجبوری کے نام پر سب گوارہ کر لیا جائے......" وہ جتنا سوچتی الجھتی جاتی۔ امی کا مجبور چہرہ نظروں کے سامنے اور وہ شرمندہ سی ہنسی اس کی سماعتوں کو جھنجھنا رہی تھی۔

وہ بے اختیارے انداز میں اٹھی اور الماری سے البم نکال کر اپنے بستر پر آگئی۔

پہلے ہی پلاٹ کور میں شہروز کی بلیک ٹو پیس میں چمکتی دمکتی تصویر تھی، اس کے سرخ لب گھنی مونچھوں تلے مسکرا رہے تھے اور براؤن آنکھیں جیسے اسے دیکھ رہی تھیں، کشادہ پیشانی سے آگے گھنے بالوں والا سر تو نظر بھر کر کبھی اس کی تصویروں کو دیکھ ہی نہیں سکی تھی۔ کئی بار دل کی خواہش پر تنہائی میں اکیلے میں چپکے سے تصویریں نکال کر دیکھتی جیسے ہی شہروز کے خوبرو چہرے پر اس کی نظریں رکتیں، اس کے دل کی حالت اتھل پتھل ہو کر رہ جاتی۔ شرم سے نظریں اٹھ ہی نہ پاتیں اور وہ باوجود کوشش کے چند سیکنڈز سے زیادہ اس تصویر کو دیکھ نہیں پائی تھی، کبھی کبھی دیکھ کر حیران سی ہوتی کہ اتنا وجیہہ، ہیرو سا شخص کیا اس کا ساتھی بننے جا رہا ہے؟ اس کا اپنا دل ہی نہ مانتا اور شرارت پر اتر آتا کہ اچھا دوبارہ دیکھو، وہ ہے کیسا، تو وہ یونہی کمرے میں کسی کام کے بہانے سے آتی اور البم کھول کر ایک نظر دیکھنا چاہتی اور دوسرے پل اس چمکتی براؤن آنکھوں اور لبوں کی مسکراہٹ کی تاب نہ لا کر البم بند کر دیتی۔

اب بھی یہی ہوا تھا، وہ چند سیکنڈ سے زیادہ تصویر پر نظر نہ جما سکی تھی۔

"بھلا میں بات کیسے کروں گی؟ مجھ سے ہو ہی نہیں سکے گی۔"

اس نے صنوبر کی آواز سن کر البم اٹھ کر الماری میں رکھ دی تھی۔ اب آنکھیں بند کیے دھڑکتے دل کے ساتھ صرف اسی ایک نقطے کو سوچے جا رہی تھی۔

اس کی جھجک اور گریز کے باوجود دل کی دھڑکنیں بڑا خوشگوار سا تاثر لیے ایک الگ ہی سر تال میں دھڑک رہی تھیں جیسے...... جیسے وہ خود بھی ایسے ہی کسی چور لمحے کی منتظر تھیں، جب اس سے بات کرنے کا موقع مل سکے۔ "میں کیا بات کروں گی۔" اگلے پل وہ ان دھڑکنوں کی سر تال سے محظوظ ہوتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

"وہ مجھ سے کیا بات کریں گے؟ وہ جو روبینہ باجی کہہ رہی ہیں، وہ تصویریں دیکھ کر بے چین ہے تو......" وہ لب کچل کر اس سے زیادہ کچھ سوچ ہی نہیں سکی۔

دل کی حالت یکایک بدل سی گئی تھی، عجب پُر لطف سا احساس تھا جو اس کے دل و دماغ پر کسی نشے کی طرح چھا رہا تھا۔

"شاید میں بہک رہی ہوں اور بھول رہی ہوں۔ یہ ٹھیک نہیں ہے اور ابو کو اگر پتا چل جائے، لیکن اپنی مرضی سے تو نہیں کرنے جا رہی۔ امی کی رضا مندی سے اور آج کل کیا نہیں ہو رہا، ابھی کوئی رشتہ بھی نہیں جڑتا اور لڑکیاں گھنٹوں لڑکوں کے ساتھ موبائل پر فون پر محو گفتگو رہتی ہیں میں تو پھر اپنے منگیتر سے بات کرنے جا رہی ہوں۔" دل و دماغ میں خیر و شر کی جنگ چھڑ چکی تھی۔

"کیا منگیتر کا شرع میں کوئی مقام ہے؟ دل کتنا کمینہ ہوتا ہے۔ ہاتھ پکڑ کر خوش رنگ پھولوں کے کنج میں بھی لے جاتا ہے اور پھر کانٹوں سے بھی ڈراتا ہے۔" وہ سوچتی سوچتی گہری نیند کی وادی میں اتر گئی اور اس رات واقعی اس نے بڑے نرالے، انوکھے مگر بڑے حسین دل آویز سپنے دیکھے تھے۔

☆

"کیسی ہو؟" یہ کیسا انداز تکلم تھا، پل بھر کو وہ ششدر رہ گئی، وہ گریز، حجاب لحاظ جس کی تھوڑی بہت موجودگی کی وہ توقع کر رہی تھی، لہجے ہی سے نہیں الفاظ سے بھی عنقا تھا۔

سارا دن کیسی کشمکش اور اضطراب میں گزرا تھا وہ جانتی تھی یا اس کا دل...... دل پر بے خودی و بے اختیاری والی رات کی کیفیت نہیں تھی۔

درس قرآن پاک کے دوران بھی اس کی کیفیت بھٹکی بھٹکی سی تھی۔ دل کہیں اور ہی اڑا جا رہا تھا سمجھ میں نہ آتا کس آیت کی تفسیر بیان کی جا رہی ہے۔ ان چار سالوں میں آج پہلی بار تھا کہ اس کا دل کیا دماغ بھی اس پاک محفل میں متوجہ نہیں تھا، ورنہ تو ادھر اس کے حضوری قلب کی جو حالت ہوتی تھی، اکثر اس کی امی بھی دیکھ کر رشک کیا کرتی تھیں۔

"میرے مولا یہ کیسا امتحان ہے جس کے پل صراط سے گزرے بغیر مجھے سرخروئی کی سند نہیں مل سکتی، ماں باپ کے جھکے سروں کی مجبوری نہ ہوتی تو میں کبھی اس گناہ پر خود کو آمادہ نہ کر پاتی۔ مجھے ہمت دے اور وہ فیصلہ فرما دینا جو میرے حق میں نیک ہو اور بہترین ہو۔"

امی نے بچپن سے اس کے کانوں میں ڈال دیا تھا جو آج بھی دل پر نقش تھا۔ جب بھی مانگو جو بھی مانگو سب سے پہلے اس میں اپنے لیے نیکی اور ہدایت مانگو۔ یہ مل گئیں تو سمجھو، دنیا کی ہر نعمت مل گئی۔ کوئی بہترین سے بہترین چیز بھی مل گئی اگر اس میں نیکی نہیں ہوگی تو وہ ضرور ضرر رساں ہوگی اور اس کی یہ عادت کیسی پختہ ہو چکی تھی کہ وہ رب سے سب سے پہلے نیکی کے لیے دست سوال دراز کرتی تھی۔

اور ابھی جب فون کی گھنٹی بجی تھی تو امی سن کر بھی انجان سی بنی، ثوبیہ کی قمیص کی سلائی کرتی رہی تھیں بلکہ جیسے ہی ان کے اشارے پر اس نے متذبذب سی حالت میں فون اٹھایا، وہ اٹھ کر اندر چلی گئی تھیں۔

اس نے ریسیور کان سے لگا کر توقف کیا تھا۔

اور ہیلو کی آواز سن کر اسی آواز میں السلام علیکم کہا تھا۔ دل میں دھڑکنیں گواہی دے رہی تھیں، یہ وہی لمحہ امتحان ہے جس نے رات بھر سے اسے سولی کی ٹکٹکی پر چڑھا رکھا تھا۔ سننے والے نے شاید اس کا سلام سنا ہی نہیں تھا۔

"میں شہروز ہوں، سمیعہ ہیں۔" لہجہ بے تاب نہیں خاصا پُرجوش بھی تھا۔

"جی بول رہی ہوں۔" اس کی ریسیور کو تھامے ہتھیلی سے پسینہ پھوٹنے لگا تھا۔

"تھینک گاڈ! یار میں تو حیران ہوں کہ آج کل کے زمانے میں یعنی دو ہزار آٹھ اکیسویں صدی میں آپا نے کیا میرے لیے عجوبہ روزگار ڈھونڈا ہے کہ جس کے نام سے منسوب ہونے کے باوجود نہ تو میں اس کی آواز ابھی تک سن سکا ہوں، نہ میرے پاس اس کا کوئی کانٹیکٹ نمبر ہے۔ امیزنگ، میں اپنے دوستوں کو بتاؤں تو کوئی یقین نہ کرے۔ سمجھیں، میں نے پاکستان کے کسی پسماندہ گاؤں کی کسی لڑکی سے رشتہ جوڑا ہے اچھا کیسی ہو؟" وہ یوں نان اسٹاپ بولے گیا جیسے ان کے درمیان کتنے مہینوں کے وقفے کے بعد رابطہ بحال ہوا ہو، ورنہ وہ دونوں ایک دوسرے کے پرانے واقف ہیں۔

"اللہ کا شکر ہے۔" وہ ہولے سے بولی۔ کن اکھیوں سے امی کو کچن میں جاتے دیکھا۔ وہ کمرے میں فقط چند ثانیے ہی ٹھہری تھیں۔

"کس بات پر مجھ سے بات ہونے پر یا یہ بندھن بندھنے پر؟" وہ تیزی اور شوخی سے بولا۔

"جی۔" وہ قطعاً نہیں سمجھی۔

"آپ گاڈ کا شکر ادا کر رہی ہیں تو اس لیے میں نے پوچھا ہے۔" وہ اس کے شکر کا مفہوم نہیں سمجھا تھا، اس کے لیے مقام حیرت تھا۔

"جی، آپ نے میری خیریت پوچھی تو میں نے بخیریت ہونے کی اطلاع کے ساتھ اللہ کا شکر ادا کیا۔"

وہ ذرا وضاحت سے بولی تو وہ ایک دم سے ہنس پڑا۔

"وہاٹ اے جوک یعنی خیریت پوچھنے پر بھی گاڈ کی کنڈی ہلائی جائے پہلی بار سن رہا ہوں۔" اس کا اگلا جملہ بھی اسے صدمے سے دوچار کرنے کے برابر تھا۔

"یار! یہ آپ آپ اور جی جی کر کے نہ بولو۔ میں کوئی بہت عمر رسیدہ بوڑھا نہیں ہوں، جس سے تم یوں ادب واحترام سے بات کرو۔" وہ ایک دم سے اسے ٹوک کر بولا تو وہ پھر پریشان ہوئی۔

"تو کیا کہوں۔"

"ڈارلنگ سویٹ ہارٹ، مائی لو! میری جان جو بھی کہوگی، سیدھا تمہارے شہری کے دل میں اترے گا کھٹ سے ان خوب صورت تصویروں کی طرح جو انگیج منٹ میں تمہاری آئی ہیں اور جس دن سے آپا نے مجھے بھیجی ہیں میری راتوں کی نیند، دن کا سکون اور دل کا چین کہیں غارت ہو گیا ہے۔ یقین کروگی، ایک پل بھی یہ دل سنبھلتا نہیں کہ اڑ کر آ جاؤں۔"

اس کے کانوں کو ہی نہیں پورے وجود کو جیسے کسی نے کئی ہزار واٹ کرنٹ کے جھٹکے دیے تھے۔ دل تو کیا دھڑکتا وہ پل کے لیے تو شاید اس میں دوڑتا لہو بھی تھم گیا تھا، اور ریسیور اس کے بھیگی ہتھیلی سے پھسل کر نیچے گرنے کو تھا۔

اس نے دھندلائی نظروں سے کچن، کمرے اور لاؤنج کے آس پاس بے چین سی پھرتی امی کو دیکھا۔

اس نے ریسیور کان سے ہٹا رکھا تھا۔ امی نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا تو اس نے لب کاٹتے ہوئے ریسیور کان سے لگا لیا۔

"تمہیں کون سی ایکٹریس اور ایکٹر پسند ہے ویسے میری پسند تو بدلتی رہتی ہے اور

بھئی، انسان کو اپنی پسند بدلتے وقت کے ساتھ بدل ہی لینا چاہیے، ورنہ وقت کا مقابلہ کرنا تو بہت مشکل ہے، ہے نا۔ ایم آئی رائٹ۔"

"لیں......" اس نے ہولے سے کہہ کر ریسیور دوسرے ہاتھ میں منتقل کیا۔

"بھئی۔ یہ کیا لیں نو، جی ہاں نہیں، اس لیے تو میں نے فون نہیں کیا۔ اچھا ادھر تو شاید سات بجے ہوں گے برلن میں تقریباً دو بجنے کو ہیں، میں آفس سے فون کر رہا ہوں تم مجھے اپنا سیل نمبر دو۔ میں رات کو یعنی تمہیں گیارہ بارہ کے درمیان کال کروں گا۔ دیکھنا اس وقت بات کرنے کا لطف ہی اور ہے کیسے خود بخود دل رواں ہوتے ہیں اور طبیعت کیسی مچلتی ہے۔ رئیلی آج رات کو تمہیں تجربہ ہو جائے گا اور پلیز یہ فضول کی شرم و حیا، یہ گھٹا گھٹا سا انداز الماری کے کسی اندرونی خانے میں پُخ کر تو مجھ سے بات کرنا، میں تمہارا فیانسی ہوں۔ کوئی غیر تو نہیں جبکہ فقط پانچ ماہ بعد ہم ہمیشہ کے لیے لائف پارٹنر بھی بن جائیں گے، میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا، پھر مجھ سے شرم کیسی؟ ہے نا!" وہ اپنی بہن کی طرح بے تکان اگلے کی کیفیت کو سمجھے بغیر بولتے چلے جانے اور دل کی کہے جانے کا عادی لگتا تھا۔

اس کے لیے تائید اور تردید کی گنجائش بھی نہیں چھوڑی تھی "بولو اپنا سیل نمبر جبکہ میرا نوٹ کرو، مجھے مس کال دو تو تمہارا نمبر فیڈ ہو جائے گا۔"

"میرے پاس سیل فون نہیں ہے" وہ اب عجیب سی گھٹن محسوس کر رہی تھی۔

"واٹ ڈونٹ ٹیل می یور آر جوکنگ۔" وہ حیرت زدہ رہ گیا۔

"نہیں۔ کبھی ضرورت نہیں محسوس نہیں کی فون جو ہے۔" وہ اس کی اتنی زیادہ حیرت پر تھوڑا سا شرمسار ہو ہی گئی۔

"یہ ضرورت نہیں میری جان! جیسے سانس لینے کے لیے آکسیجن ایسے ہی ہے زندگی کے سیل فون..... اوکے۔ میں اس ہفتے تمہیں ایک خوب صورت سا سیل فون گفٹ کرتا ہوں، رات کو پھر مجبوراً مجھے اس کے نمبر پر فون کرنا پڑے گا، اوکے ویٹ کرنا پھر جی بھر کر باتیں کریں گے اور ایک بات....." وہ ریسیور رکھتے رکھتے رکی۔

"تمہاری آواز تو تمہاری تصویروں سے بھی زیادہ دلنشین ہے ایمان سے۔ تمہارے یہ مختصر سے ہاں، نہیں، جی، آپ سیدھا میرے دل کی کھڑکی دروازے گیٹ سب کھول کر ماسٹر بیڈ روم میں برا جمان ہو گئی ہے۔ اس لمحے سوچ رہا ہوں جب تم خود سچ مچ اپنے خوب صورت وجود اور حسین..... کھنکتی آواز کے ساتھ میرے ساتھ کمرے میں ہو گی تو میری کیا

حالت ہو گی؟ یہ میں تمہیں رات کو بتاؤں گا، اوکے ٹیک کیئر بائے۔ بہت خوش ہوا ہوں تم سے بات کر کے۔ اپنا بہت زیادہ خیال رکھنا۔ اب تمہیں اپنا خیال میری امانت سمجھ کر رکھنا ہو گا۔ سمجھیں بائے۔"

لائن کیا بے جان ہوئی۔ اس کے سینے میں رکتی سانسوں کو جیسے صدیوں بعد تازہ ہوا کا جھونکا ملا تھا۔ ریسیور کریڈل پر پٹخ کر وہ بے دم سی ہو کر گر گئی۔

اس نے رات پونے گیارہ بجے چپکے سے فون کا پلگ پیچھے سے نکالا تو نہیں مگر اتنا پیچھے کر دیا کہ فون سے رو ہی معطل ہو گئی۔

اس کی حالت ان تین چار گھنٹوں میں نہیں سنبھلی تھی محض ایک فون کال کے باعث تو اگر وہ رات کو اس کا فون سن لیتی تو..... شاید ہفتوں نہ اٹھ پاتی جیسے کہ اس کے عزائم نظر آ رہے تھے۔

گیارہ بجے وہ آ کر تسبیح لے کر لیٹ گئی مگر کوئی بھی ورد، کوئی بھی کلمہ اس کے دل کو پُر سکون نہیں کر رہا تھا جب جب نگاہیں کلاک پر آگے پیچھے سست روی سے بھاگتی سوئیوں پر پڑتیں دل کے اضطراب میں کچھ اور بھی اضافہ ہونے لگتا۔

امی نے اس سے کچھ پوچھا تو نہیں تھا مگر پیر جلی بلی کی طرح ان کا اندر باہر پھرنا اسے ان کی بے چینی کا پتا دے گیا تھا۔

لامحالہ وہ خود کو فون سننے پر مجبور کر بھی لیتی تو رات کو بات کرنے کے لیے اسے امی سے پوچھنا پڑتا۔ وہ کیسے ان سے بات کر سکتی تھی، وہ کیا کہتیں کہ کہاں تو وہ ایک بار بات کرنے پر رضامند نہیں ہو رہی تھی، اور اب رات کو خود سے بات کرنا چاہ رہی ہے، پھر رات کو ابو اکثر اسے اپنے کمرے میں بلا کر نو سے دس بجے کے دوران صحیح بخاری کی احادیث سنایا کرتے تھے، اور کیا دل سے وہ پڑھا کرتی تھی۔ اتنی نیک مجلس سے اٹھ کر وہ شیطان کی آلہ کار بن جاتی۔ یہ کیسے ممکن تھا؟

اس نے دن بھر میں خود کو سمجھا لیا تھا کہ منگیتر سے ہائے ہیلو کہہ لینے میں کوئی حرج نہیں مگر شہروز نے جس طرح اس سے کھلے ہوئے انداز میں بات کی تھی، اس نے واقعی اسے باور کرا دیا کہ وہ شیطان کے جال میں پھنسنے جا رہی ہے۔

رات تو کروٹیں بدلتے ہی گزری تھی۔ عجیب سے آلودہ پن کا احساس اسے ہوا جا رہا تھا اور بہت عرصے بعد اس نے فجر کی نماز بڑی کسلمندی اور بے زاری سے بالکل تنگ

پڑتے وقت میں ادا کی تھی، اور اس کے بعد جو سوئی تو نو بجے ہی اٹھی تھی اور اسے حیرت ہوئی امی نے بھی اسے نہیں اٹھایا تھا۔ ورنہ وہ تو صبح کی نماز کے بعد سوتی نہیں تھی۔ سب کا ناشتہ بھی خود ہی بنایا کرتی تھی۔ وہ منہ ہاتھ دھو کر باہر آئی تو امی سبزی بنا رہی تھیں۔

''امی! آپ نے ناشتہ کرلیا۔''

''نہیں۔ بنالاؤ۔'' امی نے اس کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا تھا نہ جانے رات بھر میں دونوں کے درمیان کیسا حجاب سا آگیا تھا۔ امی کل رات ہی سے اس سے نظر ملائے بغیر بات کر رہی تھیں۔

''صنوبر اندر پڑھ رہی ہے، اس نے بھی چائے نہیں پی۔ بس ناشتہ کرکے اب بازار چلو۔ کل بھی تم نے کہا۔ میرے سر میں درد ہے، تمہارے ابو رات بھی پوچھ رہے تھے۔'' چائے بنانے کے دوران اسے امی کی خفا خفا سی آواز سنائی دی نہ جانے کیوں اسے محسوس ہو رہا تھا کہ امی اس سے کچھ ناراض سی ہیں۔ ناشتے کے بعد وہ ان کے کہے بغیر سالن چولہے پر چڑھا کر بازار کے لیے تیار ہوئی تھی۔

''چلیں امی!'' وہ سیاہ عبایا پہن کر ان کے ساتھ چلنے کو تیار تھی۔

انہیں بازار میں تین گھنٹوں سے بھی زائد لگ گئے۔ وہ گھر تھکی ہاری لدی پھندی داخل ہوئی تھیں۔

''امی! شہروز بھائی کا فون آیا تھا۔ سمیعہ کا پوچھ رہے تھے۔'' وہ ابھی لاؤنج میں بیٹھی بھی نہیں تھیں کہ صنوبر نے انہیں پیغام دیا۔ اس کا دل تیزی سے دھڑکا تھا۔ عبایا اتار کر دوپٹہ پہنتے اس کے ہاتھ لرز رہے تھے۔

''اچھا.....'' امی کے چہرے کا بھی رنگ بدلا تھا۔

''سنو، اپنے ابو کے سامنے ایسی پیغام رسانی مت کرنا اور نہ عدیل کے سامنے بلکہ .....میری غیر موجودگی میں کسی کا بھی فون آئے تو اٹینڈ کرنے کی ضرورت نہیں۔'' وہ روکھی سی آواز میں بولیں۔

''جی .....'' صنوبر حیران سی کھڑی رہ گئی۔ اس نے ایسا حکم نامہ پہلی بار سنا تھا۔

''اور اگر ہمارا فون ہو مطلب دوست وغیرہ کا۔'' وہ اسی حیرت میں بولی۔

''سی ایل آئی لگی ہوئی ہے نا، نمبر دیکھو پھر اٹینڈ کرو اور اب جلدی سے کھانا لے آؤ ظہر کا ٹائم تو رہا نہیں۔''

ان کے کہنے سے پہلے سمیعہ اٹھ کر جا چکی تھی۔

''کیا شہروز بھائی کا پہلے بھی فون آیا تھا۔ ہائے سچی وہ تو اتنے بے تکلف سے اور اچھے ہیں کہ میرے دل سے تو سارا ڈر نکل گیا۔ خوف ناک سے دولہا بھائی کے متعلق۔ مجھے تو لگتا تھا ابو نے تمہارے لیے بھی کوئی اپنا جیسا مولوی ڈھونڈا ہوگا۔ وہ تو بہت مختلف ہیں۔ پتا ہے میری دوست زویا کی بہن کی منگنی بھی پچھلے ماہ ہوئی ہے کہ اس کا فیانسی بھی دبئی میں رہتا ہے زویا بتاتی ہے دونوں کے درمیان دن میں چار گھنٹے اور رات میں ...... ساری رات باتیں ہوتی رہتی ہیں اللہ جانے کون سی اتنی باتیں ہوتی ہیں جو کئی کئی راتیں جاگ کر بھی پوری نہیں ہوتیں اور مقام حیرت کہ انہیں نیند بھی تنگ نہیں کرتی اور یہ امی کو کیا ہوا ہے؟''

وہ خاموشی سے کھانا گرم کرکے ڈونگے میں نکالنے لگی۔ باہر پھر فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔

اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ صنوبر مزے سے کھڑی سلاد کی پلیٹ سے کھیرے اور گاجریں چن چن کر کھا رہی تھی۔

''لے جاؤں میں۔'' صنوبر نے پوچھا تو اس نے سرہلا دیا۔ وہ ٹرے اٹھا کر باہر نکل گئی۔

''آجاؤ تم بھی۔'' وہ جاتے جاتے اسے بھی آواز لگا گئی۔

امی فون میں مصروف تھیں۔

اور بظاہر مسکرا مسکرا کر باتیں بھی کر رہی تھیں نہ جانے کس کا فون تھا، اس کی تو جیسے بھوک ہی مر گئی تھی حالانکہ بازار میں اتنی بھوک لگ رہی تھی، امی نے دو بار چاٹ یا دہی بھلے کھانے کے لیے پوچھا بھی، اس نے ''نہیں گھر جا کر کھانا کھائیں گے'' کہہ کر انکار کردیا اور اب کھانا سامنے تھا اور اس کو بھوک نہیں تھی۔ امی نے انہیں کھانا شروع کرنے کا اشارہ کیا تھا۔ ثوبیہ، صنوبر اور عدیل خوش گپیوں کے دوران کھانا شروع کرچکے تھے وہ اسی طرح بیٹھی تھی۔

''کھاؤ نا۔ تم کیوں نہیں کھا رہی؟'' امی فون رکھتے ہی ان کی طرف آتے ہوئے اسے یوں بیٹھے دیکھ کر بولیں تو وہ بے دلی سے کھانے لگی۔

☆

''سمیعہ!'' وہ کچن سے رات کے کھانے کے برتن دھو کر اور کچن صاف کرکے باہر نکلی تو امی نے اسے آواز دی۔

''جی امی!'' وہ تولیے سے ہاتھ رگڑتی اندر آگئی۔ دوبارہ شہروز کا فون نہیں آیا تھا اور اس نے دل میں شکر کیا تھا۔

"سونے جارہی ہو؟"

"نہیں امی! ابھی تو نماز پڑھنی ہے، آج ڈراما دیکھنے بیٹھ گئی اور نماز لیٹ ہوگئی۔"

ان کے گھر کیبل بھی نہیں تھی۔ ابو کیبل کے سخت خلاف تھے، ان کے ٹیرس پر لگا انٹینا پورے علاقے میں ایک ہی تھا اور دور سے دیکھنے پر خاصا عجیب سا لگتا، شاید چند سالوں بعد بڑے ہونے والے بچے اس عجوبے کے بارے میں ضرور دریافت کریں گے کہ یہ ڈنڈا کیا ہے؟

"تمہارے ابو تو لیٹ گئے ہیں، کچھ طبیعت نہیں ٹھیک ان کی۔" وہ بولیں۔

"کیوں کیا ہوا، میں پوچھ آؤں۔" وہ بے چین ہو کر جانے لگی۔

"نہیں۔ یونہی سر میں درد ہے، گولی دے آئی ہوں۔ صنوبر تو آج جلدی لیٹ گئی، کہتی تھی سارا دن پڑھتی رہی ہے۔ ثوبیہ اور عدیل کمپیوٹر پر بیٹھے ہیں۔" وہ نہ جانے کیا کہنا چاہ رہی تھیں اچانک اس کا ماتھا ٹھنکا۔ وہ کلاک کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

"تم نماز پڑھ کر ادھر ہی آبیٹھو میں اندر جارہی ہوں تمہارے ابو کو دیکھوں...... اور وہ......" وہ رُک گئیں۔

"دوپہر میں روبینہ کا فون آیا تھا...... وہ شہروز تم سے بات کرنا چاہ رہا ہے، ابھی گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ میں اس کا فون آئے گا، بیل تو میں نے سلو کردی ہے، پھر بھی تم پہلی بیل پر اٹھا لینا۔ کہیں تمہارے ابو کے کانوں میں آواز نہ پڑ جائے۔ زیادہ لمبی بات نہ کرنا ذرا طریقے سے کہ اسے برا بھی نہ لگے۔ کیا کریں آج کل کا زمانہ...... مجبوری ہے اور تم پریشان نہ ہو یونہی اسے شوق ہے ورنہ اچھا لڑکا ہے ہر طرح سے۔ تمہارے ابو کل بھی بتا رہے تھے ان کا کوئی دوست کئی سالوں سے برلن میں ہی وہ رہا ہے۔ وہ ملنے آیا تھا تو بتا رہا تھا تم فکر نہ کرو۔"

وہ جاتے جاتے یونہی اس کا کندھا تھپک کر بولیں تو اس کا بے اختیار جی چاہا ان کے گلے لگ کر رو دے، مگر وہ رو بھی نہیں سکتی تھی، ان کی مجبوری کا طوق اسے ہی اٹھانا تھا اور طوق اٹھانا بھی تھا اور سر کو جھکانا بھی انہیں تھا۔

☆

اس نے پہلی بیل پر جھپٹ کر ریسیور اٹھا لیا تھا۔

سب سو چکے تھے۔ ان کے گھر میں تو یوں بھی عشاء کی نماز کے بعد سب بستروں کا رخ کرتے تھے، آج تو ثوبیہ اور عدیل نے پھر بھی دس بجا دیے تھے، اسے لاؤنج میں ٹی وی کے آگے بیٹھے دیکھ کر دونوں حیران تو ہوئے تھے اور بیٹھنا بھی چاہا تھا اس کے ساتھ۔ امی نے

باہر آکر دونوں کو بھگا دیا۔

مگر بیل بجنے کے ساتھ اس کا دل دھڑکا تھا، جیسے سب کچھ ہاتھوں سے نکل گیا اختیار بھی اور بے اختیاری بھی۔

"سخت ناراض ہوں میں تم سے وعدہ خلاف لڑکی! یہ کیا طریقہ ہوا بھلا رات میں چار گھنٹے تک پاگلوں کی طرح ٹرائی کرتا رہا، بیل جائے اور ریسیور کرنے والا غائب۔ ساری رات میں اس بے چینی میں سو نہیں سکا۔ یہ کیا طریقہ تھا بھلا؟" پہلی بار کی طرح اس بار بھی اس نے نہ تو اس کا سلام سنا تھا نہ جواب دینے کی زحمت کی تھی۔ ہیلو کہتے ہی خفا انداز میں اس پر برسنے لگا تھا۔

"معلوم نہیں۔ فون تو بالکل ٹھیک تھا۔" اس نے بھنچی بھنچی آواز میں وضاحت کرنے کی کوشش کی۔

"اور دکھ کی بات کہ میرے پاس تمہارا دوسرا کوئی کانٹیکٹ نمبر بھی نہیں تھا۔ بھلا اس طرح کسی کو تڑپاتے ہیں۔" اس کی بات پر اس کے چہرے کے مساموں سے پسینہ پھوٹنے لگا۔

"سوری اس میں بہرحال میرا قصور تو نہیں تھا۔" اس نے لاؤنج میں جلتی زیرو پاور کی روشنی میں گھڑی کی سوئیوں پر نگاہ جمائی۔

"بیوٹی فل! ایک بار پھر کہو اسی دلنشین لہجے میں سوری۔" وہ جیسے کھل اٹھا۔

"اور وہاں میں نے تمہارے لیے آج ہی اتنا خوب صورت سیل فون خریدا ہے۔ آپا سے ایڈریس لکھوایا اور کل تک کوریئر کردوں گا، پھر تو آرام سے بستر میں لیٹ کر باتیں کرنا، پھر دیکھتا ہوں کیسے تمہیں کھلتیں تمہاری...... آج کل ادھر کا موسم اتنا حسین ہو رہا ہے۔ کیا بتاؤں میں تو آج بھی آپا سے کہہ رہا تھا کہ بس آپ جلد سے جلد تیاری کریں۔ رقم تو میں نے ان کے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کروا دی ہے، تم دو چار دنوں میں ان کے ساتھ شاپنگ پر چلی جانا۔ اچھا دفع کرو شاپنگ کے موضوع کو۔ اس وقت تو بس کچھ بے چینیوں کا کچھ دل بے تاب کی بے تابیوں کا ذکر ہو جائے رات کو تمہیں نیند آگئی تھی مجھ سے بات کیے بنا۔" اس نے ایک دم سے پوچھا تو اس کی نگاہوں میں رات بھر کروٹیں بدلنے کا منظر گھوم گیا۔

"نہیں آئی نا۔ مجھے بھی نہیں آئی۔" اس نے لمحہ بھر اس کے جواب کا انتظار کیا اور پھر خود سے اخذ کرتے ہوئے بول اٹھا۔ اس کی پلکیں خود بخود لرزنے لگیں۔

"آج تم نے کس کلر کے کپڑے پہنے ہیں؟" اس کا لہجہ نشیلا سا ہو رہا تھا۔

"باٹل گرین۔" وہ آہستگی سے بولی۔

"کون سی باٹل نشے سے بھری...... میں نے کبھی پی نہیں اور آج کل میرا جی چاہ رہا ہے۔ تمہیں تصور میں سامنے بٹھاؤں اور پیگ پہ پیگ چڑھاتا جاؤں۔ سمو! میرا دل بے قابو ہوا جاتا ہے جب تمہارے بارے میں سوچتا ہوں کب آؤ گی .... تمہاری گردن کیسی ہے صراحی دار آبی پرندوں کی طرح اٹھی ہوئی یا...... نشے کی بوتل کی طرح اٹھی ہوئی۔ بتاؤ نا!"

وہ حواس باختہ ہوگئی تھی بے اختیاری میں اس کا ہاتھ اپنی دودھیا گردن پر جا رکا تھا۔

"مجھے تصویروں میں تمہاری گردن بہت اچھی لگی ہے۔ کتنی خوب صورت ہے، شفاف اور دودھ جیسی اور کمان کی طرح اٹھی ہوئی۔ پتا نہیں کتنی بار اسے......" اف اس کے کانوں سے دھواں سا نکلنے لگا۔

دل کی جو حالت تھی، سو تھی، وہ ابھی اور کتنے آگے تک جا کر کھلے گا اسے اندازہ ہو رہا تھا۔

"اچھا سنو تم بیٹھی ہو یا لیٹی ہو۔" اگلا جملہ سنتے ہی وہ جو نیم دراز سی تھی جھٹکا کھا کر اٹھ بیٹھی تھی۔

"جی......" اس کے حلق سے گھٹا ہوا "جی" نکلا۔

"لیٹ جاؤ نا...... لائٹ جل رہی ہے یا......" اسے لگا وہ ابھی بے ہوش ہو جائے گی۔

"تم نے سلمیٰ ہائیک کی accessions دیکھی ہے یار! آج دیکھ کر آیا ہوں قیامت ہے تم آؤ تو مل کر دیکھیں گے، مجھے john trovolta بھی بہت پسند ہے اور تمہیں؟"

یہ کون سی مخلوق تھی اس کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی شاید کوئی اداکار وغیرہ تھے "مجھے Bay Watch فلمیں پسند ہیں۔ ساحل کی نرم نرم ریت پر دراز حسین لڑکیاں میرے اندر کیسی ہلچل مچاتی ہیں تمہیں کیا بتاؤں...... اچھا تم بور تو نہیں ہو رہیں یار! کچھ بولو تو سہی۔"

اسے اس کی خاموشی کا احساس ہو ہی گیا تھا۔

"آپ پاکستان کب آئیں گے؟" اس نے جان چھڑانے کو موضوع بدلنا چاہا۔

"اب تو اپنی جان کو لینے ہی آؤں گا۔ کیا بے چین ہوگئیں میری طرح میری باتیں سن کر۔ ہاں میرا بھی ایسا ہی حال ہے کیا بتاؤں؟ چھٹی کا مسئلہ نہ ہوتا تو ایک مہینے سے زیادہ اس انگیج منٹ کو نہ لٹکاتا ویسے اس پریڈ کا بھی اپنا ہی مزہ ہے تم نے بتایا نہیں تم بیٹھی ہو کہ لیٹی؟"

"اوہ لائٹ چلی گئی پھر بات کریں گے میں......" اس نے فون بند کرنے کا بہانہ ڈھونڈا۔

"واؤ کاش میں تمہارے پاس تمہارے......" اس سے پہلے وہ کچھ اور کہتا، اس نے بے اختیار ریسیور کریڈل پر ڈال دیا اور کانوں پر دونوں ہاتھ رکھ کر سر گھٹنوں میں چھپا کر بیٹھ گئی۔ اسے پتا بھی نہیں چلا۔ وہ رو رہی تھی۔

☆

تیسرے ہی دن اسے کوریر کے ذریعے سیل فون مل گیا تھا۔ سمیعہ نے بہانہ کر دیا مجھے ٹھیک سے آپریٹ کرنا نہیں آتا تو اسے غصہ آ گیا مجبوراً اسے سیل سے بات کرنا پڑی۔ وہ اس کی ہر کال کے بعد اللہ سے توبہ کرتی معافی مانگتی اور دل میں عہد کرتی اب اس کی کال ریسیو نہیں کرے گی، پھر اس کی مجبور صورت...... مگر اب معاملہ اس کی برداشت سے باہر ہوتا جا رہا تھا۔

انڈر اسٹینڈنگ اور Vulgarity (فحاشی) میں کچھ تو فرق ہونا چاہیے اس کا ضمیر اسے کچوکے لگاتا اور اندر کا گلٹ مارے ڈالتا کہ وہ کوئی ثواب نہیں کما رہی اپنے سارے نیک عملوں کو اپنے ہاتھوں سے آگ میں جھونک رہی ہے۔

نماز سے یکسوئی تمام ہوئی۔ قرآن میں دل لگنا اچاٹ۔ یوں لگتا جیسے وہ ناپاکی کی حالت میں اپنے رب کے سامنے کھڑی ہے۔ بیٹھے بیٹھے اٹھ کر وضو کرنے چل دیتی مگر پھر بھی گندگی میں لتھڑنے کا احساس دن بدن بڑھتا جا رہا تھا۔

ایک دن یونہی ثوبیہ اور صنوبر کو باتیں کرتے سن کر اس نے Bay Watch فلموں کے بارے میں پوچھا تو دونوں لمحہ بھر کو چپ رہ گئیں۔

"آپی! آپ کا وضو ٹوٹ جائے گا کیا کریں گی جان کر ایک بار برلن جا کر اپنی آنکھوں سے ملاحظہ فرما لیجیے گا پھر ہمیں بھی بتایئے گا۔" ثوبیہ ہنس کر بولی تھی وہ دونوں اس سے چھوٹی تھیں اور ان کا نالج، اس سے کہیں زیادہ تھا۔

"ایمان والوں کا جینا آخری زمانوں میں کیسا دشوار ہو جائے گا۔" اسے صحیح بخاری میں پڑھی احادیث یاد آئیں کہ "ایمان کا رکھنا ایسے ہوگا جیسے ہتھیلی پر جلتا انگارہ رکھنا۔"

آج اسی طرح تو ایمان والوں کی ہنسی اڑائی جا رہی تھی۔ تمسخر کی نگاہ سے انہیں دیکھا جا رہا تھا کبھی انہیں انتہا پسند کا نام دیا جاتا تو کبھی Fundamentalist (بنیاد پرست) اسے اب وہ سب سمجھ میں آ رہا تھا جو دنیا میں ہو رہا تھا۔

"امی! ایک بات کہوں؟" وہ اس کے جہیز کے بستروں پر دھوپ لگوا رہی تھیں۔

"ہاں بولو۔" انہوں نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

"امی آپ......! امی آپ ان لوگوں سے کہیں...... کہ...... نکاح کر لیں۔" اس نے کس طرح یہ جملہ بولا تھا، اس کا دل ہی جانتا تھا۔ جھکی پلکیں آنکھوں سے امڈتی نمی کو روکنے کی سعی کر رہی تھیں۔

امی کے ہاتھ وہیں تھم سے گئے۔

انہوں نے اس سے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔

وہ اس کی ماں تھیں۔ اس کی ہر کیفیت کا سبب جانتی تھیں۔ یقیناً سمجھ گئی تھیں۔ بس ایک گہرا سانس لے کر پھر اپنے کام میں لگ گئیں تو وہ مردہ قدموں سے اٹھ کر آ گئی۔

اس کے موبائل پر I Love You کی دلکش ٹیون بجے جا رہی تھی، اس نے بے بسی سے اسکرین پر چمکتے نمبر کو دیکھا اور موبائل وہیں رکھ کر کمرے سے باہر نکل آئی۔

وہ امی سے کہنا چاہتی تھی۔ "امی! میرے احساس جرم کو شرع کی زنجیر پہنا دیں تو شاید یہ گلٹ کچھ کم ہو سکے۔"

گلٹ تو کیا کم ہوتا...... امی کا روبینہ سے یہ کہنا ہی قیامت ہو گیا۔

"ایسی بھی کیا بے اعتباری آنٹی جی! ہم کہیں بھاگے جا رہے ہیں، اور آپ کی بیٹی نے چار دن میرے بھائی سے کیا بات کر لی آپ نے سمجھا میدان مار لیا صحیح کہا ہے سیانوں نے، صورتوں پر نہ جاؤ۔ یہ منہ پر رام رام کرنے والے اندر سے کیسے تھڑدلے اور گنوں کے پورے ہوتے ہیں مجھے تو تجربہ ہو گیا۔ آپ کی مہربانی ہمیں ایسی بے اعتبار رشتہ داری میں بندھنے کا کوئی شوق نہیں آپ اپنی بیٹی سے کہیں شہروز سے بات کرے، میں تو نہیں کہوں گی، اور میری طرف سے رشتہ ختم سمجھیں۔"

اس سے پہلے کہ امی گھگھیا کر کوئی معافی تلافی، منت سماجت کے الفاظ کہتیں۔ انہوں نے کھٹ سے فون بند کر دیا۔

ابو نے تو گھر میں یہ سنتے ہی جیسے آفت ڈھا دی۔

"ایسی کیا آفت پڑی تھی تم پر کہ تم نے کھٹ سے نکاح کا مطالبہ کر دیا، ہماری بیٹی کیا ہم پر بھاری تھی، کیوں خود کو بے قدر بے توقیر کر دیا۔ تم نے ساروں کے بیچ میری عزت دو کوڑی کی نہ رہنے دی۔" ابو تو غصے میں بولتے ہوئے کسی کی بات بھی نہیں سنتے تھے، وہ امی پر

جو برسنا شروع ہوئے تو لمبی رفاقت کو بھلا کر گالی گلوچ پر اتر آئے۔ امی نے رونا شروع کر دیا۔

اور اسے تو خود نہیں پتا تھا کہ اس کا یہ معصوم سا تقاضا، ایک جائز مطالبہ ایسی آفت برپا کر دے گا۔ وہ لوگ ایک ناجائز اور غیر شرعی کام کو تو ہنسی خوشی وقت کا تقاضا کہہ کر اس پر مسلط کیے جا رہے تھے، جو اس نے ایک جائز بات کہہ دی۔

"اور اس سے زیادہ صدمہ تو سمیعہ کو تب پہنچا جب اس نے اپنے کانوں سے ابو کو یہ کہتے سنا۔

"کیا تھا فون پر بات ہی کرنا تھی تو کر لیا کرتی۔ دو چار مہینوں کی بات تھی، صبر نہیں تھا اس میں۔ آج کل جائز ناجائز کون دیکھتا ہے یہ تمہاری الٹی تربیت ہے ایسا اچھا رشتہ...... ہائے اتنے سال در در دھکے کھا کر دیکھ لیا نا نہ اپنوں میں نہ غیروں میں، ابھی دو اور بیٹھی ہیں۔ کیا کروں گا، میں شادی کی ڈیٹ فکس کرنے کا سب کو بتا رہا تھا، اب رشتہ ٹوٹنے کی خبر کیسے دوں؟ تم اس کی بہن سے بات کرو منت کرو کوئی حل نکلے معذرت کر لو مگر......" اس کے کانوں کو تو یقین ہی نہیں آیا کہ یہ اس کے ابو ہیں جن کی روشن پیشانی پر اتنا بڑا محراب ہے اور جو تہجد کے وقت جب سجدے میں جاتے ہیں تو، جیسے سر اٹھانا بھول جاتے ہیں۔ وہ کہہ رہے تھے کہ کیا تھا اگر فون پر بات کر لیتی۔

یہ اس کے ابو تھے جو روز رات کو اس سے صحیح بخاری سنتے تھے اور احادیث سن کر ان کی آنکھیں اشک بار ہو جایا کرتی تھیں اور دل رقیق ہوا جاتا۔ وہ کہہ رہے تھے، یہ تمہاری الٹی تربیت ہے کہ آج کل کون دیکھتا ہے جائز ناجائز کو......

وہ ابو جو کہتے تھے کبھی کسی درگاہ کسی دربار جا کر ماتھا نہ ٹیکنا۔ اپنے نفس اپنی ذات کے لیے یا اپنی اولاد کی کسی غرض کے لیے مشرک ہو جاؤ گی...... وہ کہتے تھے، اولاد دنیا کا مال ہے اور فتنہ ہے، اس فتنہ کے جال میں نہ آنا...... وہ کہہ رہے تھے در در بھٹکنا یاد ہے۔ ابھی دو اور بیٹھی ہیں۔ اس کے وہ متقی پرہیزگار ابو جن کے لبوں پر اکثر ایک ہی شعر رہا کرتا تھا۔

ع وہ اک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

امی سے کہہ رہے تھے اس کی بہن کی جا کر منت کرو معافی مانگو۔

وہ کمرے میں جا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ زمین شق ہو اور وہ اس زمین میں سما جائے...... دنیا کیا ہے؟ آج محض وقت کے ایک پلٹے نے اسے بتا دی تھی اس دنیا کی حقیقت

......اس دنیا کی حقیقت بے ثباتی ہے اور بس......

اور یہ حقیقت جان لینے کے باوجود اسے چین نہیں آ رہا تھا۔ آنکھوں نے ساون کی جھڑی سے گٹھ جوڑ کر لیا تھا۔

پھر ایک ایک کر کے دن بیتتے چلے گئے۔

امی کا روبینہ کی طرف جانا بھی بے کار رہا، انہوں نے تو ماتھے پر آنکھیں رکھی ہوئی تھیں۔

''ہمارا سامان واپس کر دیں تو میں آپ کا بھی بھجوا دوں گی۔'' انہوں نے رکھائی سے کہا تو ان کے پاس اٹھ آنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا۔

پھر دونوں طرف خاموشی چھا گئی۔ امی نے منگنی کا سارا سامان، جوتے، کپڑے، میک اَپ، انگوٹھی سب ان کے سوٹ کیس میں بند کروا دیا۔ ساتھ ہی اس کے دھڑکتے دل سے زندگی کی رمق بھی۔ وہ تو جیسے زندہ لاش سی ہو گئی تھی۔

اپنی ہی زندگی وہ پرائی زندگی کی طرح بتا رہی تھی۔

اس دن کے بعد فون اور سیل فون دونوں چپ کر گئے۔

ابو کی تہجد، ان کے سجدے اور بھی طویل ہو گئے تھے۔ خاندان میں آنے جانے والوں نے نہ جانے کیا سونگھا کہ بنا کچھ کہے جیسے ہر کوئی یہ کھلا راز جان گیا تھا، اور جب وہ پرسے کے سے انداز میں اظہار افسوس کرتے تھے تو اس کا جی چاہتا زہر کھا لے۔

شاید اس کی برداشت تمام ہو جاتی اور وہ کچھ کر ہی گزرتی کہ ایک شام اچانک روبینہ اپنے شوہر بچوں اور شہروز کے ساتھ آ گئیں۔

وہ چھٹی کا دن تھا اور شام کی چائے کے بعد ابو اخبار پڑھ رہے تھے۔ امی پنج سورہ اور وہ کمرے میں گم صم پڑی تھی۔

جب عدیل نے بھاگتے ہوئے اندر آ کر اسے اطلاع دی تھی۔

''آپی! آپ کے سسرال والے اور شہروز بھائی آئے ہیں۔''

وہ اسپرنگ کی طرح اچھلی تھی، بے یقینی سے اس کی طرف دیکھتی رہی اور تھوڑی ہی دیر میں روبینہ بیگم ہنستی مسکراتی اندر آ کر اسے گلے لگا کر چومنے چاٹنے لگیں۔

اگلی شام اس کا نکاح تھا۔

''سب پیپرز تیار کروا کر لایا ہے، شہروز صرف نکاح نامہ اٹیچ کریں گے تو سمیعہ کا

بھی ویزا لگ جائے گا۔''

وہ پچھلی ساری کدورت سارا غصہ بھلا کر کہہ رہی تھی۔ امی ابو تو حیرت خوشی میں کوئی سوال بھی نہیں کر رہے تھے۔

سوال تو اس کے دل میں مچل رہے تھے۔ اپنی بے وقعتی کا احساس ہر خوشی کی کیفیت پر غالب تھا کہ نکاح کے فوٹو سیشن کے دوران سب کے کہنے کے باوجود مسکرا بھی نہیں سکی۔

''بس دس منٹ۔ اس سے زیادہ نہیں اجازت ملے گی۔ ہماری بھابی بہت شرمیلی ہے۔ سن لیا تم نے، اب رخصتی میں صرف پندرہ دن ہیں پھر دل کے ارمان پورے کرنا۔''

وہ ابھی کمرے میں آ کر بیٹھی ہی تھی کہ روبینہ کی پُر جوش آواز سنتے ہی اس نے اپنا سر جھکا لیا تھا۔

''دل کے ارمانوں کی کیا بات کرتی ہیں۔ وہ تو ہم ابھی بھی نکال سکتے ہیں۔ آخر ہماری منکوحہ ہیں۔ کوئی خالی خولی منگیتر تو نہیں۔ کیوں ڈیئر فیانسی!'' وہ اس کے بالکل پاس صوفے پر آ کر بیٹھا تھا۔

''اچھا اب ایسی بھی کیا ناراضی۔ ایک بار مسکرا دو۔ یوں تصویریں اتروا رہی تھیں جیسے میں تمہیں بھگا کر لے جا رہا ہوں۔'' اس نے انگلی سے اس کی ٹھوڑی کو چھوا۔

''اب پتا نہیں۔ تم کس بات پر ناراض ہو، وہ جو میں تم سے اتنی کھلی ڈلی، حرف عام میں بے ہودہ باتیں کرتا تھا۔ اس پر خفا ہو تو ڈیئر اس کی وضاحت کر دوں۔ میرا دوست ہے۔ نام نہیں لوں گا، ورنہ وہاں جا کر تم اس سے خوامخواہ کا بیر باندھ لو گی، اس نے کہا تھا کہ جی بھر کر اپنی منگیتر سے واہیات گفتگو کرنا اگر تو وہ ایسی ویسی لڑکی ہو گی تو تمہارے ساتھ اس دلدل میں بہ خوشی اترتی جائے گی اگر اچھی ہوئی جیسا تم بتاتے ہو تو یقیناً رشتہ توڑنا منظور کرے گی تم جیسے گھٹیا بندے کو برداشت کرنے سے انکار کر دے گی۔

اور یہ سب اس بے ہودہ انسان کی سازش تھی اور میں نے بھی یونہی تمہیں آزمانے کے خیال سے......سوری سوری......غصہ نہیں کرنا......میں تو پہلے دن ہی سمجھ گیا تھا۔ آپا نے میرے لیے کیا ہیرا ڈھونڈا ہے۔ بائی گاڈ میں بالکل بھی ویسا نہیں ہوں، جیسی کھلی کھلی باتیں تم سے کرتا تھا۔ میرا یقین کرو اور تمہاری طرف سے نکاح کے مطالبے پر آپا، بھڑکی تھیں جب کہ مجھے سند مل گئی تھی کہ قدرت نے میری قسمت میں اس دنیا کی آدھی جنت لکھ دی ہے کہ جسے تم جیسی نیک طبیعت، خوب سیرت، خوب صورت بیوی مل گئی اسے بہشت کی کیا تمنا ہو گی اب تو

خفا نہیں ہو اگر ہو تو پندرہ دن بعد عملی محبت کا مظاہرہ کر کے تمہاری خفگی دور کر دوں گا، پلیز اب تو مسکرا دو۔" وہ خوشبوؤں میں بسا اس کے بے حد قریب چہرہ کیے اسے دیکھ رہا تھا، اور وہ کوشش کے باوجود بھی مسکرا نہیں سکی تھی۔

"ٹائم از اوور نکلو یہاں سے۔" روبینہ کے ساتھ صنوبر اور ثوبیہ بھی تھیں۔

وہ آپس میں ہنسی مذاق کرنے لگیں۔

اور وہ دل میں سوچ رہی تھی، وہ تو اسے آزما چکا اور اب اپنے منہ سے کہہ رہا ہے میں، ویسا نہیں جیسا فون پر تھا تو یہ اس کے الفاظ ہیں۔ وہ اسے کیسے پرکھے گی اور اگر وہ ویسا نکلا جیسا فون پر تھا۔ پھر تو کوئی راہِ فرار بھی نہیں ہو گی۔

یہ کیسی دنیا ہے اور کیسے اس کے اندھے پیمانے جس میں ایک مرد تو اپنی ہونے والی بیوی کو پرکھ سکتا ہے، جو اس کی پرکھ پر پوری نہ اترے تو وہ اسے لات مار کر خود سے دور پھینک دے اور جو پوری اترے تو اپنی زندگی کا حصہ بنا لے۔ یہ کیسا ترقی یافتہ زمانہ تھا کہ ابھی بھی اپنانے اور ٹھکرانے کے سارے اختیار مردوں کے ہی پاس تھے۔

یہ ایک دکھ دینے والا سدا بہار احساس تھا مگر اس کے باوجود اسے مسکرانا تھا۔ کیونکہ شہروز ایک بار پھر اس کے پہلو میں آ بیٹھا تھا، بائیں طرف ابو اور امی اور پیچھے روبینہ باجی کی فیملی اور اس کی بہنیں۔

"بھئی۔ اب مسکرانا ہے پتا تو چلے تمہارا نکاح ہے۔ خوشی کا موقع نہ کہ کسی سزا کا اعلان۔"

کون بولا تھا اسے نہیں پتا چلا مگر ایک بے اختیار سی مسکراہٹ اس کے سجے سنورے چہرے پر نور کی طرح پھیل گئی۔

دل دار

یہ ہے پاکستان ریڈیو اسٹیشن لاہور اور آپ سن رہے ہیں فرمائشی نغموں کا پروگرام "آپ کی فرمائش" یہ پروگرام آپ کے لیے ہے اور آپ کی فرمائشوں سے سجایا جاتا ہے تو ہی پہلی فرمائش کی ہے حیدر آباد سے علی عمران اور ان کے ساتھی امان فہیم نے ......

آیئے سنتے ہیں میڈم نور جہاں کی آواز میں آپ کی پسند اور فرمائش پر یہ خوبصورت گیت۔

آئے موسم رنگیلے سہانے

جیا نہ ہی مانے تو چھٹی لے کر آجا......"

"افوہ حد ہو گئی ابا جی کیا پورے گھر میں قیامت صغریٰ برپا کر رکھی ہے۔ آپ کے اس ریڈیو نے۔ آخر ہم بھی انسان کوئی کھوتے گھوڑے نہیں کہ جنہیں آپ کچھ بھی نہ سمجھیں گھر ہمارا کون سا کنالوں یا رقبوں پر پھیلا ہے کہ اس نامراد کی کھڑ کھڑ ہمارے اعصاب کو متاثر نہیں کرے گی یا آپ ہی کچھ اپنی عمر کا خیال کر لیا کریں کسی کونے کھدرے میں اس بڑھی محبوبہ کے ساتھ بیٹھ کر عشق کی پینگیں بڑھاتے رہیں ہمارے کانوں کے کیڑے تو نہ نکالیں اس عمر میں آئے موسم رنگیلے سہانے......

توبہ ہے ابا جی گلی سے گزرنے والا کوئی بھی شریف بندہ سنے گا تو یہی سمجھے گا اندر کوئی بے قابو ہوتی اتھری جوانی بیٹھی ہے، اور اپنے بالم سے چھٹی لے کر آنے کی فریاد کر رہی ہے اور باہر لکھی نیم پلیٹ کیسے ہماری ہنسی اڑائے گی آپ تو خیر سے عمر گزار چکے اب تھو تھو تو زمانہ ہم پر ہی کرے گا کوئی مانے گا تھوڑی کہ یہ موسم رنگیلے سہانے آپ کا دل مچل مچل کر سن

رہا ہے حد ہوگئی چٹے چاٹے (سفید بالوں) کا ہی بندہ کچھ خیال کرلیتا ہے۔"

نجو تابڑ توڑ بولے جا رہی تھی۔

"مجھے گانا تو کیا خاک سمجھ آنا تھا اس کی دھاڑ، چیخ چنگھاڑ میں تین بار کپکپاتے ہاتھوں سے ریڈیو کا بٹن گھما کر آف کرنا چاہا اس کمبخت کا آف آن کا فل والیوم اور لو والیوم کا بھی ایک ہی بٹن تھا پہلے زمانے کے موجد بھی کیسے کفایت شعار ہوتے تھے لکڑی کے ڈبے پر جالی لگا کر ایک موٹا سا سیاہ بٹن اس کے ماتھے پر ٹھونک دیا لیں جی ریڈیو تیار۔

اور تینوں بار ان کانپتے ہاتھوں سے بٹن بائیں گھومنے کی بجائے دائیں گھوم گیا نجو کا مزاج اور بھی برہم ہوگیا۔ وہ سمجھی میں یہ جان بوجھ کر کر رہا ہوں اس نے کسی خونخوار بلی کی طرح میرا اکلوتا غمگسار دوست ہمدرد ریڈیو میرے ہاتھ سے جھپٹا اور اس زور سے اس کا وہ سیاہ بٹن گھمایا کہ بے چارے کو آف کیا ہونا تھا وہ لخت ہو کر نجمہ بیگم کی آتش فشاں ہتھیلی کو بوسہ دیتا زمین پر دو چھلانگیں لگا کر نہ جانے کدھر اپنا منہ چھپا کر سسکنے لگا۔

وہ تو منہ چھپا گیا میرے پاس تو یہ رعایت بھی نہ تھی۔

"آج کل لوگ کمپیوٹر ایف ایم ہنڈریڈ اور نہ جانے کیا کیا میوزک اور دل بہلانے کے آلات آنکھوں کانوں سے لگائے پھرتے ہیں اور نہیں تو موبائل اس منحوس ڈبے سے ہزار درجے بہتر اور اسٹینڈرڈ کے گانے سنوا سکتا ہے، پر نہیں جی ان کا جی تو بہلے گا اس ٹین ڈبے سے۔ نہ بندہ پوچھے اب آپ کی عمر نہیں یہ گانے ڈھول ڈھمکے سننے کی۔ سننا ہی ہے تو بندہ قوالی سنے، نعت سنے وہ بھی اپنے کانوں تک نہ کہ پورے زمانے کو اپنے اس فارغ پن کی سزا میں شامل کیا جائے۔ خود تو ویلے ہیں سمجھتے ہیں ساری دنیا ہاتھ پر ہاتھ دھرے ان کی طرح فارغ بیٹھی ہے کھڑ کھڑ نے ایسا سر میں درد کیا ہے حلیم پکانے کا سوچ رہی تھی وقاص کے ابو بطور خاص فرمائش کر کے گئے تھے اب خاک پکے گی، سر درد سے پھٹا جا رہا ہے۔ گھنٹہ بھر سے سن سن کر اپنی برداشت کا امتحان لیتی رہی چلو خود ہی کسی کا خیال کر کے بند کردیں کیا میں جا کر منہ ماری کروں پر نہ جی انہوں نے تو ذلیل کرنے اور ذلیل ہونے کی قسم کھا رکھی ہے پھر سارے زمانے میں ٹسوے بہا کر مظلوم بنتے پھریں گے کہ بہو بد زبان اور بدلحاظ ہے۔ ساری سو (خاک) میرے سر پر پڑے گی آپ تو معصوم بن کر ٹکر ٹکر دیکھتے جائیں گے۔

جائیں ابا جی خدا کے لیے کہیں باہر جا کر دو گھڑی بیٹھ جائیں مجھے گھر کے چار کام

نبیڑ لینے دیں سویرے سویرے یوں کسی کا جی جلانا نہ اپنے لیے اچھا ہوتا ہے نہ دوسروں کے لیے...... سارے موڈ کا ستیاناس کردیا۔"

وہ بولتی بکتی جھکتی جدھر سے آئی تھی ادھر ہی چلی گئی میں نے ناک کی پھننگ سے پھسلتی موٹے عدسوں والی پلاسٹک کی موٹی کمانیوں کی عینک کھینچ کر ناک پر جمائی سینے کے پنجر میں رکا اٹکا سانس کھینچ کر باہر نکالا دو تین گہرے گہرے سانس لے کر اپنے بکھرے اوسان مجتمع کیے اور پاس پڑے ریڈیو کو دیکھا۔

اپنے اس اکلوتے بٹن کے بغیر کیسا اجڑا اجڑا ویران سا لگ رہا تھا میرا اکلوتا تنہائیوں کا دوست ...... بہت دنوں سے بہو بیگم کو کھٹک رہا تھا آج دل کی کھولن نظر آ ہی گئی میں سرد آہ لے کر رہ گیا۔ گھٹنوں پر دباؤ ڈال کر بامشکل اٹھا دوسرے ہاتھ سے دیوار کے ساتھ کھڑی چھڑی ہاتھ میں لی ایک نظر مڑ کر گھر کی طرف دیکھا وہ گھر جو کبھی میں نے بڑی امنگوں آرزوؤں اور خواہشوں سے تعمیر کیا تھا اپنے لیے اپنے بچوں کے لیے...... آج اس گھر میں میرا وجود ہی برداشت نہیں ہوتا ہے۔

آپ کسی چیز کے پیچھے پوری زندگی لگا دیتے ہیں اور جب وہ چیز مل جاتی ہے تو آپ کے لیے جگہ ہی نہیں بچتی۔ میرے لیے اب یہاں کوئی جگہ نہیں تھی پتا نہیں میری اس بے مصرف زندگی کا اب کیا مقصد تھا پیدائش سے لے کر بڑھاپے تک سارے مراحل کی، ہر خوشی غم ذمہ داری سب سے تو سبکدوش ہو چکا۔ اب میرے مولا کس لیے دھرتی کا بوجھ بنا رکھا ہے۔

اپنے آپ سے باتیں کرتے اپنے ہی وجود سے بے زار میں آہستہ آہستہ چلتا باہر نکل آیا۔

گلی کی زندگی ویسی تھی جیسی روز ہوتی تھی بلکہ مدت سے ایسے ہی تھی البتہ مجھے فرصت چند برس پہلے ملی تھی اس زندگی کا مشاہدہ کرنے کی اب تو مجھے گلی سے گزرنے والے ہر پھیری والے، سبزی والے، پھل والے، اخبار ردی ٹین ڈبے بیچنے والے تک کی پہچان اور اس سے صاحب سلامت ہو چکی تھی۔ اس وقت میرا کتنا دل چاہ رہا تھا کوئی مجھے امرود کاٹ کر ان کے بیج نکال کر ان پر نمک اور کالی مرچ چھڑک کر دے اور میں اوائل فروری کی ٹھنڈی دھوپ میں بیٹھ کر کھاؤں۔

اللہ بخشے مقصودہ کو پتا تھا مجھے ایک ہی پھل پسند ہے وہ بھی بیج نکال کر پہلے تو شوق

کی وجہ سے اس طرح کٹوا کر کھاتا تھا بعد میں منہ سے ایک ایک کر کے رخصت ہوتے دانتوں اور داڑھوں کی وجہ سے بیج بالکل نہیں کھا سکتا تھا یہاں تک بھی سب ٹھیک تھا مگر پچھلے سال سے میرا معدہ بھی دغا دے گیا ادھر امرود کھایا ادھر پیٹ میں گڑوں گڑوں اور موشن شروع نتیجتاً نجمہ بیگم کو میرے لیے پتلی کھچڑی اور دلیے کا اہتمام کرنا پڑتا اس معاملے مقصود کتنا ہی مصروف ہو میری صحت کا پورا خیال رکھواتا ہے بس اس کوفت اور مشقت سے بچنے کے لیے بطور حفاظتی اقدامات نجمہ بیگم نے گھر میں امرود منگوانے ہی چھوڑ دیے آ بھی جاتے تو سب چھپ چھپا کر کھا جاتے۔

''دادا کو نہ پتا چلے فوراً مانگیں گے اور پیٹ خراب کر لیں گے پھر امی سے جوتے پڑیں گے ہم سب کو۔'' سب سے چھوٹا وقاص بھی جوتے پڑنے کی وجہ سے واقف ہو چکا تھا تو بڑے بچوں کی احتیاط بندی کا کیا عالم ہوگا بھلا۔

''او میاں اندھے ہو کیا یہ عمر ہے تمہاری ٹہلنے ٹہلانے کی، گھر بیٹھ کر تسبیح جاپو کیوں خلقت کا رستہ خراب کرتے ہو۔'' نا صرف الفاظ بہت حقارت سے کہے گئے تھے بلکہ اس کے چٹانی کندھے کا دھکا مجھے سنبھلتے سنبھلتے بھی دیوار کے ساتھ لگا گیا تھا۔

بوسکی کی قمیص کے اوپر براؤن واسکٹ اس کے چوڑے شانے پہاڑ جیسی پشت کسی بھی آتے جاتے کو یونہی دیوار سے لگا دینے کے لیے کافی تھی اونچا لمبا...... چلتے پھرتے دیو سے مشابہ لگتا تھا اس گلی محلے میں ہر شخص اس سے نہیں اس کے سائے سے بھی یوں خوف کھاتا تھا جیسے کوئی خون آشام دیو سے ڈرے اور ڈرانے کے لیے اس کا سایہ ہی نہیں بوسکی کی قمیص کے نیچے شلوار کے نیفے میں اڑسا ریوالور کسی بھی ضرم خان کی نظریں جھکانے کے لیے کافی تھا۔

اسے دیکھ کر اکثر اپنی بے بسی پر خیال آتا۔

''اقبال میاں اگر دادا ہی کہلانا تھا تو یوسف دادا کی طرح کہلاتے کہ اس کی دہشت سے چلتی ہوا بھی تھم تھم جائے۔''

''ہونہہ۔'' اس نے تضحیک بھرے انداز میں ہنکارا بھرا اور اپنے کندھوں پر پڑی بھوری گرم چادر ہوا میں لہرائی اور چرمی کھیڑی چر چر کرتا زمین کو دھمکاتا آگے نکل گیا۔

میں جو ہونق سا دیوار سے لگا کھڑا تھا اس ''دہشت گرد'' کی گرد چھٹتے اپنے کمزور سینے میں کانپتے لرزتے دل کو گرین سگنل دیتا۔ ایک گہرا سانس لے کر سیدھا ہوا چھڑی ہاتھ

میں لی اور تاسف بھرے انداز میں سر ہلاتا آگے بڑھ گیا۔

اس کے پیچھے اس کے دونوں حواری بھی جا چکے تھے وہ اس کی دہشت کے سائے میں بہت سی رعایتوں کے خود بخود مستحق ہو گئے تھے۔

یونہی چلتے چلتے کسی پھل فروش کی ریڑھی سے کلو دو کلو پھل تلوا لینا ماجھے گجر کے کڑاہی سے گرم ابلتا دو تین کلو دودھ گڑوی میں ڈلوا کر پی جانا، پیڑے کھا جانا کھویا ڈکار جانا اور ساتھ کی دکان پر ماجھے گجر کے بھائی، ساجے مٹھائی والے کی دکان کی کم بختی تو ہر وقت آتی رہتی تھی خوشی ہوتی یا غم مٹھائی جلیبیاں، شکر پارے، بالوشاہی سب اسی کی دکان سے یونہی اٹھوالی جائیں کئی بار بے چارہ اس محلے سے ''ہجرت'' کا ارادہ کر چکا تھا اور ہر بار یہ ارادہ بس دل میں ہی رہ جاتا اور ''دادا'' کو جونہی اس کے ارادے کی بھنک پڑتی بے چارہ اگلے دن مٹھائی کے تھال سجائے ہوئے اپنے نوکر سے اپنے سوجے ہوئے کندھے ٹانگیں سنکوا رہا ہوتا۔

یہ سب تو اس کے چیلوں چانٹوں کی گزاری تھی اور جب وہ خود کسی کالی آندھی کی طرح کسی دکان کا رخ کر لیتا تو بس اس کے قل چنے پڑھنے کی کسر باقی رہ جاتی اور اس دکان میں کچھ بچتا ہی نہیں تھا۔

''واہ میرے مولا کیا رنگ رنگ کی دنیا تو نے سجائی ہے اوپر بیٹھا انجوائے کر رہا ہے بے بسوں کی ہنسی اڑاتے اور مٹی پلید ہوتے دیکھ کر۔ چل تیری مرضی تو جس حال میں رکھے۔'' میں لاٹھی ٹیکتے حسب معمول اپنی ہی سوچوں سے الجھتا اپنے پسندیدہ اکلوتے ٹھکانے پر پہنچ گیا۔ جو ہمیشہ کھلے دل اور کھلی بانہوں سے میرا استقبال کرتا تھا۔

☆

''یار نیچے ہی بیٹھ جاؤ۔'' میں جو بینچ کے ساتھ چھڑی ٹکا کر اس پر بیٹھنے لگا تھا توفیق نے میرا ہاتھ پکڑ کر نیچے گھاس پر بٹھانے کی کوشش کی۔

''یار بیٹھ تو جاؤں گا اٹھائے گا کون؟'' میں نے اپنے درد کے مارے گھٹنوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قدرے بے بسی سے کہا۔

''اٹھا لیں گے اٹھانے والے اب آخری فرض تو مارے بندھے سنبھالیں گے دنیا داری کی خاطر۔'' اسلم نے دکھی سے لہجے میں سر ہلا کر کہا۔

''اچھا تم لوگ اصرار کرتے ہو تو بیٹھ جاتا ہوں دیکھو پچھلی بار کی طرح نہ کرنا میں

بیٹھا رہ جاؤں اور تم لوگ چھپت ہو جاؤ باری باری۔'' میں نے انہیں سنانے والے انداز میں کہا اور بینچ کا سہارا لے اپنے درد کرتے گھٹنوں کو پکڑتا بیٹھ ہی گیا۔

''یار تونے تو نو ماہ کی حاملہ عورت کو بھی مات کر دیا اتنے اسٹائل سے تو وہ بھی نہیں بیٹھتی۔'' حبیب کمینہ شروع سے بدمعاش تھا۔

''ہاں وہ کیوں مارے گی اسٹائل، اس کو تھامنے والے جو کئی ہاتھ ہوتے ہیں ہم جیسے ناکارہ پرزوں کی اب کسی مشین کو حاجت جو نہیں۔'' میں پہلے ہی گھر میں نجمہ بیگم کے ہاتھوں ہونے والی درگت سے جلا بھنا بیٹھا تھا۔

''کارآمد ہیں یا ناکارہ اب تو بس بیٹھے ہیں عزرائیل کی راہ میں نظریں بچھائے ادھر ریٹائرڈ ہوئے ادھر ہم سے پہلے ہمارے پیارے گھر والوں نے عزرائیل کی آمد کے انتظار میں چوکھٹ پر اپنے حواس چوکیداری کے لیے بٹھا دیے چلتی کا نام گاڑی رکے اور گئے کہانی ختم۔'' اسلم کی حالت بھی کچھ کچھ مجھ سے ملتی جلتی تھی اس کے گھر میں تو ایک نجمہ بیگم تھیں، اُس کے گھر میں تو دو دو بہو رانیاں تھیں جنہیں وہ خود بڑے ارمانوں سے بیٹوں کے لیے اپنی بہن اور بھائی کے گھر سے بیاہ کر لایا تھا کہ مجھ سے خون کا رشتہ ہے بڑھاپا اچھا گزرے گا سو اس کا تو ''دوگنا'' اچھا گزر رہا تھا۔

حبیب اپنی بیوہ بیٹی کے گھر رہتا تھا اگرچہ وہاں بھی اسے کوئی مقدس، متبرک چیز نہیں سمجھا جاتا تھا مگر پھر بھی بیٹوں کی نسبت بیٹیاں کچھ تو آثار قدیمہ بنے ماں باپ کی قدر کرتی ہیں۔

توفیق کے ابھی بیٹا بیٹی بیاہنے والے تھے۔ پھر اس کی بیوی بھی زندہ تھی اگرچہ راج پاٹ عملی طور پر بیاہے بیٹوں اور بہوؤں کے ہاتھ میں آچکا تھا مگر بیوی اور غیر شادی شدہ بچوں کی وجہ سے وہ پھر بھی ہم سے اچھے حالوں میں تھا ورنہ ''رنڈوے'' اور اس عمر میں اللہ کی پناہ...... سر منڈوا کر اولے پڑنے والی مثل سچ لگنے لگی تھی۔

دھوپ نکھری نکھری کچھ گرم کچھ ٹھنڈی سارے باغ کے اطراف میں پھیلی درختوں کی چھاؤں کو سکیڑتی شاخوں کی چوٹیوں پر اپنا دامن پھیلاتی ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔

اگرچہ اب ایسی چمکیلی سنہری دھوپ کو یہ موتیا کی ماری کمزور آنکھیں پوری طرح کھول کر دیکھ نہیں پاتی تھیں مگر پھر بھی دھوپ کے کمبل میں آتے ہی ہم بوڑھوں کو کیسا سکون ملتا تھا کوئی ہمارے سردی سے ٹھٹھرتے کمزور بدنوں سے پوچھے۔

''یہی وہ جگہ ہے نا اقبال یار جہاں تجھے پہلی پرموشن ملی تھی اور تو ساجھے سے خالص دیسی گھی کے گلاب جامن ہمارے لیے نکلوا کر لایا تھا کہ اب پلاٹ پر گھر بنانے کا تیرا خواب پورا ہونے کا امکان روشن ہو گیا تھا۔'' میں جو سر اٹھائے گھنے درختوں میں کالی کالی اڑتی چڑیا کو دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا دن کے وقت یہ معصوم چڑیا بھی کیسے دانہ دنکا چگنے گھر گھونسلے چھوڑ کر اڑان بھر جاتی ہیں اور ایک ہم ہیں بے کار... ناکارہ...... کہ توفیق نے اچانک کہا۔

''ہاں یار یہی وہ جگہ ہے جہاں بیٹھ کر ہم نے اپنی زندگی کے ہر چھوٹے بڑے منصوبے کا اعلان اور آغاز کرنے کے لیے مشورے کیے...... سچی بات ہے ترقی اور بچت، کہیں سے پیسے ملنے کی خوشی جیسی مادی چیزوں کو ہم اکثر اپنے دل میں چھپا جایا کرتے تھے کہ کہیں دوسرے سن کر جیلس نہ ہو جائیں پھر جو بھی مالی معاشی گھریلو یا بچوں کی کوئی پریشانی آتی ہم یہیں اکٹھے ہو کر اپنے دکھ سکھ کہا کرتے تھے پہلے تو معروف بہت ہوتے تھے نا اکثر ہفتے پندرہ دن بعد اکٹھے ہوتے تھے جب نسیم اور پراچہ بھی ہمارے ساتھ ہوتے تھے پھر ان دونوں نے ہم چاروں سے پہلے اڑان بھر لی وقت بھی کیا چیز ہے۔'' میں کہتے کہتے افسردہ سا ہو گیا۔

''وقت ہی تو میری جان سب سے طاقت ور ہے ہر طاقت اس کے آگے ہار جاتی ہے، صرف اس کی کڑک اس کی دہشت باقی رہ جاتی ہے۔ ہمیں دیکھ لو کبھی کڑیل جوان تھے اس درخت کے تنے کو دو ضربوں میں جھکنے پر مجبور کر سکتے تھے اور آج اس درخت کی کمزور شاخ کو بھی نہیں توڑ سکتے کل کے بچے جوان ہو کر ہماری ناطاقتی کو حقارت سے دیکھتے ہیں اس سے بڑھ کر وقت کی حقیقت کیا ہو گی بھلا۔'' اسلم نے بھی سر اٹھا کر دور آسمان کی وسعتوں میں اڑتے پرندوں کو دیکھ کر افسردگی سے کہا۔

''پر یار میں تو سمجھتا ہوں مزے میں ہیں ہم، اب کوئی پریشانی کوئی درد سر نہیں ورنہ تو ہر وقت ہر گھڑی کوئی نہ کوئی ٹینشن سر پر سوار رہتی تھی فلاں بچے کی فیس کا انتظام کرنا ہے بیٹی کی شادی کی تیاری کیسے ہو گی، باتھ روم کا گٹر کھلوانا ہے، بیوی کو ڈاکٹر سے چیک کروانے لے جانا ہے فلاں بہن بھائی کے بچے بچی کی شادی میں اپنی اوقات اور چادر سے بڑھ کر تحفہ دینا ہے، عقیقہ، شادی، سالگرہ، گھر کا کرایہ، پلاٹ کی خرید پھر اس پر تعمیر...... اف ایک زندگی اور وسائل ہزار......

اور اب دیکھو مزے سے فرصت ہی فرصت، پکا پکایا کھانے کو مل جاتا ہے، سارا

دن چاہے اخبار چاٹو یا خبریں سنو کوئی دفتر، دکان کی جلدی نہ بل کی رقم اکٹھا کرنے کی معیبت نہ آخری تاریخ گزر جانے کی جھنجلاہٹ نہ رشتہ داروں کی باتیں سننے کا ڈر......عیش ہی عیش......"

یہ عیش نامہ صرف حبیب ہی پیش کرسکتا تھا اس کی کئی باتیں سچی بھی تھیں اور کچھ دل جلی بھی...... بے شک اب ہم ہر منصوبے ہر ارادے کی قید سے آزاد ہو چکے تھے مگر بے وقعتی اور بے کاری کی شرمساری کا حصار ان فیلنگز سے زیادہ کاٹ دار تھا اس کی کاٹ کو وہی جان سکتا ہے جو اس سے گزر رہا ہو جس پکی پکائی کا وہ ذکر کر رہا تھا وہ کم از کم میرے گھر میں اتنی آسانی سے نہیں ملتی تھی۔ ایک وقت کا کھانا اور تین وقت کی بڑبڑاہٹ اپنے بے کار ہونے کے احساس کو اور بھی بڑھا دیتی اسی کھسیاہٹ اور بڑبڑاہٹ سے بچنے کے لیے مسجد، باغ، ریڈیو اور اخبار میں منہ چھپانے کی کوشش کرتا مگر......

میری سرد آہ پر تینوں نے مجھے دیکھا اور سر جھکا لیے۔

"چلو یار سامنے تکی والے سے تکی لیتے ہیں صبح چائے کے ساتھ ایک سلائس لیا تھا گھر میں تو ابھی کھانا بھی نہیں پکا ہوگا۔" حبیب نے گیٹ کے پاس کھڑے تکی والے پٹھان کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم لوگ کھاؤ یار میرا تو پیٹ خراب ہے اور دانت کہاں ہیں منہ میں جو چنے چبائیں گے تم کھا سکتے ہو اس نقلی بتیسی کے ساتھ۔" اسلم نے بھی فوراً انکار کر دیا۔

ہم چاروں پھر مراقبے میں چلے گئے۔

ایک تو اس بڑھاپے میں مراقبے کی کثرت ہو جاتی ہے۔

ایک مکھی نے ہمارے مراقبے کو توڑنے کے لیے بھیں بھیں کرکے ہم چاروں کو گویا "مصروف" کر دیا۔

"تمہارے بیٹے کا فون آیا دمام سے۔" توفیق نے مجھ سے پوچھا۔

"آتا رہتا ہے۔" میں نے لاپرواہی سے گھاس نوچ کر اس کے سر پر منڈلاتی اس شیطان مکھی کو دیکھا۔

"تو اس نے بتایا نہیں اس سال تمہیں حج کے لیے بلائے گا یا نہیں۔" اس کی کرید پر باقی دونوں نے بھی میری دیکھتا رہا۔

"جب تک اولاد کی فلاح کے منصوبے ماں باپ کے ذمہ رہتے ہیں وہ ان کی

تکمیل کے لیے اپنی جان لڑا دیتے ہیں وہ اپنی برداشت کی آخری حد تک چلے جاتے ہیں اور جب...... ماں باپ کی بہتری فلاح کا کوئی بھی کام اولاد کے ذمے لگ ہی جائے تو پھر کچھ بھی یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ وہ مکمل ہوگا یا نہیں اب نوید کا یہ ایک بڈھا باپ ہی تو نہیں جس کے حج کی ذمہ داری وہاں جانے کے باعث خود بخود ہی اس بے چارے کے کندھے پر آ پڑی ہے اس کی بیوی دو بچے بلکہ اس سال تین ہو جائیں گے۔ کہہ تو رہا تھا اس سال کوشش کرے گا ورنہ اگلے سال تو ضرور...... اور اگلا سال...... ہاہ...... یہاں ایک ایک پل ایک سال کے برابر لگتا ہے۔ اگلے سال یعنی ہمارے لیے اگلی صدی ہے نا۔"

مجھے خود ترسی سے ہمیشہ نفرت رہی تھی میں نے ایک بامشقت مگر بڑی پر جوش زندگی گزاری تھی نوکری کے علاوہ بھی اِدھر اُدھر ہاتھ پاؤں مارتا رہتا تھا مایوسی اور خود ترسی دونوں ہی کیفیتوں سے مجھے شدید نفرت تھی مگر آج کل...... ہاں جب سے اپنے وجود کے غیر فعال غیر ضروری ہونے کا احساس ہوا تھا...... پہلے تو پوتے پوتیوں کو انگلی سے پکڑ کر گود میں اٹھا کر گھنٹوں ٹہلانے کے لیے لے جاتا تو نجمہ کو بچوں کی ذمہ داری سے کچھ دیر کو سہولت سی مل جاتی تو وہ میری خاصی مشکور ہوا کرتی تھی خود مجھے بھی اپنا وجود کچھ فعال کچھ ضروری اور کچھ قیمتی سا لگتا تھا مگر اب تو سارے پوتے پوتیاں خود بھاگتے دوڑتے بلکہ اکثر مجھے انگلی پکڑ کر سہارا دے کر گلی سے گھر تک لے آتے تھے۔

"چلو یار نصیبوں میں ہوا تو ہو جائے گا اور اللہ ہماری نیتوں کے حال سے واقف ہی ہے دل میں بس طلب اور تڑپ ہونی چاہیے۔" حبیب نے پتا نہیں کس کو تسلی دی تھی اس کی بات کے بعد ایک لمبا خاموشی کا وقفہ آ گیا اور ہم بڈھوں کی محفل میں یہ کوئی نئی بات نہیں تھی ایسے لمبے لمبے خاموشی کے وقفے اتنے غیر محسوس ہوتے تھے کہ کسی پر بھی گراں نہیں گزرتے تھے دماغ میں کھلبلی مچاتی سوچیں بنتے بگڑتے بچپن لڑکپن جوانی کے منظر تصویریں آوازیں سب کچھ یوں گڈمڈ ہوتے الجھے ہوئے ریشم کی طرح ایسے آپس میں گتھم گتھا ہوتے کہ ہمیں جونہی خاموشی کا یہ لمبا وقفہ میسر آتا ہم ان دھاگوں کو سلجھانے کی ناکام کوشش میں جت جاتے۔

دوپہر سر پر آ گئی تھی نرم گرم پیلی پیلی سی دھوپ اب جسموں کو چبھنے لگی تھی درختوں کی شاخوں پر چڑیوں کی چوں چوں میں بھی اضافہ ہو گیا تھا گویا وہ لنچ ٹائم کے لیے اپنے گھونسلوں میں آ چکی تھیں۔

”میرا خیال ہے اب چلنا چاہیے، کچھ دیر جا کر میں تو آرام کروں گا۔“ سب سے پہلے اسلم نے اس خاموشی کے لمبے وقفے کو توڑا تھا ہم سب یوں چونکے جیسے خواب سے جاگے ہوں چپ چاپ معمول کی طرح اٹھ کھڑے ہوئے حبیب نے مجھے سہارا دے کر اٹھایا اور ہم آگے پیچھے باغ کے گیٹ سے باہر نکل آئے اور اپنے اپنے رستوں پر مڑ گئے ہم میں سے کسی نے بھی دوبارہ ملنے یا آنے کے لیے وقت مقرر کیا تھا نہ کوئی ارادہ باندھتے تھے پتا نہیں اس عمر میں آ کر ہماری ہمتیں ہی شکستہ نہیں ہوئی تھیں ارادے بھی جیسے ڈگمگائے تھے یا ہمیں ان کے توانا رہنے یا ڈھلنے میں اب کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔

☆

شام ابھی پوری طرح سے آنگن میں اتری نہیں تھی جب گھر میں چھائی جامد خاموشی سے گھبرا کر میں نے ایک بار پھر باہر کا رُخ کرنا چاہا ریڈیو ناکارہ ہو چکا تھا۔ ناکارہ تو خیر نہیں ہوا تھا مگر اس کا بٹن ٹوٹ جانے کی وجہ سے محض اس کے اندر گھسا وہ کیل سا گھمانے سے وہ چل تو پڑتا تھا مگر اس کا والیوم بڑا ہیجان خیز ہو جاتا تھا قابو میں نہیں آتا تھا جس کے ساتھ ہی نجو کا مزاج بے قابو ہو جاتا تھا قابو میں نہیں آتا تھا۔

ایک بار شانے چلا کر دیا دوسری بار وقاص نے چلایا ہی تھا کہ نجو کی دھاڑ پر اس نے ریڈیو بند کیے بغیر اس کا والیو بالکل بند کر دیا شام تک خاموشی سے چلتے رہنے کے بعد اس کے سیل ختم ہو گئے اور میری پنشن آنے میں ابھی دن تھے کہ اپنی اس اکلوتی تفریح کی مرمت کروا کے پھر سے دل بستگی کا کوئی اہتمام کر سکتا۔

”دادا آپ کو ماما بلا رہی ہیں۔“ میں ابھی گھر سے نکلا ہی تھا کہ سات سالہ فواد نے میرا ہاتھ ہلا کر مجھے میری سوچوں سے نکالا تھا۔ میں مسکرا کر اس کے ساتھ چل دیا۔ داخلی دروازے پر ذرا سا رکا۔

”چاچا آ جائیں اندر۔“ عفت نے مجھے دیکھ کر برآمدے ہی سے آواز لگائی وہ زمین پر دری بچھا کر سلائی مشین کے رکھے کپڑوں کے ڈھیر میں چھپی بیٹھی تھی۔

”سلام چاچا جی کیسے ہیں آپ۔“ اس کے بیٹے نے موڑھا اس کے پاس ہی لا کر رکھ دیا تو میں وہیں بیٹھ گیا۔

”الحمدللہ بیٹی تم سناؤ۔“

”بس چاچا زندگی کی بیل گاڑی میں جتے ہیں دیکھیں کہاں تک کھپ سکتے ہیں۔“

وہ دکھی سانس کے ساتھ ہنسی تو میرا دل افسردہ ہو گیا ابھی کل کی بات ہے جب یہ رحیم کی انگلی پکڑ کر شفیع کریانے والے کی دکان سے ٹافیاں، چیونگم، بسکٹ اور املی خریدنے جاتی تھی اور کل ہی کی تو بات ہے جب یہ سرخ جوڑا پہنے کیسا پریوں سا روپ لیے اس آنگن سے رخصت ہو کر وحید کی جیون ساتھی بنی تھی اور ابھی کل ہی کی تو بات ہے وحید نے بے وفائی کی اور ایک ظالم موڑ نے اس کی زندگی کا خاتمہ کر کے اسے عہد شکن بنا ڈالا اور عفت کی ساری چوڑیاں اسی آنگن میں بیٹھی بین کرتی عورتوں نے توڑ ڈالی تھیں دو پھول سے بچے اپنے سینے سے چمٹائے کیسی زندہ لاش سی پھرتی رہتی تھی اس گھر کی چار دیواری میں اور بوڑھا باپ اس جوان صدمے کی تاب نہ لا کر محض چند ماہ میں ہی رزق خاک ہو گیا تھا کہ پیچھے اس کی قیامت سی جوان خوب صورت بیٹی کیسے اس ظالم خونخوار وحشی دنیا کا سامنا کرے گی سال بھر تو بے چاری کے حواس ہی قابو میں نہیں آئے جو باپ کا یہ گھر نہ ہوتا تو شاید...... کہیں سڑکوں پر رل کر کہیں کسی دھند کی دلدل میں اتر چکی ہوتی۔

پھر کل کی تو بات ہے جب اس آنگن میں اس نے میرے سامنے روتے ہوئے آخری بار اپنے آنسو بہائے اور اپنے بچوں کی بہتر زندگی اور اپنی آبرو مندانہ بیوگی کو قائم رکھنے کے لیے خود میدان میں اترنے کا عہد کیا اور پھر دو کمرے ڈال کر کرائے پر دیے اور خود مشین رکھ کر لوگوں کے کپڑے سینے لگی یوں زندگی کی گاڑی جیسے تیسے کھینچنے لگی اور زندگی کی یہ مشقت اس کی رگوں سے جواں لہو کھینچ کھینچ کر زردیاں انڈیلنے لگی۔

”چاچا بل جمع کروانے تھے بجلی اور گیس کے دونوں کی کل آخری تاریخ ہے۔“

اس کے بیٹے نے کسی روبوٹ کی طرح بل لا کر مجھے تھما دیے۔

اس نے مشین کے نچلے خانے سے بل کی رقم نکال کر مجھے تھمائی۔

”کیا اس بار اوپر والوں نے بل نہیں جمع کروایا۔“

”نہیں۔“ اس نے آہ سی بھری اور اٹھ کر برآمدے کے دائیں جانب بنے کچن میں بیٹھ کر چولہا جلانے لگی۔

”کیوں؟“ وہ اب چائے کا پانی رکھ رہی تھی، گھر میں دوبارہ جی میں آیا بچوں سے کہہ کر چائے بنوالوں پھر نجمہ بیگم کے کڑکے اور بڑبڑاہٹ سے خوف آیا جو اس وقت صرف آرام کرنا پسند کرتی تھی۔

”وہ اس پہلی کو گھر خالی کر رہے ہیں۔“ وہ آہستگی سے بولی۔

"کیا؟" میں دھک سے رہ گیا تین چار سالوں میں یہ نویں کرائے دار تھے۔
جو چند ہی ماہ کے بعد گھر خالی کر کے جا رہے تھے۔

"مگر کیوں؟"

"میں نے کہا تھا۔" اس نے جھکی پلکوں اور جھکے سر اور بیٹھی موٹی آواز میں کہا تھا کہ میں مزید سوال کر ہی نہ سکا حالانکہ یہ کرائے دار تو توفیق کے جان پہچان والے تھے ادھیڑ عمر میاں بیوی اور ایک نواسا جو ادھر کالج میں پڑھتا تھا۔ دونوں میں سے کون۔ میری زبان نے زیب نہ دیا کہ یہ سوال کروں۔

وہ سر جھکائے ماچس کی تیلی کے ساتھ چولہے کی میل کھرچ رہی تھی اور شاید رو بھی رہی تھی۔

"جاتا ہوں میں چائے پی کر بھٹی ڈیلر کے پاس، ایک ماہ کا کرایہ نہیں آئے گا تو ان کی فیسیں کیسے بھرو گی، سو خرچے ہوتے ہیں تمہارے سلائی سے کیا بنے گا۔"

چائے پیتے ہوئے میں نے خود بخود اگلا مرحلہ اپنے ذمہ لے لیا یہ ہی ہوتا تھا اور یہی ہو رہا تھا میں نے کوئی سوال نہیں پوچھا اس نے اپنی سیاہ چادر کے پلو سے دو تین بار چپکے سے منہ رگڑ کر آنسو پونچھ لیے تھے۔

"بہت شکریہ چاچا آپ نہ ہوتے تو...... زندگی اتنی مشکل ہوتی ہے ایک اکیلی عورت کے لیے، میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا یوں جیسے کانٹوں پر چلنا ہے اور دامن بھی بچانا ہے بہت مشکل ہے چاچا بہت مشکل۔" وہ ضبط کرتے کرتے پھر آنسو چھلکا بیٹھی۔

"حوصلہ کر پتر جس نے یہ آزمائش تجھ پر ڈالی ہے وہی اسے پار لگائے گا تو کیوں دل ہولا کرتی ہے، دنیا برے لوگوں سے اٹی پڑی ہے تو اچھے لوگوں سے بھی ابھی خالی نہیں ہوئی امید کا دامن کبھی نہیں چھوڑنا چاہیے اور تو تو بڑی حوصلے والی بہادر بیٹی ہے۔" میرا ہاتھ لحہ بھر کو اس کے سر پر ٹھہرا تھا اور کانپتے لہجے میں اسے تسلی دیتے مجھے خود سے شرمندگی سی محسوس ہوئی میں جو خود کیا کر رہا تھا دن رات گلے شکوے ناامیدی اپنے بے کار ہونے کے رونے اور اس...... راز سے ناواقف کہ وہ کیوں مجھے یوں جیون کی سانسیں دیے جا رہا ہے۔

"آپ کے دم سے میرا بڑا حوصلہ ہے، چاچا جی دعا کریں میں عزت و آبرو کے ساتھ اپنے بچوں کو ایک کامیاب زندگی دے کر اپنے رب اور مرنے والے کے سامنے سرخرو ہو سکوں۔" وہ اب دوسری بار اپنے آنسو صاف کر رہی تھی۔

"ویسے مجھ سے زیادہ تو تو مقبول دعا والی ہے تہجد گزار ہے، اتنی سی عمر میں اللہ نے پہاڑ سی آزمائش ڈال دی تو اپنی لگن بھی لگا دی اور جس کو اس کی لگن لگ گئی اس کے لیے ہر دعا کی قبولیت کی بشارت ہے، تو تو بلکہ مجھ جیسے بھگوڑے بڈھے کے لیے دعا کیا کر قبر میں پاؤں لٹکے ہیں کوئی اللہ کی عبادت کر لوں جا کر اسے کیا منہ دکھاؤں گا۔"

"گڑیا کہاں ہے۔" میں نے یونہی اس کا دھیان بٹانا چاہا۔

"سامنے والی خالہ ثریا کے گھر سپارہ پڑھنے گئی ہے، میں پڑھا لیتی تھی تنگ بہت کرتی تھی ایک وقت مقررہ پر نہیں بیٹھتی تھی پھر میرا کوئی نہ کوئی کام نکل آتا تو اس کا سبق رہ جاتا اسی لیے اسکول سے آتی ہے تو تھوڑا آرام کر کے ادھر چلی جاتی ہے۔" وہ بتانے لگی تو میں اٹھ کھڑا ہوا۔

"اچھا چلتا ہوں یہ بل میں صبح جا کر جمع کرا دوں گا بلکہ یوں کرو یہ تم ابھی اپنے پاس رکھو صبح بچے اسکول جانے لگیں تو اس وقت اس کے ہاتھ بھجوا دینا بڈھا آدمی ہوں رات کو یہاں وہاں رکھ کر بھول گیا تو مشکل ہو گی کل یوں بھی آخری تاریخ ہے۔" یہ خیال آتے ہی میں نے زبردستی پیسے اور بل اسے واپس تھما دیے اصل ڈر تو مجھے نجو کی بے تکلفی سے تھا سسر کی خدمت کو تو وہ بے کار سمجھتی تھی جبکہ اس کے پیسوں کو اپنا اور بچوں کا حق سمجھ کر پوچھے بغیر اٹھا لیا کرتی تھی۔

"چلو اللہ نے ابھی کسی قابل تو رکھا ہے کہ کسی کے کام آ سکوں اللہ اس بچی کی مشکل کو آسان کرے سچ کہتی ہے وہ غریب۔" بھٹی ڈیلر کی دکان کی سیڑھیاں میں چڑھ چکا تھا اور دروازہ کھول کر اندر داخل ہو چکا تھا پہلے دیکھ لیتا تو واپس مڑ جاتا سامنے ہی ڈبل صوفے پر پھسکڑا مارے میرا ہم نام بیٹھا بڑی تمسخرانہ نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا اگرچہ آج تک اس کی میری مڈبھیڑ نہیں ہوئی تھی، ہوتی بھی تو مجھے وہ زبان سے کچھ کہتا نہیں تھا مگر اس کی نظروں میں ایسی تضحیک ہوتی جیسے وہ میری ناطاقتی کا مذاق اڑا رہا ہو ہنستا ہو میرے کمزور بدن اور بڑھاپے کے رعشے سے کانپتے اعضا پر......

"آؤ آؤ چاچا جی آج بڑے دنوں بعد چکر لگایا۔" بھٹی بڑے تپاک سے ملا مگر میرا موڈ اب بات کرنے کا نہیں تھا اس کی مذاق اڑاتی نظریں مستقل مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔

"بس یونہی ادھر سے گزرا تو سوچا بڑے دنوں سے سلام دعا نہیں ہوئی خود ہی چل کر مل لوں۔" میں اس کے پاس صوفے پر بچی ہوئی جگہ بیٹھنا نہیں چاہتا تھا سو کھڑا ہی رہا۔

"کیوں شرمندہ کرتے ہیں چاچا جی بیٹھو تو سہی ہم خادم ہیں آپ کے، آپ حکم کرتے ہم دوڑے چلے آتے۔" بھٹی اپنے مخصوص میٹھے لہجے میں بولا اور بیٹھنے کے لیے ہاتھ سے اشارہ کرنے لگا۔

"نہیں چلتا ہوں پھر آؤں گا آج تو یونہی تم سے ملنے چلا آیا تھا۔ رب راکھا۔" میں رکا نہیں اور مڑ کر دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔

"ارے یار کٹی پتنگ کا سا حال ہوتا ہے ان بڈھوں کا جانے دے، کبھی ادھر لڑھکتی ہیں تو کبھی ادھر، جدھر ہوا کا جھونکا لے چلے، نہ بے چاروں کا دماغ کام کرتا ہے نہ اعضا، نہ ٹھیک سے سمجھ آتی ہے، کیا کر رہے کہاں جا رہے ہیں، کہاں جانا ہے، کیا بات کرنی ہے، یہ بڑھاپا تو سارا سیٹ اپ سیٹ کر دیتا ہے ان بے چاروں کا، اول جلول حرکتوں پر صرف ہنس کر دل خوش کیا جا سکتا ہے۔" اس خبیث کی بکواس سن کر پل بھر کو تو میرا ٹھنڈا لہو بھی کھول اٹھا مگر پھر اپنے اس بے جا طیش کو قابو میں کرتے ہوئے لاٹھی احتیاط سے ٹیکتا سیڑھیاں اتر کر گلی میں آ گیا۔

☆

"لیں ابا جی آپ کے لیے لے کر آیا ہوں۔" آج کوئی اچھا ہی دن تھا جو فرید کو بھی باپ کے پاس نا صرف بیٹھنے کا خیال آ گیا تھا بلکہ وہ پلیٹ میں میرے لیے سیب اور امرود کی باریک باریک قاشیں کٹوا کر نمک اور کالی مرچ چھڑک کر لایا تھا۔

"ہائیں کیا کرتے ہیں ابا جی کا پیٹ خراب ہو جائے گا یہ تو میں نے آپ کے لیے کاٹ کر بھیجے تھے ان کو نہ کھلائیں۔" نجو کسی چیل کی طرح چکن سے نکل کر فرید کے ہاتھ میں پکڑی پلیٹ کی طرف جھپٹی تھی۔

"رہن دے، آئی وڈی ڈاکرانی، پیٹ خراب ہے اچھے بھلے تو ہیں اب کیا بندہ پیٹ خراب ہونے کے ڈر سے کچھ کھائے پیے ہی نہیں یہ تو رت رت کا میوہ ہے اور ابا جی کو یہ پسند بھی بہت ہے، چلیں کھائیں ابا جی یہ تو ایسے ہی اپنا سیانا پن دکھاتی رہتی ہے۔" یہ فرید کو آج کیا ہوا یہ صرف میں نے ہی نہیں نجو نے بھی سوچا اس کے چہرے کے بگڑے زاویے فرید کو دیکھ دیکھ کر اور بھی بگڑ رہے تھے۔ اب فرید بڑے پیار سے امرود کی بیج نکلی قاش میرے منہ میں ڈال رہا تھا میں مارے خوشی کے اپنے پوپلے منہ میں اس قاش کو گھماتے ہوئے بس رو ہی دینے کو تھا اتنی محبت اتنی توجہ...... آخر ہے تو میرا بیٹا میرا خون کیوں نہیں خیال کرے گا بوڑھے باپ کا......۔

میں نے فخر سے اپنے ادھیڑ عمر ہوتے بیٹے کو دیکھا آج کتنے دنوں بعد کتنی فرصت سے میرے پاس آ کر بیٹھا تھا پہلے رسول بخش نائی کو گھر بلوا کر میرا خط بنوایا تھا بال جو تھوڑے بہت رہ گئے تھے وہ سیٹ کروائے تھے میں نہایا تو میرے دونوں پیروں اور ہاتھوں کے ناخن تراشے ہلکا سا تیل میرے سر کے بالوں اور داڑھی میں خود لگایا وہ ایسا تو نہیں تھا جیسے آج کسی بچے کی طرح مجھے نہلا دھلا کر تیار کروا کے میری خدمت کر رہا تھا ایڑیوں پر لیکوئڈ جیلی سے مساج کیا تھا کچن سے چکن بریانی کی خوشبوئیں گھر گھر کر آ رہی تھیں آج یہ آنگن کتنا مکمل کتنا خوب صورت لگ رہا تھا۔

"آج کل ابا جی، ریڈیو سننا بند کر دیا ہے۔" شاید وہ خود ہی بولا۔

"خراب پڑا ہے اس بار پنشن کے پیسے آتے ہیں تو ٹھیک کراؤں گا۔" میں بھی اس کی توجہ پا کر بالکل بچوں کی طرح منہ بسور کر بولا تھا۔

"حد ہو گئی ابا جی مجھ سے کہتے میں ٹھیک کروا دیتا ایک ہی تو بے ضرر سی تفریح ہے آپ کی۔" اس کے "بے ضرر" کہنے پر میں نے کن انکھیوں سے صحن میں پھرتی نجو کو دیکھا جو قطعاً متوجہ نہیں تھی۔

"پرسوں رات آپ سو گئے تھے ابا جی جب نوید کا فون آیا تھا۔"

"اچھا تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا۔" میں ایک دم سے چونکا تھا کتنے دنوں سے تو مجھے اس کے فون کا انتظار تھا۔

"آیا تھا میں آپ کے کمرے میں، آپ خراٹے لے رہے تھے: میں نے سوچا آپ کی نیند خراب ہو گی پھر آپ کہتے ہیں رات بھر سو نہیں سکا۔" پتا نہیں وہ سچ کہہ رہا تھا یا جھوٹ کیوں کہ خراٹوں والی نیند تو مدت ہوئی مجھے آنا بند ہو چکی تھی مگر میں اس وقت اسے جھٹلانا نہیں چاہتا تھا۔

"اس نے اپنا اپارٹمنٹ خرید لیا ہے، یہی خوش خبری سنا رہا تھا۔" فرید نے میری ایڑیاں سہلاتے ہوئے آہستگی سے بتایا۔

"اچھا یہ تو اچھی بات ہے انسان جہاں کہیں بھی ہو اس کے پاس چھت اپنی ہی ہونی چاہیے آج میری اس سے بات کرا دینا میں مبارک دوں گا اسے۔" میرا دل اس خبر سے نہال سا ہو گیا تھا اولاد پھلے پھولے ترقی کرے ماں باپ کی اس سے بڑھ کر اور خوشی کیا

ہوتی ہے۔

"ابھی کرواتا ہوں آپ کی بات۔" وہ فوراً وقاص کو فون باہر لانے کے لیے آوازیں دینے لگا میں نے کچھ اچنبھے سے اسے دیکھا ورنہ تو وہ میری اس فرمائش کو عموماً ٹال ہی دیا کرتا تھا۔

"ابا جی نوید نے وہاں بھی اپنا اپارٹمنٹ لے لیا ہے، اور میں نے سنا ہے اس کا دوست عمران وہ بتا رہا تھا اس نے یہاں کسی اسکیم میں کوئی فائل بھی خرید لی ہے دو تین قسطیں تو دے بھی چکا ہے۔" فرید کا لہجہ ایسی خوشخبریاں سناتے ہوئے نہ جانے کیوں بجھا ہوا سا لگا۔

"آخر بھائی ہے نا اس کی ترقی ...... طبیعت پر بوجھ تو ڈالے گی فطری سی بات ہے اقبال میاں۔" میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا اور مسکرادیا۔ "میں کہہ رہا تھا ابا جی اب میں جس نوکری میں ہوں یہاں سے تو دال دلیا ہی چل جائے تو بڑی بات ہے کجا گھر پلاٹ خریدنا۔" وہ کہنے لگا میں نے الجھ کر اسے دیکھا فون اس کے پاس پڑا تھا۔

"میں کہہ رہا تھا اب نوید کو تو چلو گھر کا کوئی مسئلہ نہیں رہا۔"

وہ یقیناً کسی بات کے لیے تمہید باندھ رہا تھا۔

"بیٹا اللہ کے فضل سے گھر کا مسئلہ تو تمہارے ساتھ بھی نہیں۔" میں نے آہستگی سے کہا۔

"ابھی نہیں ہے کل کو ہو جائے گا۔" وہ تیزی سے بولا۔

"کیوں کل کیوں ہو جائے گا۔" میں قطعاً نہیں سمجھا۔

"جب وہ واپس آ کر اس گھر میں اپنا حصہ بھی لے گا تو میرے حصے میں جو آئے گا، اس سے میں تو الگ گھر تو نہیں خرید پاؤں گا۔ پراپرٹی کی قیمتیں تو آپ کو پتا ہی ہے، آسمان سے باتیں کر رہی ہیں پھر ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو اس نے کون سی کوئی ذمہ داری اٹھائی ہے۔ اماں ہمارے پاس تھیں اور اب آپ بھی ...... بلکہ الٹا اس کے ٹکٹ کے پیسے آپ کو یاد ہے میں نے دیے تھے۔" وہ کہہ رہا تھا اور میرے اندر کچھ ٹوٹے جا رہا تھا۔ مجھے یاد ہے اس نے محض چند ہزار روپے دیے تھے، وہ بھی نوید نے اسے واپس جا کر بھجوا دیے تھے۔ ماں باپ کا بوجھ اس نے اٹھایا تھا۔ "بوجھ" پر میرے سینے میں درد کی کیسی لہر سی مچلی تھی جبکہ میری پنشن میں سے گھر کے کچھ خرچ بھی چلتے تھے اور ایک آدھ بل بھی۔ میرا کھانا پینا جو تھا، روز کسی فقیر کو دینے کی مانند احسان کر کے دیا جاتا۔ وہ اس احسان کا ریٹرن

چاہ رہا تھا۔

"آپ خود سمجھ دار ہیں، حق بات ہی کریں گے۔ اب یہ نجو کو ہی دیکھ لیں۔ بیمار ہو، کچھ بھی ہو آپ کے لیے تو یہ پرہیزی کھانا پکاتی ہی ہے پھر میں جو مجھ سے بن پڑتا ہے، اس نے اور اس کی بیوی نے کیا حق ادا کیا آپ کا۔ ایک دن بھی خدمت نہ کی تو کس منہ سے حق کی بات کریں گے۔ آپ سمجھ دار ہیں، سوچ لیں۔ چاہے تو اس سے بات کر کے بتا دیں اس کو کہ وہ اپنے لیے چھت خرید چکا ہے، اس لیے آپ یہ گھر میرے نام کر رہے ہیں۔ میں دو چار دنوں میں وکیل صاحب کو گھر ہی لے آؤں گا پیپرز تیار کروا کے۔ میں نمبر ملاتا ہوں نوید کا۔" یہ کہہ کر وہ نمبر ملانے لگا اور میرے اندر گہرے تہ در تہ سناٹے بھنور سے بنانے لگے۔ میرے پیٹ میں گڑدں گڑدں ہو رہا تھا۔ نجو ٹھیک کہتی تھی۔ مجھے امرود نہیں کھانے چاہئیں۔ تھوڑی سی عیاشی ذرا سی خوشی میرا بوڑھا معدہ اب برداشت نہیں کرسکتا۔

"لیجیے ابا جی! بیل جا رہی ہے، آپ خود ہی بات کر لیجیے گا۔"

اس نے ریسیور میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ "میں دیکھوں بریانی تیار ہوگئی ہے تو گرما گرم کھاتے ہیں۔" وہ اٹھ کر کچن میں چلا گیا اور نجو سے باتیں کرنے لگا۔

بیل مسلسل جا رہی تھی۔

"ہیلو ...... ہیلو ...... کون ......" نوید کی آواز سے میرے پیٹ میں گڑدں گڑدں اور بھی بڑھ گئی۔ میں نے جلدی سے ریسیور رکھ دیا اور چھڑی سنبھالتے ہوئے اندر واش روم کی طرف تیزی سے بڑھ گیا۔

☆

"چاچا جی ...... چاچا جی ...... میں کیا کروں۔" وہ ایک بار پھر رو رہی تھی۔

"اب کیا ہوا دھیے۔" آج تین دن بعد میں گھر سے نکلا تھا اب کے پچیش اور پھر موشن نے مجھے کھڑا ہونے کے لائق بھی نہیں چھوڑا تھا۔ یہ تو عفت کا بیٹا پیغام لے کر گیا تو میں ڈولتا دیواروں کو پکڑتا آ گیا۔ معلوم نہیں بے چاری کو کیا کام ہے۔

"میں کیا بتاؤں چاچا جی ...... کیا بتاؤں۔" وہ مسلسل سیاہ دوپٹے میں منہ چھپائے روئے جا رہی تھی۔

"پتا بھی تو چلے آخر ہوا کیا۔ وہ کرائے دار چلے گئے۔" مجھے شک سا گزرا تو میں نے پوچھ ڈالا۔ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''تو پھر کیا ہوا۔'' میں نے سکون کا سانس لیا۔ وہ بس روئے گی۔

''بھٹی آیا تھا کسی کو لے کر۔''

''جی دو پارٹیوں کو لایا تھا گھر دکھانے، کل تک بتائے گا فائنل۔''

وہ چہرہ رگڑ کر خود کو سنبھالتے ہوئے نم آواز میں بولی۔ اس کا چہرہ رو رو کر سرخ ہو رہا تھا۔

''چاچا جی! میں تنگی ترشی میں گزارا کر سکتی ہوں، خود اور اپنے بچوں کو دو کی جگہ ایک اور ایک کی جگہ آدھی روٹی کھلا سکتی ہوں مگر......'' اس کی آنکھوں میں پھر سیلاب اترنے لگا۔

''مگر کیا کچھ بتاؤ گی نہیں۔'' میں اب کے جھلا کر بولا کمزوری سے مجھے چکر سے آرہے تھے۔

''چاچا جی! آپ سے ایک بات کہوں۔'' وہ اپنی انگلیاں مروڑتی سر جھکا کر بولی۔

''وہی تو کہہ رہا ہوں، کہو۔'' میں نے سر کرسی سے لگا دیا۔

''چاچا جی! اگر کوئی ضرورت مند نیک شریف ...... چاچا جی ...... اگر میں عقد ثانی کرلوں تو......'' وہ رک رک کر جھجک کر بولی تو پل بھر کو میں پتھرا سا گیا۔ یہ ایک بات اس کی بیوگی کے شروع دنوں میں اس کے باپ نے اور اس کے باپ کے مرنے کے بعد میں نے اور دوسرے محلے داروں نے کتنی بار کہی تھی اور عفت نے ایک ''ناں'' کو پکڑے رکھا تھا اور اب اپنے منہ سے......

''اس میں کوئی حرج نہیں۔'' میں نے پہلے بھی تم سے کہا تھا۔'' میں اب کچھ کچھ اس کا مسئلہ اور رونے کا سبب سمجھ گیا تھا۔

''مگر کوئی ایسا نیک شریف اور پھر جو میرے بچوں کو بھی دل سے قبول کرے، ایسا کون ہوگا چاچا جی!'' کہتے کہتے وہ مایوس سی ہو کر رہ گئی۔

''میں نے کہا نا دھیے! اللہ کی زمین نیک لوگوں سے ابھی خالی نہیں ہوئی۔ اگر تمہاری یہ خواہش ہے تو میں اِدھر اُدھر دو چار لوگوں سے کہتا ہوں۔ پتا کرتا ہوں، اللہ کوئی نہ کوئی نیک سبب بنا دے گا۔'' میں نے اسے تسلی دی۔

''جو کوئی بھی ملے گا چاچا جی! لالچی اور دو نمبر ہی ہوگا، صرف اس گھر کے لالچ میں۔ میرے بچے رل جائیں گے۔'' وہ قطعیت سے بولی۔

''یوں ناامید نہیں ہوتے بیٹا! ساری دنیا ایسی ہوتی تو کب کی ختم ہو چکی ہوتی۔''

میں نے اسے تسلی دی۔

''بس چاچا جی! میں یہ نکاح اپنے اور اپنے بچوں کے تحفظ کے لیے کرنا چاہ رہی ہوں۔ اپنے نام کے ساتھ کسی کا نام...... جو یہ بے اماں سی رستے میں پڑی ہوں کہ ہر آتا جاتا مجھے مال غنیمت سمجھ کر محض عیاش طبع کے لیے استعمال کرنا چاہے، اس سے میں محفوظ ہو جاؤں۔'' وہ اسی طرح انگلیاں مروڑتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''میں سمجھتا ہوں بیٹی تمہاری پریشانی، میں نے تو پہلے ہی کہا تھا۔'' مجھے اس کی اجڑی صورت پر کیسا رحم آرہا تھا کہ جی چاہ رہا تھا، اسے اس بے رحم دنیا سے چھپا کر کہیں اور رکھ دوں۔

''آپ سے ایک بات کہوں۔'' وہ ہر بار کہتی اور پھر رک جاتی، نظریں جھکا کر رہ جاتی۔

''کہو نا جو بھی کہنا ہے، میں سن رہا ہوں۔''

اس نے ایک نظر آنگن میں بیٹھے اپنے جگر کے ٹکڑوں کو دیکھا جو سہمے سہمے اپنے ٹوٹے پھوٹے کھلونوں سے کھیل رہے تھے۔

''آپ...... آپ مجھ سے عقد ثانی کرلیں۔'' مجھے چکر تو پہلے ہی آرہے تھے، اب کے تو ایسا چکر آیا کہ میں کرسی کے ایک طرف لڑھک گیا۔

''کک...... کیا کہا...... بیٹی! میں نے سنا نہیں۔'' موٹے عدسوں کی لڑھکتی عینک اور چکراتے سر کو سنبھال کر میں بامشکل سیدھا ہوا تھا۔

''میں آپ کی بیٹی نہیں ہوں، آپ کے مرحوم دوست کی بیٹی ہوں اور اب جبکہ میں خود کو اپنے آپ کو بے آسرا محسوس کر رہی ہوں اور کوئی مخلص سہارا بھی نہیں روزگار کے لیے جس کو کرائے پر رکھتی ہوں اس کی جھکی نگاہیں اٹھتی ہیں تو سارے زمانے کا میل کیچڑ ان نظروں میں ہوتا۔ خود کو چھپا چھپا کر تھک گئی ہوں۔ یہی نہیں، سلائی کا سامان یا گھر کا ضروری سامان لینے نکلتی ہوں اپنے تحفظ کے لیے ان ننھے فرشتوں کی انگلیاں مضبوطی سے تھام لیتی ہوں پھر بھی ...... یہ میلی نظریں نہ جھکتی ہیں، نہ جھجکتی ہیں۔ بڑی ڈھٹائی کے ساتھ اور اب تو ...... بہت مشکل ہوگیا ہے۔ خود کو بچانا۔ وہ حرامی دادا...... اب تو کھلم کھلا کل بھرے بازار میں میرا ہاتھ پکڑ کر اس نے مجھے کھینچتے ہوئے......'' اس کے آگے اس کی آواز گلے میں گھٹ گئی اور وہ ایک بار پھر دوپٹے میں منہ چھپا کر رونے لگی۔

''اوہ تو یہ بات ہے، تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔'' مجھے بے حد افسوس ہوا اور اس ملعون سے یہ ہی توقع تھی اسے یوں بھی کوئی روکنے ٹوکنے والا تو تھا نہیں سب شکر ے

تھے اور وہ اکیلا باز...... نہیں بلکہ گدھ ...... حرام کھانے والا۔

''بس آپ مجھ سے نکاح کرلیں پلیز۔'' وہ ایک دم سے دوپٹہ ہٹا کر فیصلہ کن انداز میں بولی تو اب کے مجھے چکر نہیں آیا۔

''اس سے کیا ہوگا میں کون سا طاقتور پہلوان ہوں جو اس شیطان کے آگے بند باندھ سکوں اس کے لیے تو کوئی مرد توانا......''

''نہیں چاچا مجھے مرد توانا نہیں اس مرد معاشرے میں ایک مرد کے نام کا تحفظ چاہیے اور بس، پلیز آپ میری درخواست پر غور کریں ہم اوپر والا پورشن کرائے پر دے دیں گے آپ کی میں خدمت بھی کروں گی اور......'' وہ لب کچلنے لگی۔

مجھے اس کی حالت پر ترس کے ساتھ ہنسی بھی آئی اس نے باز کا شکار ہونے سے بچنے کے لیے شکرے بلکہ چڑے کی پناہ ڈھونڈنے کی کوشش کی تھی۔

''یہ فضول باتیں نہ کرو میرے ساتھ اور ابھی ایسا اندھیر نہیں مچا کہ وہ خدانخواستہ تمہیں یونہی اٹھا کر لے جائے ابھی یہاں زندہ لوگ بھی رہتے ہیں سب مردے نہیں تم فکر نہیں کرو میں کوشش کرتا ہوں کوئی نیک ہمدرد اور مخلص شخص مل جائے۔''

''مجھے کسی بھی ہمدرد نیک اور مخلص شخص کی نہیں آپ کی ضرورت ہے آپ میں بھی تو یہ تینوں خوبیاں موجود ہیں تو پھر ڈھونڈنے کی کیا ضرورت؟'' وہ تیزی سے بولی تو میرے ماتھے پر پسینہ سا آگیا۔

''اس وقت تم جذباتی ہو رہی ہو میں چلتا ہوں انشاء اللہ جلد ہی تمہیں کوئی نہ کوئی خوش خبری......''

''نہیں اقبال صاحب کوئی خوشخبری نہیں ...... آپ آکر اس جمعہ کو نکاح کرلیں بالکل سادگی سے ...... میں کسی اور کو کچھ بھی نہیں دینے کے قابل۔ آپ کو میرے بارے میں سب علم ہے پلیز۔'' اس نے پہلی بار زبان سے مجھے اقبال صاحب کہا اور مجھے کھڑے کھڑے پھر جھکولا سا آیا تھا مگر میں سر جھٹکتا آگے بڑھ گیا۔

''میرے ساتھ یہ فضول باتیں مت کرو اپنی اور میری عمر کا فرق دیکھو یہ نہ بھی ہوتا تو بھی میں ایسا احمقانہ فیصلہ نہ کرسکتا ہوں اور نہ تمہارے ساتھ رہ سکتا ہوں۔''

''آپ اگر میرے سچے ہمدرد ہیں تو آپ کو میرا فیصلہ قبول کرنا پڑے گا۔'' وہ ایک دم میرے رستے میں آکر کھڑی ہوگئی تھی۔

''عفت میں اب اس سے زیادہ یہ مذاق برداشت نہیں کروں گا۔'' مجھے بھی غصہ آگیا۔

''یہ مذاق نہیں میرا فیصلہ ہے اور سن لیں اس دوران اگر کسی نے میری عزت پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی یا کسی طرح میرے بچوں پر مجھ پر کوئی حملہ آور ہوا تو اللہ کی قسم ہمارا خون آپ کی گردن پر ہوگا کیونکہ میں موت کو عزت پر ترجیح دوں گی پرسوں جمعہ ہے آپ سوچ لیجیے میں جمعہ کی شام گواہوں کے ساتھ آپ کا انتظار کروں گی میں یہ آخری جوا ضرور کھیلوں گی اپنے اور اپنے بچوں کے دفاع کے لیے ...... اور اگر آپ نہ آئے اور کوئی ...... کچھ ہوگیا تو آپ کو ہم تینوں کی نعشیں اپنے ہاتھوں سے دفنانا ہوں گی اور روز حشر آپ کا گریبان ہوگا اور میرے ہاتھ ...... بس اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کہوں گی۔'' وہ روتے ہوئے کہہ کر اندر بھاگ گئی اور میں گم صم صحن کے بیچوں بیچ کھڑا رہ گیا۔

''کیسی احمق بے وقوف لڑکی ہے بھلا ایسے بھی ہوتا ہے ایسے بھی ہوسکتا ہے اس عمر میں، میں سارے زمانے میں اپنی ہنسی اڑاؤں، مذاق بنواؤں لو بھلا دیکھو کیا حل نکالا ہے اس جذباتی احمق لڑکی نے جس سے یہ مجھے دھمکائے گی اور میں جمعہ کی شام کو قاضی اور گواہوں کو لے کر آ بھی جاؤں گا مذاق سمجھ رکھا ہے اس نے نکاح کو ہونہہ۔'' میں بڑبڑاتا ہوا باہر نکل آیا کتنے دنوں سے باغ بھی نہیں گیا تھا اور جانے کی ہمت بھی نہیں تھی باہر نکل کر شرفو کے تھڑے پر بیٹھ گیا اس کی دکان آج بند تھی۔

''آج دکان بند ہے شرفو کی۔'' میں نے پاس آکر بیٹھے کرم دین سے یونہی پوچھا اپنی توجہ ہٹانا چاہ رہا تھا اس فضول بات سے جو ابھی عفت نے مجھ سے کی تھی۔

''ہاں جی آپ کو نہیں پتا بڈھی گھوڑی لال لگام شرفو کو اس عمر میں سر پر سہرے سجانے کا شوق چڑھا ہے جوان اولاد بلکہ اولاد، بچے کے بھی بچے ہیں اور اس بڈھے کے قبر میں پیر لٹکے ہیں نکاح کی سوجھ گئی ابھی بیوی مرے چار سال نہیں ہوئے دن رات واویلا کرتا تھا بہوئیں بیٹے پوچھتے نہیں میں تو ان کے آگے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جاؤں گا اور یہ مجھے ایک چچہ پانی کا نہیں پلائیں گے لمبا ہاتھ مارا ہے اب کے اس نے امیر بیوہ ہے، بچے بیاہ کر وہ بھی فارغ ہے اسی کے گھر میں بیاہ کے بعد رہے گا گھر جوائی بن کر، اس عمر میں سٹھیا گیا ہے بھلا اب کوئی پوچھے تیرے دن کتنے ہیں زندگی کے جو دولہا بننے چلا ہے قرب قیامت ہے، صاحب قیامت۔''

کرم دین بولتے ہوئے کانوں کو ہاتھ لگا رہا تھا اور میرا سر مسلسل چکرا رہا تھا۔

☆

مجھے حقیقتاً اس کی گولڈن آفر نے چکرا دیا تھا۔

نجو اور فرید کے رویے ایک دم سے سرد ہو گئے تھے جیسے میں یہ گھر ابھی یا تو اپنی چھاتی پر اٹھا کر لے جاؤں گا یا دو ٹکڑے کر کے ایک نوید کو بھجوا دوں گا حالانکہ اس کے اپارٹمنٹ خریدنے کی بات سن کر میں نے فوری طور پر دل میں سوچا تھا کہ یہ گھر اب فرید اور اس کے بچوں کو ملنا چاہیے بے چارے کی تنخواہ بھی کم تھی اور محنت زیادہ کرتا تھا وہ نئے سرے سے گھر کیسے بنا پائے گا مگر نئی نسل ہم سے زیادہ جلد باز ہے فوراً سوچنے کے بعد نتیجے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنا شروع کر دیتی ہے اور متوقع نتائج نہ نکلیں تو ......

دونوں کا رویہ مجھ سے بالکل اجنبی سا ہو چکا تھا خیر پہلے میں ان کے اتنے کڑوے کسیلے اجنبی رویے جھیل چکا تھا کہ یہ نئی سرد مہری مجھے بہت زیادہ تکلیف نہیں دے رہی تھی زیادہ تکلیف مجھے عفت کی زندگی کو دیکھ کر ہو رہی تھی اس کے لیے کسی مضبوط سہارے کا ہونا بہت ضروری تھا ابھی تو اس کی عمر بمشکل اٹھائیس انتیس سال ہو گی اور دنیا کیسی ہوس پرست ہے یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی بچے چھوٹے تھے اگر بے چاری ہراساں تھی اور خوف میں ایسا الٹا سیدھا سوچ رہی تھی تو کچھ غلط نہیں تھا مگر خیر اب ایسی بھی کوئی بات نہیں کہ میں اس کی ''گولڈن آفر'' کو دل سے قبول کر بیٹھا تھا میں اپنے اردگرد کوئی بھی ایسا مخلص شخص سوچوں میں تلاشے جا رہا تھا جو اس کو تحفظ دینے کے قابل ہوتا اور بہت افسوس کی بات یہ تھی کہ ابھی تک میں ایسے کسی بھی شخص کو سوچ نہیں پایا تھا۔

ہمت کر کے اگلے دن باغ گیا اور اپنے ہم جولیوں کے آگے یہ مسئلہ رکھ دیا مگر پوری بات نہیں بتائی صرف اس کی مجبور حالت کا ذکر کیا۔ ''یار یہ تو سچ ہے جدھر بھی اس کے لیے رشتہ تلاشو گے ہر کوئی اپنے مطلب کا ہی نکلے گا آج کل جو کسی قابل ہیں ان کی ناک کے نیچے اچھی بھلی پڑھی لکھی کنواری لڑکیاں نہیں آتیں کجا یہ بیوہ اور دو بچوں کی ماں بہت مشکل ہے، جو بھی ملے گا نکھٹو نکما یا لالچی ہی ملے گا۔'' حبیب نے فوراً میرے خدشوں کی تائید کر دی۔

پھر کافی دیر ہم لوگ اس مسئلے پر غور و خوض کرتے رہے۔

''بھئی جو بھی ہو عورتوں کو بیچ میں ڈالے بغیر یہ مسئلہ حل نہیں ہو سکتا اپنی بیویوں سے بات کرو وہی کوئی ایسا خواہش مند حسب حال رشتہ ڈھونڈ سکتی ہیں۔'' یہ سب ٹالنے والی باتیں تھیں۔

میں جانتا تھا کوئی بھی سوائے زبانی جمع خرچ کے عملی قدم اٹھانے کی ہامی نہیں

بھرے گا ابھی جو میں ان کو بتا دوں کہ اس نے مجھ سے نکاح کی شرط رکھی ہے ورنہ اپنی جان دینے کی تو ان لوگوں کو جو میرا ریکارڈ لگاتا ہے اور جو تمسخر اڑاتا ہے الاماں۔

میں سوچتے ہوئے اٹھ کر چلا آیا۔

کمزوری کی وجہ سے ابھی بھی چلنا دوبھر تھا میں نے شارٹ رستہ اختیار کیا سامنے اس علاقے کا اکلوتا بازار تھا اس کی گہما گہمی اور رش کی وجہ سے میں ادھر سے کم ہی گزرا کرتا تھا جبکہ یہ باغ اور میرے گھر کے درمیان بڑا مختصر رستہ تھا سامنے ہی یوسف کلاتھ شاپ تھی اس علاقے کے بازار کی سب سے بڑی کپڑے کی دکان اور آج پہلی بار شاید میں نے اسے اپنی سیٹ پر بیٹھے دیکھا تھا وہی بوسکی کی قمیص لٹھے کی شلوار کے اوپر براؤن واسکٹ گرم چادر لیے وہ بازار کی طرف بڑی چوکنی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

''ماں باپ بچپن میں ساتھ چھوڑ جائیں تو بڑے بڑے انمول ہیرے رل جاتے ہیں شکل کیسی اچھی رب نے دی ہے اور کرتوت ...... باپ کے مرتے ہی چچا نے دکان اور مکان پر قبضہ کر لیا تو یہ گلیوں میں رلنے لگا پڑھائی ختم ہو گئی تھرڈوں کے یاروں سے دوستی ہو گئی انہیں سے جیب کترنا سیکھا جوا کھیلنا، شراب پینا اور پستول چلانا ایک بار جیل بھی گیا مگر رات بھر کے بعد اگلی صبح واپس آ گیا جوان ہوا تو حوصلے بھی جوان ہو کر نڈر ہو گئے تھے ایک دن اسلحہ لے کر ساتھیوں کے ساتھ چچا کی دکان پر حملہ کیا اس کا اور اس کے بیٹوں کا مار مار کر بھرکس نکال دیا اور دکان اور مکان پر اپنا قبضہ کر لیا بس وہ دن اور آج کا دن سب لوگ اس کا نام بھول گئے یوسف سے ''دادا'' بن گیا اور وہ ''دادا'' آج لوگوں کی عزتوں کا ''دادا'' بنا بیٹھا تھا اسے دیکھتے ہی مجھے عفت کی پاکباز روتی معصوم صورت یاد آ گئی نفرت کی تیز لہر میرے جسم میں دوڑ گئی میں تیزی سے لاٹھی ٹیکتا اس کی دکان کے آگے سے گزر گیا۔

☆

اگلے روز جمعہ تھا اور لاکھ پہلو بدلنے پر بھی مجھے نیند نہیں آ رہی تھی جیسے میں کانٹوں کے بستر پر پڑا ہوں میں ان تین دنوں میں ایک بار بھی عفت کی طرف نہیں گیا تھا میں جان بوجھ کر اس کے گھر کے آگے سے بھی نہیں گزرا تھا حالانکہ ساتھ کی دیوار تھی کچھ نجو کو میرا ادھر آنا جانا زیادہ پسند نہیں تھا وہ بے چاری بوقت ضرورت بلوا بھیجتی تو میں جاتا تھا ورنہ خود سے کبھی نہیں گیا تھا۔

''کل احمق کچھ کر ہی نہ گزرے۔'' میں جتنا بھی بہادر بنتا کمزور جسم کے ساتھ دل

بھی تو بوڑھا اور کمزور ہو چکا تھا۔

میں اندر کی گھٹن سے گھبرا کر برآمدے میں پڑے تخت پر آ کر لیٹ گیا۔

اوائل مارچ کا نیلا ستاروں سے اٹا آسمان اور ہلکی ہلکی خنک ہوا بڑی اچھی لگ رہی تھی شاید اس ہوا کا اثر تھا جو مجھے لیٹتے ہی نیند آ گئی ابھی آنکھ ہی لگی تھی کہ ایک تیز چیخ کی آواز نے جیسے مجھے جھنجوڑ کر اٹھا دیا میں گھپ اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ کر دیکھتے ہوئے اٹھ بیٹھا جب دوسری گھٹی گھٹی سی چیخ فضا میں لہرائی۔

وہ آوازیں عفت کے گھر سے آ رہی تھیں مجھے اندازہ لگانے میں دیر نہیں لگی اور لاٹھی سنبھالتے دیوانہ وار بھاگ کر میں اس کے دروازے پر پہنچ گیا دروازہ بند تھا میں نے اندھا دھند پیٹنا شروع کر دیا چٹخنی کسی نے لگائی ہوگی مگر صحیح طرح سے لگی نہیں تھی کہ میرے دھڑ دھڑانے سے دروازہ ایک دم سے کھل گیا اس وقت عفت کی گھٹی ہوئی تیز چیخ میرے کانوں سے ٹکرائی سامنے برآمدے میں مکمل اندھیرا تھا کہ ستون کے پیچھے......

میں لاٹھی ہوا میں لہراتا کسی توانا جوان کی طرح اِدھر لپکا تھا۔

''اوئے کون ہے ٹھہر ذرا تو حرامی۔'' میں ستون کے پاس جا کر زور سے چلایا۔

وہ گتھم گتھا سائے مزاحمت ترک کرتے ہوئے ایک دوسرے سے علیحدہ ہوئے میں نے لاٹھی ہوا میں لہرا کر اس قد آور سائے کو مارنا چاہی کہ اس کے ہاتھ میں کوئی سیاہ چیز چمکی اور دوسرے لمحے جیسے کسی نے جلتا ہوا سیسہ میرے کندھے میں اتار دیا ایک دلدوز چیخ میرے منہ سے نکلی میں گرنے کو تھا کہ عفت نے آگے بڑھ کر مجھے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا اس وقت گلی میں بھاگتے قدموں کی آواز آئی اور وہ بد بخت قلانچیں بھر کر صحن عبور کر گیا۔

''ہمت ہے بد بخت تو دن میں آ، جگرا ہے تو حلال کھا مردار کیوں کھاتا ہے کسی گدھ کی اولاد۔'' میں اس کے پیچھے پورا زور لگا کر چلایا تھا اور ساتھ ہی میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا میں گرتا چلا گیا۔

☆

''بزرگو کچھ بتایئے کچھ نظر آیا ہو کہ وہ کون تھا؟'' پولیس کی وردی میں ایس ایچ او نے تیسری بار مجھ سے اگلوانا چاہا۔

''نہیں جناب اندھیرے کی وجہ سے میں کچھ نہیں دیکھ سکا اور جلدی میں عینک بھی گھر بھول گیا تھا تو مجھے کیا نظر آنا تھا۔'' میں نے بے بسی سے کہا تو وہ سر ہلا کر پیڈ پر کچھ

لکھتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

عفت نے میری طرف شکایتی نظروں سے دیکھا میں نے نظریں پھیر لیں۔

''کیا ضرورت تھی یوں پرائی آگ میں چھلانگ لگانے کی بھلا یہ عمر ہے ایسے معرکے سر کرنے کی خود کو ہیرو سمجھتے ہیں کسی پنجابی فلم کا، بندہ کسی کو بتا لیتا ہے آج کچھ ہو جاتا کم بخت ڈرامہ کرنے ولوں کا تو کچھ نہ بگڑتا ہم آج بیٹھے رو رہے ہوتے۔'' نجو نے چند منٹ پہلے والے وکھی مکالمے طنزیہ لہجے میں ایک بار پھر دوہرائے کچھ ایسے ہی جملے فرید کی چبھتی ہوئی نظریں بھی کہہ رہی تھیں میں نے تھک کر آنکھیں موند لیں۔

☆

آج پورے دو ماہ بعد میں باغ آیا تھا اور ان دو ماہ کے دوران ...... میرا زخم تو بھر گیا میں پھر سے زندگی کی طرف لوٹ آیا یہ سوچتے ہوئے کہ یقیناً میرے اللہ نے مجھے یونہی بے سبب زندہ نہیں رکھا ہوا وہ ہر جاندار کے جینے اور مرنے کا حساب کتاب رکھتے ہوئے ہے یہاں کچھ بھی فالتو نہیں کوئی بھی کار بے کار نہیں سب کچھ کسی نہ کسی مصلحت کے تحت ہو رہا ہے۔

''اسلم چلا گیا۔'' مجھے باغ میں آنے کے بعد پہلی یہ دل ہلا دینے والی خبر ملی میں نے نم آنکھوں سے توفیق اور حبیب کی طرف دیکھا تو وہ نظریں چرا گئے.

''اب ہم تینوں میں سے کس کی اگلی باری ہوگی۔'' یقیناً ہم تینوں سر جھکائے یہی سوچ رہے ہوں گے۔

پھر توفیق بیمار پڑ گیا تو کم کم آنے لگا۔

اس دن حبیب بھی نہیں آیا تھا میں اکیلا ہی بیٹھا درختوں کی شاخوں پر پھدکتے پرندوں اور پھولوں پر اڑتی تتلیوں کو دیکھتے ہوئے زندگی کی رنگا رنگی کو محسوس کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اچانک کوئی میرے پاس آ کر بیٹھ گیا۔

''آپ نے پولیس کو میرا نام کیوں نہیں بتایا۔'' اس نے وہ سوال پوچھا جو عفت نے بھی بعد میں مجھ سے پوچھا تھا۔

''اس لیے کہ تم دو چار دن یا دو چار ماہ بعد حوالات کی ہوا کھا کر لوٹ آتے اور میں ...... میں نے اور میرے بچوں نے اسی محلے میں رہنا تھا مجھے اپنی جان کی پروا نہیں مگر میرے بچوں کی زندگیاں تم جیسوں کی وجہ سے تنگ ہوں یہ خیال ہی مجھے گہرے دکھ میں مبتلا کر دیتا ہے۔'' میں نے بالکل سچ کہا تھا میں نے اسی وجہ سے اس کا نام پولیس کو نہیں بتایا تھا۔

"آپ کی اس رات کی بات پر عمل کرنے آیا ہوں۔" وہ نگاہیں جھکا کر بات کر رہا تھا سب سے حیران کن بات یہ تھی۔

"کیا مطلب؟"

"نہ میں مردار کھاتا ہوں نہ میرے ماں باپ نے ...... کبھی آپ نے گھونسلے سے گرا کوئی پرندہ دیکھا ہے شاید نہیں ورنہ میرے بارے میں آپ ایسا نہ کہتے۔"

"یعنی جو کچھ تم اس رات کرنے آئے تھے اس پر تم سے ہمدردی کروں ہے نا۔" میں غصے میں چیخ کر بولا۔

"نہیں میں یہ نہیں کہتا ایک عرصے تک بری زندگی گزاری میں نے، مجھے گزارنے پر مجبور کیا آپ سب نے، جانتے ہیں یہاں کمزور کو کوئی اس کا حق نہیں دیتا جب تک طاقتور بن کر چھینو نہیں گھونسلے سے گرے پرندے نے ایک ہی سبق سیکھا اور پھر اس پر عمل کرتا رہا مگر اس رات آپ کا چیلنج اور طعنہ مجھے مار گیا میں اپنی زندگی تو خراب کر ہی رہا ہوں بچے ماں باپ کی قبروں کو بھی نت نئے عذاب میں مبتلا کر رہا ہوں۔ میں اپنے ساتھ اپنے ماں باپ کی قبروں کو ٹھنڈا کرنا چاہتا ہوں اگر آپ میرا ساتھ دیں۔" وہ ملتجی بالکل بدلے ہوئے لہجے میں بات کر رہا تھا۔

"میں کیا ساتھ دوں بھلا۔"

"میں عفت سے شادی کر کے ایک اچھی باکردار زندگی گزارنا چاہتا ہوں اس کے لیے آپ کو میرا سرپرست بننا ہوگا۔" اس نے گویا میرے پاس بیٹھ کر دھماکا کیا۔

"میں اور تمہارا سرپرست۔" میں نے تمسخر بھری نظروں سے اسے دیکھا انہیں نظروں سے جن سے وہ کبھی مجھے دیکھا کرتا تھا۔

"ہاں آپ ...... آپ نے مجھے اس رات کہا تھا کہ ہمت ہے تو دن کے اجالے میں آؤ میں آگیا ہوں اور آپ کے آگے دامن پھیلائے بیٹھا ہوں میرے پاس نہ کوئی گارنٹی ہے نہ گواہ ضامن سوائے اللہ کے اگر آپ اللہ کو میرا ضامن مانتے ہیں تو جان جائیے میں اندر باہر سے دھلے ہوئے کپڑوں کی طرح صاف ستھرا ہو چکا ہوں اس پاکباز عورت کی ہیبت اس کی محبت نے مجھے اندر باہر سے بدل کر رکھ دیا ہے مصلے پر بیٹھی جس پاکیزہ عورت پر میں نے شیطان کے اکسانے پر بری نیت سے حملہ کیا تھا میں اس کی زندگی کا ساتھی بننا چاہتا ہوں اگر آپ میرا ......" اس کے لہجے میں نمی تھی اور ج[illegible] نے اللہ کو اپنا ضامن کرلیا

تو پھر میرے پاس انکار کی کوئی گنجائش نہیں رہی۔

☆

عفت نے میرے آگے بیج نکلے امرودوں کی قاشوں پر نمک اور کالی مرچ چھڑک کر پلیٹ رکھی جسے میں مزے لے کر کھانے لگا۔

"یہ فاؤل ہے، بیوی پر پہلا حق شوہر کا ہوتا ہے نہ کہ آنٹی گوانڈی کا (ہمسائے کا)۔" وہ سامنے فواد کا گھوڑا بنا بیٹھا تھا احتجاجاً عفت سے بولا۔

"آنٹی گوانڈی آپ تو ہو سکتے ہیں میرے چاچا جی نہیں آپ یہ اپنے شہزادے کو شاہی سواری سے اتاریں اور جلدی سے مجھے قیمہ لا دیں آج کوفتے بنا لیتی ہوں چاچا جی آپ کو کھانا ادھر ہی کھانا ہے۔" وہ تاکیداً مجھ سے بولی۔

"خدمتیں تم چاچا جی کی کرو اور کام ہم کریں کیوں شہزادے۔" وہ فواد کو کندھے پر سوار کیے کھڑا تھا۔

"میاں تم کیوں جلتے ہو میری بہو میری خدمت نہیں کرے گی تو اور کون کرے گا۔" میں نے مزے سے قاش منہ میں گھماتے ہوئے کہا تو عفت مجھے گھورنے لگی یوسف کا اور میرا قہقہہ گونج اٹھا۔

میں نے گھر فرید کے نام کر دیا تھا سو اس گھر میں اب میں ہوتا یا نہ ہوتا انہیں کچھ خاص فرق نہیں پڑتا تھا اگرچہ زیادہ میں ادھر ہی رہتا تھا یوسف اور عفت گھڑی گھڑی مجھے بلاتے ہر اچھے کھانے میں شامل کرتے، باتیں چائے کے دور اور فواد گڑیا کی معصوم شرارتیں وقت گزرنے کا پتا ہی نہ چلتا باقی کا وقت یوسف کی دکان پر بیٹھ جاتا اس نے اپنا مکان کرائے پر دے دیا عفت کے گھر کو نئے سرے سے نئی تبدیلیوں کے ساتھ تعمیر کرا لیا ایک مکمل گھر ...... اور مجھے اس مکمل گھر میں باعزت حیثیت حاصل تھی اب مجھے اپنے بے کار ہونے اور خود پر ترس کھانے کی فرصت ہی نہیں ملتی تھی کیونکہ اب میرے دل کو اس بات کا پختہ یقین ہو چکا تھا کہ یہاں کچھ بھی مصلحت کے بغیر نہیں اور ہر ذی نفس اپنی مقررہ عمر سے ایک دن کم جی سکتا ہے، نہ زیادہ اور جتنا بھی جینا ہے وہ بے کار نہیں ہوگا۔ یوسف اور عفت کی کہانی پڑھ کر آپ بھی مجھ سے اتفاق کریں گے کہ اللہ چاہے تو کیسے ان کی حالت بدل دیتا ہے۔

بادنو بہار چلے

''کیا تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے؟''

وہ اتنی زور سے چلائی کہ اس کے ہاتھ سے ترازو ہی نیچے گر گیا۔

''اس میں دماغ خراب ہونے کی کیا بات ہے۔ آپ پر میں بہن جی زیادہ غصہ اس لیے نہیں کرتا کہ صبح منڈی میں یہ بھاؤ سن کر ایک بار تو میں بھی یونہی بگڑا تھا پر میرے بگڑنے سے بھاؤ کا کیا بگڑا؟ کچھ بھی نہیں۔ شام تک اور چڑھ جائے گا جیویں گڈی اڈی جاویں اوپر ہی اوپر ہاتھ کسے دے نہ آویں۔''

آخر میں وہ کچھ تنگ میں آکر ترازو میں ڈالی ہوئی بھنڈیوں والا پلڑا اوپر کی طرف کھینچتے ہوئے گنگنایا تو رشیدہ نے ایک زوردار دھپ اس کے پلڑے پر ماری۔

''گڈی پاوے اوپر جاوے یا کسی مسنٹڈے کے ہاتھ لگے، تو تو خدا کا خوف کر۔ پلڑا تو نیچے رکھ۔ سارے کے سارے ہی بے حیا ہو گئے ہو، صبح دودھ والا بالا گجر کمبخت دودھ کے نام کو لاج لگاتا ہے، نرا نالے کا میلا پانی ڈرموں میں بھر لاتا ہے۔ اکٹھے چھ روپے کلو پیچھے بڑھانے کی خوش خبری دوفٹ کے دانت نکالتے ہوئے سنا رہا تھا۔ میں نے تو اتنی زور سے بوہا (دروازہ) بند کیا، اس کا منہ بچ گیا دروازے میں آنے سے۔''

رشید بالے گجر کی خوش خبری سنانے میں جو مگن ہوئی، تاجے نے کام دکھلایا جلدی سے بھنڈیاں شاپر میں ڈال کر اس کے آگے رکھ دیں۔ سائرہ تو ابھی تک شاک سے نہیں نکلی تھی۔

''فیر باجی! چھٹانکی تول دواں۔''

وہ اس کے شاک زدہ چہرے کے آگے ہری کچور لمبی لمبی ڈنڈیوں والی صحت مند

مرچیں لہراتے ہوئے بولا تو وہ جیسے گہری نیند سے جاگی۔

''ہائے میں مرگئی کال دیاں نشانیاں اے مرن جوگیاں کوئی نہ پوچھے ان کو، سو روپے پاؤ ہریاں مرچاں۔ اللہ میری توبہ توبہ۔''

وہ شاک سے نکلتے ہی ایک بار پھر اپنے دونوں کانوں کو ہاتھ لگاتے گال پیٹتے ہوئے بولی۔

''سو روپے ہوں یا چار سو روپے دفع دور کر۔ نہ لے کدی سستی ہویاں خرید لاں گے۔''

رشیدہ نے مسلے ہوئے تین نوٹ ایک بیس کا اور ایک دس کا نکال کر اس کے ترازو میں رکھا۔

''نہ باجی ہریاں مرچاں بغیر کون سی ہانڈی وہ بھی دال سبزی والی اچھی لگتی ہے۔ گوشت مرغ تو اب خواب ہوئے۔'' سائرہ اسی صدمے سے نڈھال تھی۔

''اب سیری بہن! جتنی مہنگائی ہے نا تو ابلا ہوا دال بھات بلکہ پتے بھی سوادی لگتے ہیں۔ کاہے کو بندہ چونچلے دکھاتا پھرے۔''

رشیدہ نے اسے کمال ہمدردی سے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''چار ڈنڈیاں ہرے دھنیے کی ہی ڈال دے کمینے انسان، یہ کون سا تیرا سونے کے مول آتا ہے۔''

اس نے تاجے کی بھنڈیوں والی بوری کے نیچے دبے دھنیے کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا اور خود ہی جھپٹ کر تھوڑا سا کھینچ لیا۔

''نہ باجی! آج کل کوئی شے سستی نہیں نہ سونا سستا نہ سبزی نہ آٹا نہ ٹوٹا...... باستی چاول تو ہم جیسے نہیں کھا سکتے۔''

تاجا بھی دکھے دل سے بولا۔

''تو آج ادھر ہی کھڑی رہے گی۔ بارہ بج رہے ہیں ہانڈی چڑھانے کا ٹیم ہو گیا ہے۔''

رشید نے جاتے ہوئے اسے ٹھوکا دیا۔

''تیرہ روپے کی آدھی چھٹانک پہ دو مرچیں کر دوں۔''

تاجے کو بھی اس کی کمزوری کا علم تھا۔ اسے چھیڑنے کو بولا تو وہ جو ہاتھ میں پانچ روپے کا سکہ دبائے کھڑی تھی، اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھ کر رہ گئی۔

''اسے مرچوں بغیر چین نہیں آئے گا۔ لے لے پھر اپنے لیے دو مرچاں اکٹھے

تیرہ روپے کی۔ اب ایسا بھی کیا چسکا زبان کا کہ بندہ اس نمائی سبزی کے لیے تیرہ روپے برباد کردے۔"

ساتھ والی حامدہ اسے گوگو کھڑے دیکھ کر رشیدہ کو ٹہوکا دے کر بولی۔

"اسے تو ہر گھڑی چوتھا چڑھا رہتا ہے۔ ہری مرچیں یوں کھاتی ہے۔" وہ ابھی آگے کچھ اور کہنا چاہتی تھی کہ نعیمہ نے رشیدہ کے چٹکی کاٹی۔ تاج دین چور مسکراہٹ چہرے پر لیے بوتل کے ساتھ اپنی سبزیوں پر چھڑکاؤ کر رہا تھا۔

"دفع دور۔" سائرہ سب کو دفع دور کر کے مڑ آئی ہری مرچوں سمیت۔

آج اس کو دال پکانی تھی۔ بچے اور عادل تو دال سبزی کم مرچوں والی بلکہ پھیکی ہی کھا لیتے تھے جبکہ وہ اپنے لیے آخر میں ہری ہری دو مرچیں ضرور ڈال لیتی تھی اور کچی کچی مرچیں دال روٹی کے ساتھ کھانے میں اسے بہت لطف آتا تھا۔ مرچیں تو پچھلے ہفتے سے ختم تھیں، اول تو یہ تاج دین لا ہی نہیں رہا تھا۔ اس کا منہ کیسا پھیکا سیٹھا سا ہو رہا تھا۔ آج اوپر منڈیر ہی سے اس کی ریڑھی پر چھوٹی سی چھابڑی میں تھوڑی سی ہری مرچیں پڑی دیکھیں تو فافٹ کچن کے کارنس پر پڑا یہ پانچ کا سکہ لیے مرچیں لینے آگئی اور مرچوں کا بھاؤ سن کر ایک بار تو اس کے ہوش ہی گم ہو گئے۔

اتنی معمولی سی عیاشی وہ بھی ناقابل رسائی ہو گئی۔

اسے رونا سا آنے لگا۔ گیٹ بند کر کے اندر آ گئی۔

"لے لی سبزی۔" سامنے سے منزہ آ رہی تھی سوال سے زیادہ لہجے میں طنز تھا۔

"نہیں سبزی تو نہیں لینے گئی تھی، دال پکانی ہے میں نے تو ہری مرچیں لینے گئی تھی، سو روپے پاؤ۔"

وہ مرجھائے ہوئے لہجے میں جان چھڑاتے ہوئے بولی اور رکے بغیر آگے بڑھنے لگی۔

"تو لے لیں مرچیں۔" وہ جان کر اس کے پیچھے آئی۔

"نہیں کہاں سے لیتی تھیں دیکھوں اوپر چولہا جل رہا تھا۔" اس نے سیڑھیوں کے پاس پہنچ کر دوڑ لگا دی۔

"اچھا بتا دینا آج۔ دیکھ لو بھئی پوری پانچ تاریخ ہو گئی ہے کل بچوں کے اسکول کی فیسوں کی بھی آخری تاریخ ہے ہاں۔ مجھے اب دوبارہ ہرکارہ نہ بھیجنا پڑے۔"

منزہ نے اس کی تیز رفتاری اور یوں جان چھڑا کر بھاگنے پر قدرے بلند آواز میں

کہا تو اس کے قدموں کی رفتار خود بخود سست ہو کر بالکل ڈھیلی ہو گئی آخری تین سیڑھیاں تو اس نے رک رک کر طے کی تھیں۔ اوپر سامنے کے چھوٹے سے صحن میں تیز دھوپ چمک رہی تھی۔ سیڑھیاں چڑھنے ہی میں اسے اچھا خاصا پسینہ آ گیا تھا۔ آدھے کچن میں دھوپ تھی۔

وہ بے زاری سے جلتا چولہا بند کر کے اندر کمرے میں آ گئی اور پنکھا فل اسپیڈ سے چلا کر کمرے کے بیچوں بیچ فرش پر ہی بیٹھ گئی اور سر پکڑ کر گہرے گہرے سانس لیتے خود کو پرسکون کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

"آج پانچ تاریخ ہو گئی ہے۔ یہ لوگ بھی سچے ہیں اور بچوں کی فیسیں جمع کرانے میں صرف چار دن اور ہیں اور دین والا مسلسل تین دن سے تقاضا کر رہا ہے اور کتنا اسے کل کل پر ٹالوں۔ آلیں ذرا آج یہ عادل صاحب کیا تماشا بنا رکھا ہے انہوں نے۔ لعنت بھیجیں اس نوکری پر، کوئی اور ڈھونڈ لیں۔ آخر اس میں رکھا کیا ہے۔ اتنی ذلالت، دوڑ دھوپ، خجل خواری اور مہینے بعد چار پیسے آتے تھے۔ اس سے بھی گئے، جمع جتھا سارا ان چار مہینوں اٹھ گیا۔ آخر ہم بھی تو بال بچے دار ہیں۔ کب تک کمبخت قربانی کے بکرے بنے رہیں۔"

"ادھر ہوتا کیا ہے جو ہمارے پیٹوں پر پتھر باندھنے سے کچھ سدھر جائے گا یہاں تو۔" اس کے دل اور دماغ میں کھولن بڑھتی جا رہی تھی کہ نیچے ویسپا رکنے کی آواز آئی۔

"ہیں! یہ جاوید بھائی ابھی سے گھر آ گئے آج پھر۔"

وہ ایک دم سے اٹھی اور باہر منڈیر پر ذرا سا جھک کر نیچے صحن میں دیکھنے لگی۔ دونوں میں میاں بیوی آگے پیچھے اس پتلی سی گلی نما راستے سے گزر کر اپنے کمرے کی طرف جا رہے تھے۔

"چیمبر بند، کورٹ بند، ریلی تھی۔ تھوڑی دیر ادھر رکا ہوں۔ ایک دم سے طبیعت خراب ہونے لگی تو سب کہنے لگے۔ گھر چلے جاؤ۔ میں نے بھی سوچا اب ادھر رکنے کا فائدہ بھی کیا ہے۔ کام تو کوئی ہوتا نہیں۔ سارا دن یہ جلسے جلوس اور نعرے بازی اس لیے۔" وہ بیوی کو بتاتے ہوئے اندر کمرے میں چلے گئے تو وہ جلتی دھوپ سے گھبرا کر پیچھے ہٹ آئی۔

"ادھر ہوتا بھی کیا ہے۔ ریلیاں جلسے جلوس اور دھرنے ...... کچھ سدھرے یا نہ سدھرے، کتنے گھروں کے چولہے بجھ جائیں گے، بچے اسکولوں سے اٹھ جائیں گے اور ...... میرے جیسی قسمت کی ماری ہری مرچ کے مرچیلے ذائقے کو بھی ترس جائے گی اور دور سے حسرت بھری نظروں سے اس معمولی عیاشی کو تکا کرے گی ...... اس سب کا کچھ فائدہ

نہیں۔ آجائیں آج یہ عادل...... اور جاوید بھائی ظاہر ہے۔ خالی ہاتھ، خالی جیب ہی آئے ہوں گے تو شام تک لازمی ...... یا اللہ کیا کریں۔ افوہ ساڑھے بارہ ہوگئے۔ ابھی دال بھی نہیں چڑھائی اور بچے آنے والے ہیں۔ یہ سردردی تو اب عمر بھر کی ہے۔“

☆

وہ ہڑبڑا کر کچن کی طرف بھاگی۔

”السلام علیکم ماما......“

وہ تینوں کورس کی شکل میں سلام کرتے ہوئے آگے پیچھے سیڑھیاں چڑھتے آئے تھے۔ وہ عجلت میں ان کے سلام کا جواب دیتے ہوئے وہ چھوٹا سا تپتا برآمدہ طے کرکے خود سیڑھیوں کی طرف بھاگی۔ تین زینے عبور کرکے بانہیں پھیلا ننھی عبیر کو تیزی سے جھپٹ لیا۔

اس کا معصوم سرخ وسفید چہرہ دھوپ کی تمازت اور گرمی سے بخار زدہ سا لگ رہا تھا۔

چھوٹا سا سنو وائٹ والا بیگ بمشکل اس کے کندھے سے جھول رہا تھا۔

”شرم نہیں آتی۔ چھوٹی بہن کا بیگ نہیں پکڑ سکتے۔ کتنی مشکلوں سے وہ بے چاری سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔“

اسے گود میں اٹھا کر لاتے پیار کرتے وہ ان تینوں پر برس پڑی جو خود گرمی کی حدت سے سرخ پڑتے پسینے کے بہتے قطروں کے ساتھ اپنی جرابیں اور جوتے اتار اتار کر کمرے میں ادھر ادھر پھینک رہے تھے۔ ان کے بیگ پہلے ہی ایک دروازے کے پاس، دوسرا کمرے کے وسط میں اور تیسرا ٹی وی ٹرالی کے قدموں میں پڑا تھا اور تینوں کی پانی والی بوتلیں بھی ادھر ادھر پڑی تھیں منٹوں میں صاف ستھرا کمرہ بے ترتیب الجھا ہوا لگنے لگا تھا۔

اور یہ تو روز کی بک بک تھی کہ آتے ہی ان تینوں پہ چیختا چلاتا کہ بیگ، بوتلیں، جوتے، موزے ایک جگہ الماری کے نچلے خانے میں رکھو، یونیفارم پچھلے کمرے میں الماری میں نہ سہی ایک ہی جگہ پر اتار کر رکھ دو مگر ان تینوں کے کانوں پر جوں نہیں رینگتی تھی اور آج تو اس کا یہ بے کار کی چیخ و پکار کرنے کا موڈ بھی نہیں تھا۔ ذہن پہلے ہی بہت پریشان سا تھا۔

اس نے عبیر کے کپڑے بدلے اور اس کا منہ ہاتھ دھلانے باتھ روم میں لے گئی جبکہ وہ تینوں بھی چینج کرکے گھر بھر میں پھرنے لگے تھے۔ حسن نے تو فوراً ہی ٹی وی آن کرکے کارٹون نیٹ ورک لگا لیا تھا۔ رمنا اسے ”ہنگامہ“ لگانے کے لیے کہتے ہوئے ریموٹ کنٹرول جھپٹنے کی کوشش کرنے لگی۔

”ماما! آج پھر دال۔“ حسین جو بھوک کا کچا تھا کچن میں ہانڈی کا ڈھکن اٹھاتے ہی چلایا تھا۔

”منہ ہاتھ دھو لیے ہیں تم دونوں نے؟“ اس نے آگے بڑھ کر حسن سے ریموٹ چھینا اور ٹی وی کا پلگ نکال دیا۔ وہ دونوں برے برے منہ بناتے باتھ روم میں چلے گئے۔

وہ عبیر کو بٹھا کر اسے پانی دینے لگی۔

”بس یہی نواب زادی اسکول سے پڑھ کر آتی ہے۔ پہاڑ ڈھا کر۔ ہم تو کھیلنے کودنے جاتے ہیں۔“

حسین اندر آکر ماں کو عبیر کی دل داری میں لگا دیکھ کر دال کا غصہ نکالنے لگا۔

”وہ چھوٹی ہے۔ ابھی ہفتہ بھر تو ہوا ہے اسے اسکول جاتے۔ تم لوگوں کو تو توفیق نہیں ہوتی کہ چھوٹی بہن کا خیال ہی رکھ لو۔“

”آنٹی! السلام وعلیکم۔ یہ ماما نے بل دیا ہے۔ پانی اور بجلی کا بل، آپ دیکھ لیں پھر شام کو پیسوں کے ساتھ بھجوا دیں۔“

منزہ کی بیٹی ثنا ہاتھ میں بل لیے کھڑی تھی۔ سائرہ کے ماتھے پر رفتہ رفتہ بڑھتی شکنوں اور کسی تلخ جواب سے بچنے کے لیے اس نے بل دروازے کے پاس پڑی میز پر رکھے اور خود تیزی سے دھوپ کا وہ ٹکڑا کراس کرتے سیڑھیوں کی طرف بھاگ لی۔

”غضب خدا کا، بجلی کا بل دیکھو نہ ہم کوئی اے سی چلاتے ہیں نہ ہمارے پلانٹ لگے ہیں چار ہزار کا بل یوں آیا ہے جیسے...... ایک ٹوٹا پھوٹا کولر وہ بھی نہیں چلتا اور ان کا کولر تو دن رات چلتا ہے۔ ایک منٹ کے لیے جو یہ لوگ بند کریں اب بھرنے کے لیے ہم ہیں۔ چار پنکھے ان کے چلتے ہیں اور دن میں بھی تین کمروں کی لائٹیں جلتی ہی رہتی ہیں اوپر کمبخت ہے کیا۔ دو کمروں کے چوبارے۔ تین پنکھے تین لائٹیں اور پانی کا بل دیکھو سارا ٹائم تو اوپر ٹونٹیوں میں سے ہوا آتی رہتی ہے سارا وقت باتھ روم اور کچن میں پانی کے ٹب دیکچے بھر بھر کر ہلکان ہوتی رہتی ہوں اور جو کبھی آدھی رات کو غلطی سے اٹھ کر باتھ روم چلے جاؤ تو بس پھر تیمم۔“

اس کی فراٹے سے چلتی زبان بچوں کا خیال کرکے ذرا رکی۔

”ماما! آج کھانا نہیں ملے گا؟“

حسین اس دوران دوبارہ کچن کا چکر لگا آیا تھا۔

"فرج میں کوئی اور سالن نہیں ہے۔" اس نے کتنی دیر فرج کھول کر تلاشی لی۔

"یہ تھوڑی سی بھنڈیاں ہیں۔ یہی گرم کر دیں۔"

وہ چھوٹی سی کٹوری میں ذرا سی بچی بھنڈیاں لیے اس کے سامنے لجاجت سے کہہ رہا تھا۔

وہ ایک بڑا سا ہوکا نما سانس بھر کر کھڑی ہوگئی۔ عمیر کے منہ میں نوالے دیتے ہوئے رمنا اور حسن کو بے دلی سے کھاتے دیکھ کر ٹوکنے لگی۔

"آپ کیوں نہیں کھا رہیں ماما؟"

حسن نے بھنڈیاں دو ہی نوالوں میں لپیٹ لی تھیں۔ سائرہ کو یونہی بیٹھے دیکھ کر کہنے لگا۔

"جی نہیں کر رہا۔" پھیکی سی دال دیکھ کر تو اس کا جی ہی متلانے لگتا تھا ہری مرچوں کے بغیر۔

"ماما! کچن میں اچار ہے۔" حسین کی ساری عادتیں اس جیسی تھیں پھیکے بے مزہ کھانے سے اسے بھی کھانا دشوار ہوتے تھے۔

"دیکھ لو جا کر۔"

وہ بے نیازی سے بولی۔ اچار تو پچھلے ہفتے سے ختم تھا۔

پہلے وہ اکثر گھر میں لسوڑے اور آم، ہری مرچوں کا اچار ڈال لیا کرتی تھی مگر دو تین سالوں سے جب سے اخراجات بڑھے تھے خصوصاً مہنگائی کا بھوت سر چڑھ کر بولنے لگا تھا۔ سرسوں کا تیل نا قابل حصول لگنے لگا تھا اس نے اچار ڈالنا چھوڑ دیا۔ مہینے بھر کے سودے کے ساتھ نیشنل اچار کا چھوٹا جار لے آتی تھی۔ پہلے صرف وہ خود کھانے والی تھی۔ اب تو حسین اور رمنا بھی لیتے تھے۔ عادل اور حسن کو اچار پسند نہیں تھا۔

"اف یہ تو خالی ہے۔"

حسین برے برے منہ بناتے ہوئے جار کے اندر روٹی کا نوالہ رگڑنے لگا پانی تو اس کے منہ میں بھی آیا مگر......

"آنٹی! یہ لے لیں۔"

ثنا پھر بے چاپ قدموں کے ساتھ دروازے پر موجود تھی۔

"کیا ہے؟" وہ بیزار سے لہجے میں بولی اور گردن موڑ کر دیکھنے لگی۔

رمنا اٹھ کر اس کے ہاتھ سے پلیٹ لے آئی۔

دو آلو کے کٹلس تھے اور ساتھ میں تھوڑی سی پودینے کی چٹنی۔ کٹلس تو اس کے دیکھتے ہی دیکھتے بچے کھا گئے۔ اس نے صبر شکر کر کے چٹنی کے ساتھ تین چار نوالے کھا لیے۔

"ماما! یہ دیکھیں۔"

کھانے کے بعد برتن کچن میں رکھ کر وہ کچن بند کر کے اندر آگئی۔ دھونے بیٹھ جاتی تو ان چاروں میں سے کسی نے بھی دو گھڑی کو ٹک کر آرام نہیں کرنا تھا۔ وہ چاروں کو لے کر نیچے فرش تکیے رکھ کر لیٹ گئی۔

اوپر بیڈ کا فوم تو آگ لگاتا تھا۔ یوں تو پنکھا بھی آگ ہی برسا رہا تھا مگر نیچے فرش کچھ بہتر تھا۔ وہ بھی صبح اس نے خوب پانی گرا گرا کر ٹھنڈا کیا تھا۔ پردے آگے کر دینے سے کچھ کمرہ ٹھنڈا ہو ہی جاتا تھا۔

"گرمیوں کی دوپہریں ایسے اوپر والے پورشن میں تو قیامت سے کم نہیں ہوتیں۔" وہ عمیر کو لٹا کر خود لیٹنے لگی تھی کہ حسن نے اپنے بیگ سے کوئی سلپ نکال کر اس کی طرف بڑھائی۔

"ماما! مجھے بھی ملی ہے، ابھی اٹھ کر دکھاؤں گی۔"

رمنا نے جمائی روکتے ہوئے آنکھیں بند کیں اور کروٹ لے لی۔

"مجھے یاد آگیا۔ مجھے بھی ملی ہے۔"

حسین چھلانگ مار کر اٹھا اور اپنے بیگ سے حسن جیسی سلپ نکال کر لے آیا۔

بے دلی سے کاغذ کے ان ٹکڑوں پر نظر پڑتے ہی اس کا سانس اوپر کا اوپر نیچے کا نیچے رہ گیا۔

کمرے کے ٹھنڈے ملگجے اندھیرے میں اس کی آنکھوں کے آگے تارے سے ناچ اٹھے۔

تینوں کی اسکول فیس میں یکمشت دو سو روپے فی کس اضافہ کر دیا گیا تھا۔

"اور ماما! وین والے انکل کہہ رہے تھے، پٹرول کی قیمتیں اتنی بڑھ گئی ہیں اس کیم سے وہ سارے بچوں سے سو روپیہ ایکسٹرا لیں گے۔"

حسن اسے ایک اور خوب صورت، اطلاع دے کر وہیں حسین کے پاس ٹانگیں پھیلا کر لیٹ گیا۔

اکٹھے آٹھ سو روپے فیس میں اضافہ اور چار سو روپے وین والے کے یعنی پوری بارہ سو روپے اور دو ہزار بجلی کا بل اور ساڑھے چھ سو پانی کا۔

''بیالیس سو اور ساڑھے چھ سو یعنی پورے پانچ ہزار...... نہیں پانچ ہزار ڈیڑھ سو۔''

''ماما! ادھر کھجلی کریں۔''

عمیر غنودگی میں کمر کو ہاتھ سے کھجاتے ہوئے بولی تو وہ بے خیالی میں اس کے سر میں خارش کرنے لگی۔

''ماما! یہاں۔'' وہ بے مزہ سی ہو کر اس کا ہاتھ کھینچنے لگی۔

''تقریباً چار ہزار روپیہ اضافی چاہیے اور ابھی تو کرایہ پچھلے مہینے کا نہیں دیا اور ...... اوہ میرے خدا!''

اس کا سر چکر کھانے لگا تھا۔

''ماما! میں نے کل سائنس کی کاپی کے لیے پچاس روپے لے کر جانے ہیں اور مجھے جلدی اٹھا دیجیے گا۔ مجھے آج تین ٹیسٹ ملے ہیں۔'' حسن ہلکی سی نیند سے جاگ کر اسے یاد دہانی کرواتے ہوئے بولا اور پھر سو گیا۔

وہ بس خالی خالی نظروں سے اسے دیکھ کر رہ گئی۔

☆

''اصل میں تو صرف یہ مسئلہ ہے میری جان کہ وہ تاج دین کا بچہ تمہیں ہری مرچیں نہیں دے کر گیا اور تمہارا موڈ سارے کا سارا غارت ہو گیا۔ یہ چڑچڑا پن اسی نارسائی کا شاخسانہ ہے۔''

عادل رات کو اس پھیکی دال کے ساتھ چاول کھاتے ہوئے الٹا اس کا مذاق اڑانے لگا۔ دال کے اوپر نمک اور پسی ہوئی کالی مرچیں ڈالنے کے باوجود اسے ذرا ذائقہ نہیں لگ رہا تھا۔

''آپ کھانا کھا لیں۔ مسئلہ صرف ہری مرچوں کی نارسائی کا نہیں۔'' وہ ٹھنڈے پانی کا گلاس اس کے سامنے رکھتے ہوئے قدرے سرد لہجے میں بولی۔

''آپ جب اوپر آ رہے تھے، جاوید بھائی ملے آپ سے۔'' اس نے کن اکھیوں سے عادل کی تیزی سے صاف ہوتی پلیٹ کی طرف دیکھا۔ ''معلوم نہیں دوپہر میں بھی انہوں نے کچھ کھایا تھا یا نہیں۔'' عادل بڑے بڑے چمچے منہ میں ڈال کر انہیں چبائے بغیر

نگل رہا تھا۔

''بھوک کتنی ظالم ہوتی ہے۔'' اس کا جی برا ہو گیا اور تھوڑا شکر ادا کرتے ہوئے اس پھیکی دال کے ساتھ چاول کھانے لگی۔ بچوں نے بڑا ناک منہ چڑھا کر دال چاول کھائے تھے اور اب باہر چھت پر کھیل رہے تھے۔

''ہاں۔ ملے تھے کہہ رہے تھے، کھانا کھا کر ذرا ان سے آ کر مل لوں۔'' اس نے بڑا سا نوالہ تیزی سے نگلا تو اس کا نوالہ منہ ہی میں رہ گیا۔ اسے آج کل منزہ اور جاوید بھائی کے تیور ٹھیک نہیں لگ رہے تھے۔

''وہی مسئلہ ہو گا کرائے کا...... حالانکہ میں نے پرسوں ہی انہیں اپنی مجبوری بتائی بھی تھی، بلکہ بتانے کی ضرورت بھی نہیں تھی، سارے ملک کو تو پتا ہے، اس وقت کیا صورتحال چل رہی ہے شکر ہے ہمارا اخبار مکمل طور پر بند نہیں ہو گیا۔ چل ہی رہا ہے۔ تنخواہیں پوری نہ سہی آدھی مل ہی رہی ہیں دال دلیہ چل رہا ہے۔ اخبار کو پابندیوں کی وجہ سے اشتہارات نہیں مل رہے کل بھی میٹنگ تھی بورڈ آف ایگزیکٹوز کی۔ انہیں خود ہمارے مسائل کا احساس ہے ان شاء اللہ امید تو ہے اگلے بقایا جات پورے نہ بھی مل سکے تنخواہ پوری مل جائے گی۔ ہمارا چینل بھی آج کل میں کھلنے والا ہے۔ بات چیت چل رہی ہے۔'' اس نے پلیٹ اس طرح چمکائی تھی جیسے وہ استعمال ہی نہ کی گئی ہو۔

''اس بات چیت چلنے اور بقایا جات ملنے میں ہم اس دنیا سے کوچ کر جائیں گے ہاں۔'' وہ جل کر بولی۔

''بھئی۔ مایوس نہیں ہوتے۔ امید پر دنیا قائم ہے، اس کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہیں۔''

وہ اپنے مخصوص ہلکے پھلکے انداز میں اسے تسلی دیتے ہوئے ہاتھ دھونے چل دیا۔

''یہ کیا ہے؟''

وہ تولیے سے ہاتھ رگڑتا دوبارہ کمرے میں آیا تو سائرہ نے فیس کے اضافی چارجز کی سلپ اس کے آگے کر دی۔

''اور وین والے نے بھی سو روپے فی بچے کے حساب سے بڑھا دیا ہے پٹرول کو جو آگ لگتی جا رہی ہے۔''

وہ بے دلی سے کہتے ہوئے دستر خوان سے برتن سمیٹنے لگی۔

''یہ تو بہت مشکل ہو جائے گا ان کی اتنی فیس دینا۔''

عادل نے سلپ ہاتھ میں دبا کر قدرے پریشانی سے کہا۔

''یہی تو میں کہہ رہی ہوں، مہینے کا راشن ختم ہو چکا ہے، آج دوپہر کو میں نے آٹے والا ڈبہ صاف کر کے گوندھا تھا کل دوپہر کو بچے تو کھالیں گے بمشکل رات کے لیے کچھ بھی نہیں نہ آٹا نہ چاول۔'' بات صرف ہری مرچوں کے نہ ملنے کے غم تک محدود نہ تھی۔

''اور یہ پانی اور بجلی کے بل...... کرایہ تو چاہے لیٹ بھی ہو جائے، بلوں کے پیسے دینا تو لازمی ہے۔ اگلے ہفتے کی لاسٹ ڈیٹ ہے۔''

عادل کی بولتی بالکل ہی بند ہو چکی تھی۔

''اور ان لوگوں کا بھی قصور نہیں۔ آج بھی جاوید بھائی صبح ہی واپس آ گئے تھے۔ عدالتوں کا بائیکاٹ تھا۔ آج جمعرات جو تھی اب سوا ڈیڑھ سال تو ہونے کو آیا، بے چاروں کی پریکٹس نہ ہونے کے برابر رہ گئی ہے۔ ساتھ والی سلمیٰ بھابھی بتا رہی تھیں۔ جاوید بھائی ان کے دیور کی دکان پر گئے تھے وہ جو پراپرٹی ڈیلر ہے کہ اوپر والا پورشن کرائے پر دینا ہے۔ اس نے کہا کہ وہ تو آپ کا پہلے ہی کرائے پر چڑھا ہوا ہے تو وہ کہنے لگے کہ ایک تو وہ لوگ کرایہ بہت تنگ کر کے دیتے ہیں۔ دوسرا کرایہ بڑھا بھی نہیں رہے۔ میں تو پہلے ہی منزہ بھابھی کے تیور بدلے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ اب اتنا سامان اور بچوں کے ساتھ کہاں جائیں گے۔ دو کمروں کا کرایہ پانچ ہزار سے کم نہیں پھر ڈیلر کو رقم دو اور پتا نہیں کیسے لوگ ملتے ہیں پھر شفٹنگ کی ٹینشن اور خرچا الگ۔'' اسے تو لگ رہا تھا، آج اس کا سر ہی پھٹ جائے گا۔

''افوہ یہ مصیبت بھی لازمی ہے۔'' چاروں اور گھپ اندھیرا ہو گیا تھا لائٹ چلی گئی تھی۔

''یہ آج دس کے بجائے نو بجے چلی گئی۔'' عادل اٹھ کر باہر بنی چھوٹی سی چھت کی طرف چلے گئے۔

''برے وقت کا کوئی شیڈول نہیں ہوتا، جب چاہے سر پر نازل ہو جاتا ہے۔'' وہ بڑبڑاتے ہوئے اندھیرے میں ٹاک ٹوئیاں مارتی باہر کی طرف آ گئی۔

''بھئی۔ کمرے میں کوئی روشنی تو کردو۔ موم بتی جلا دو۔'' عادل نے گھپ اندھیرے سے گھبرا کر کہا۔

''ماما! اندھیرا ہے، باتھ روم جانا ہے میں نے۔''

عبیر دروازے میں کھڑے ہو کر رونے لگی۔

''موم بتی کہاں سے آئے۔ کیا عمر خضر لکھوا کر آئی تھی۔ ایک ہی لے کر آئے تھے تا میں روپے والی، ختم ہو گئی گیس کا لیمپ جلتا نہیں۔ اب میں اسے کیسے باتھ روم لے کر جاؤں۔''

اسے رہ رہ کر شدید غصہ آئے جا رہا تھا، لمحہ بہ لمحہ زندگی تنگ ہوتی چلی جا رہی تھی۔

''عادل صاحب۔''

اسی وقت جاوید کی آواز نچلی سیڑھیوں سے آئی۔ سائرہ کا دل زور سے دھڑکا۔ مالک مکان جب بھی عادل کو یوں آواز دے کر بلایا کرتے تھے، اس کا دل یونہی الٹی سیدھی ترتیب سے دھڑکا کرتا تھا، اتنے سالوں میں بھی وہ اس پیشی کی عادی نہیں ہو سکی تھی۔

''کیا کہہ رہے تھے؟'' عادل آدھے گھنٹے بعد اوپر آیا تھا، دونوں اتر کر نیچے گلی میں چلے گئے تھے۔

''وہی جو مالک مکان کہا کرتے ہیں۔'' عادل نے لاپروائی سے کہا جو کچھ وہ بار بار سننے کا عادی ہو چکا تھا۔

سائرہ اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر عادل کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کرنے لگی۔

''ماما! مچھر کاٹ رہے ہیں، ہاتھ والا پنکھا لا کر جھل دیں۔'' حسین نے فریادی لہجے میں آواز لگائی۔

حسن آدھا منڈیر سے نیچے لٹکا ہوا لینے کی کوشش کر رہا تھا۔

''آجاؤ، باہر اتنی گرمی اور حبس تو نہیں۔''

عادل نے اندھیرے میں اس کا ہاتھ پکڑا اور باہر چھت کی طرف آ گیا وہ کسی معمول کی طرح گم صم اس کے ساتھ چلتی گئی تھی۔

''کیا کہہ رہے تھے؟'' بان کی ٹوٹی چارپائی میں دونوں بیٹھتے ہی دھنس سے گئے تھے۔ دوسری چارپائی جو ذرا بہتر حالت میں تھی۔ رمنا اور عبیر بیٹھی تھیں جبکہ تیسری چارپائی پر حسین لیٹا مچھروں کو فضا میں ہاتھ ہلا ہلا کر بھگانے کی کوشش کر رہا تھا۔ حسن اسی طرح منڈیر سے لٹکا تھا۔

''حسن! ادھر آ کر بیٹھو دیوار کے ساتھ ہی الیکٹرک پول ہے۔ ساری تاریں تو دیوار پر گر رہی ہیں۔ ادھر آؤ۔'' وہ حسن کو دیکھتے ہی چلائی۔

''ماما! لائٹ کب آئے گی؟'' حسین رو دینے والے انداز میں بولا تو وہ قریب پڑا اخبار اسے جھلنے لگی۔

''پاپا! ہمارے ملک میں اتنی لائٹ کیوں جاتی ہے اسکول میں بھی تین بار گئی اتنا پسینہ آیا اور اتنی گرمی کچھ بھی پڑھا نہیں جا رہا تھا۔ گھر میں آ کر دوپہر کو سوئے ابھی تھوڑی دیر بھی نہیں ہوئی کہ لائٹ چلی گئی۔ شام کو پڑھنے بیٹھے پھر غائب۔ آخر یہ لائٹ کیوں جاتی ہے پاپا۔''

حسن انہیں کی چارپائی پر بیٹھتے ہوئے رو دینے والے انداز میں کہنے لگا۔

''بیٹا! ہم لوگوں کی کوتاہیاں اور غفلت۔ کیا کہہ سکتے ہیں آبادی اتنی بڑھ گئی اور اس آبادی کی بجلی کی ضرورت بھی اور ڈیم ایک نہیں بنا۔ بجلی کی پیداوار کے لیے ایک بھی پراجیکٹ نہیں شروع کیا گیا تو پھر یہی ہونا تھا۔''

عادل اس کے گھنے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے نرمی سے سمجھانے لگا۔

''پاپا! ڈیم کیوں نہیں بناتے یہ لوگ۔'' وہ نیند سے بوجھل ہوتی آنکھیں موندتے ہوئے بولا۔ دوپہر کو بھی پوری نیند نہیں لے سکا تھا۔

''معلوم نہیں بیٹا! ہم کیسے بے دھیان سے لوگ ہیں جب ڈیم بنانے کے لیے متفق ہونے اور قوم کو ہم خیال بنانے کی ضرورت تھی ہم میراتھن ریس اور بسنت کو قومی تہوار بنانے کے لیے عوامی رائے ہموار کرنے میں اپنی توانائیاں لگا رہے تھے اور پھر بیٹا! ہماری حکومتیں جن عالیشان محلوں اور بنگلوں میں رہتی ہیں وہاں تو ایک لمحہ کے لیے بجلی کی ترسیل موقوف نہیں ہوتی جو انہیں بجلی کی پیداوار میں کمی کا احساس ہو اور اس کمی کو دور کرنے کے لیے کوئی منصوبہ، کوئی پراجیکٹ شروع کرتے۔ ہمارا ہمسایہ دوستی اور ثقافتی تعلقات کی آڑ میں ہمارے دریاؤں پر بند باندھتا نت نئے ڈیم بناتا رہا اور ہم دو قومی نظریہ درست تھا یا غلط اس نئی دوستی کے عہد و پیمان باندھتے اس بحث میں پڑ گئے تو پھر اندھیرے ہی ہمارے آنگنوں میں اترنے تھے نہ کہ......''

عادل دکھے دل کے ساتھ بچے کو سمجھاتے افسردگی سے بولا۔

''دفع بھی کریں آپ۔ کیا لاحاصل بحث بچے کے ساتھ لے کر بیٹھ گئے ہیں اسے اس بکواس کی کیا سمجھ آنی ہے، ہمارے بڑوں کو ابھی تک نہیں آ رہی تو یہ تو بچے ہیں۔ کیا سمجھیں گے جو ان کے سامنے اپنا پورا اخبار کھول کر بیٹھ گئے۔''

سائرہ جو دن بھر اخراجات اور الجھی ہوئی سوچوں کے ساتھ خود ہی لڑتی جھگڑتی رہی تھی۔ ایک دم سے بھڑک کر بولی۔ یوں بھی اس گرمی لوڈ شیڈنگ اور مالک مکان کے بے لحاظ انداز اسے آج کل اور بھی خود ترسی میں مبتلا کر رہے تھے اور سب سے بڑھ کر خالی ہوتے کچن کی حالت ......

''یہ تو سو بھی گیا ہے۔''

عادل حسن کو نیچے سرکر کے دیکھتے ہوئے بولا۔

''اتنی شاندار لوری، جو اسے سنا رہے تھے اس نے سونا تھا۔'' وہ تیز تیز اخبار جھلتے چڑ کر بولی۔

''یہ ایک گھنٹہ بھی صدیوں پر محیط ہو جاتا ہے، پتا نہیں کیا ٹائم ہو گیا۔''

وہ بری طرح سے جھلا رہی تھی۔ ''ابھی بچوں کے یونیفارم بھی استری کرنے ہیں۔ صبح تو پھر اٹھو لائٹ صاحبہ غائب ہوتی ہے۔''

''بس پندرہ منٹ ہیں۔'' عادل نے ہاتھ میں پکڑے موبائل کو آن کرتے ہوئے ٹائم دیکھ کر کہا۔

''یہ تو چاروں سو گئے، ان کو دودھ نہیں دینا تھا۔'' عادل نے مڑ کر حسین رمنا اور عمیر کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''دودھ کہاں سے آتا دو دن سے دودھ والا دودھ دے کر ہی نہیں جا رہا۔ اس کا دو ماہ کا بل ہے۔ روز چیخ چیخ کرتا ہے دروازے پر آ کر۔ روز دوسرے دودھ والے سے آدھا کلو لیتی رہی ہوں پر آپ کو کیا ٹینشن۔ سارے عذاب تو میری جان کو ہیں۔'' وہ منہ میں بڑبڑائی تو عادل اسے گہرا سانس لے کر دیکھنے لگا۔

پھر دونوں کے درمیان خامشی چھا گئی، صرف ہوا کے لیے جھلتے اخبار کی پھڑ پھڑاہٹ تھی یا حبس تھا۔

لائٹ آئی تو دونوں کتنی دیر تک روشنی سے چندھیاتی آنکھوں کو کھول نہیں سکے۔

''یہ تو ادھر ہی سو گیا۔ چلو آج میرے ساتھ ہی لیٹ جائے گا۔'' وہ حسن کو جھلنگا سی چارپائی پہ لٹاتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

''اس ٹوٹی چارپائی پر آپ دونوں کیسے سو سکتے ہیں۔ لٹائیں اسے حسین کے ساتھ۔ رات بھر نہیں سو سکیں گے آپ اور اندر کمروں کی طرف تو منہ نہیں کیا جا رہا۔ دوزخ

کی پلٹیں آرہی ہیں۔ میں ان کے یونیفارم استری کرلوں جلدی سے پھر آکر لیٹتی ہوں اور بات سنیں۔"

وہ کہتے کہتے اندر چلی گئی تو مجبوراً عادل کو بھی اندر کا رخ کرنا پڑا۔

"حد ہوگئی۔ آپ بتا نہیں رہے۔ کیا کہہ رہے تھے جاوید بھائی۔" پہلے کمرے میں ہی پڑے استری اسٹینڈ پر استری کا پلگ لگاتے ہوئے وہ اپنے دل کی الجھن رفع کرنے کو پوچھنے لگی۔

"انہوں نے اور کیا کہنا تھا بھلا۔"

عادل گرم جلتے بلتے کمرے میں آتے ہی تپ گیا۔

"اوپر کا پورشن آپ کو الاٹ کردیا ہے بے غم ہو جائیں یہ کہنا تھا انہوں نے بھئی وہی کرایہ اور کرائے میں اضافہ اخراجات مہنگائی بے چارگی پریشانی ٹینشنز اور کیا اب سونے کی اجازت ہے اس مزدور کو۔" وہ چڑ کر کہتے ہوئے بولا تو وہ اسے دیکھ کر رہ گئی۔ اگلے لمحے وہ دھپ دھپ کرتا باہر نکل گیا۔

"میں چادر تو بچھا دوں چارپائی پر۔" اسے پھر ٹوٹے بان کی چبھن یاد آئی تو چادر لے کر پیچھے لپکی۔

"رہنے دو، ایسے ہی ٹھیک ہے۔" وہ حسن کو حسین کے ساتھ لٹا کر خود بھی اس جھولے میں کودنے والے انداز میں لیٹ گیا۔

"کولر کی موٹر کا پتا نہیں کیا۔"

وہ آہستہ آواز میں بولی گھر۔ گھرر کرتا پیڈسٹل فین گرم ہوا کے تھپڑے پھینک رہا تھا اور فضا میں تو جیسے ہر چیز ساکن تھی۔ کہیں کوئی پتا بھی نہیں مل رہا تھا۔ سانس لیتے ہوئے گھٹا جا رہا تھا۔ اس نے بے چارگی سے بے سدھ سوئے بچوں کی طرف دیکھا۔

"موٹر کا پتا کیا کرنا ہے۔ وائنڈنگ کا وہ چار سو روپیہ مانگ رہا ہے، اب چھ سال پرانے کولر میں بچا کیا ہے۔ پیسے ملتے ہیں کہیں سے تو کل پرسوں ٹھیک کروا لاؤں گا۔"

جان چھڑانے والے انداز میں عادل نے کہا اور آنکھوں پر بازو رکھ لیا۔ وہ بے دلی سے اندر آکر کپڑے پریس کرنے لگی۔

پورے جسم پر پسینہ یوں رینگ رہا تھا جیسے وہ نہا کر آئی ہو، چپکے ہوئے بال گیلے گیلے سے اور الجھن کا باعث بن رہے تھے۔

"اف نہا ہی لوں پھر ٹھیک سے نیند آئے گی۔" استری بند کرکے وہ باتھ روم میں تولیہ لیے گھس گئی۔

آدھا ٹب بھرا ہوا تھا۔ اس نے ٹونٹی کھولی، لنگڑاتی ہوئی پانی کی اک دھار نکلی اور اس سے غرغر کی آواز اور قطرے ٹپکنے لگے۔

"اف میرے خدا! پانی بھی نہیں ہے اور بل...... جو لوگ آج کل خودکشیاں کر رہے ہیں، دوسروں کو قتل کررہے ہیں بالکل درست کررہے ہیں۔"

وہ اپنا خون جلاتی رہی کھڑی بلب کی ٹمٹماتی روشنی میں ٹونٹی سے گرتے قطروں کو دیکھتی رہی۔

"اب اس پانی سے نہالوں اور اگر صبح تک پانی نہ آیا تو بچے کیسے اسکول جائیں گے اور رات کو باتھ روم کسی کو جانا پڑ گیا رہنے دو اور سائرہ بی بی سو جاؤ ایسے ہی۔" وہ ٹھنڈا سانس بھرتی تولیہ لیے پژمردگی سے باہر نکل آئی۔

باہر اس طرح سلیٹی سا اندھیرا تھا اور حبس زدہ وحشت ناک فضا کہ کہیں کوئی جگر جگر کرتا تارہ بھی نہیں تھا۔ بجھتے دیے سے دو چار اداس ستارے کہیں کہیں ٹمٹما رہے تھے۔

"ان کا بھی لگتا ہے پٹرول ختم ہوگیا ہے۔"

وہ اپنی سوچ پر کوفت بھری مسکراہٹ کے ساتھ رمنا اور عبیر کی چارپائی کی طرف بڑھی اور اپنے لیے جگہ کھوجنے لگی۔

"اسے میرے ساتھ لٹا دو عبیر کو۔" عادل پتا نہیں کیسے گہری نیند سے جاگا تھا، بھاری نیند سے بوجھل آواز میں بولا۔

اس نے بس سوچنے کو ایک لمحہ لگایا اور عبیر کو اٹھا کر عادل کے پہلو میں لٹا دیا۔ کم از کم رات وہ بھی جب تک لائٹ آرہی تھی اسے نیند تو لینا چاہیے، یہی سوچ کر وہ رمنا کے دوسری طرف لیٹ گئی نیند اور تھکن کی وجہ سے اسے فوراً سو جانا چاہیے تھا مگر گرمی اور حبس نے شاید گھنٹہ بھر اسے جگائے رکھا۔

گھرر گھرر کرتا پنکھا لائٹ جانے سے بند ہوا تو اس کی آنکھ کھلی۔ ہلکی ہلکی ہوا چلنے لگی تھی جس کی وجہ سے شاید بچے بھی پنکھا بند ہونے کے باوجود سوئے رہے تھے۔ اس نے بھی آنکھیں بند کرلیں۔

☆

اگلا دن پچھلے سے بھی زیادہ پریشان کن اور حبس زدہ چمکیلی دھوپ والا تھا۔

عادل صاحب صبح سویرے بغیر ناشتہ کیے ایک کلو دودھ کا لفافہ فریج میں رکھ کر جانے کہاں چلے گئے تھے۔ اسے اچھی خاصی پریشانی لاحق ہوگئی۔ نماز کے وقت اس کی آنکھ کھلی، سوچا اٹھ کر نماز پڑھ لے مگر اس وقت تو کچھ پُرسکون نیند آرہی تھی۔ کچھ ٹھنڈی فضا کا اثر تھا۔

اس نے عادل کو اٹھ کر جاتے دیکھا تھا، یہی سمجھی نماز پڑھنے جارہے ہیں۔

''میں جارہا ہوں۔'' کی آواز پر وہ ہڑبڑا کر اٹھی تھی۔ عادل تیار ہوکر باہر نکل رہا تھا۔

''ناشتہ تو کر جائیں۔ کہاں جارہے ہیں اتنی صبح۔'' وہ فکرمند سی بستر چھوڑتی عادل کے پیچھے لپکی۔

''کرلوں گا ناشتہ۔ دودھ فریج میں پڑا ہے بچوں کو ضرور دے دینا، خدا حافظ۔''

وہ رکے بغیر کہہ کر سیڑھیاں اتر گیا تو وہ اپنی نیند کو کوستی باتھ روم چل دی اور صد شکر ٹونٹیوں میں وافر پانی آرہا تھا۔

بچوں کو اسی دودھ کے ساتھ ایک ایک سلائس دے کر اسکول روانہ کیا اور اپنے لیے چائے اور آخری بچا ہوا سلائس سینک کر اندر کمرے میں آگئی۔

''حد ہوگئی خود نکل گئے ہیں، بتایا بھی تھا رات کو نہ آٹا ہے نہ کوئی سبزی نہ کچھ اور، کیا پکاؤں گی میں۔'' یاد آتے ہی جلتے کڑھتے چائے کا پہلا گھونٹ بھرا اور ریموٹ سے ٹی وی آن کردیا۔

''انارکلی بریانی کے لیے آپ کو جن اشیا کی ضرورت ہے، پہلے وہ لکھ لیں چاول باسمتی اعلیٰ درجے کا ایک کلو، مٹن گوشت کھُل بوٹی ڈالیں تو زیادہ اچھی بات ہے ورنہ چکن بھی چلے گا اور......''

ماہر شیف اشیائے خوردنی کا ڈھیر شیلف پر سجائے انارکلی بریانی کی ترکیب لکھوا رہا تھا۔

''جتنی غربت مہنگائی میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے، اتنے زیادہ اس طرح کے پروگرام آنے لگے ہیں۔ ہمارے اندر کی بھوک کو جگانے کے لیے، ہماری نفسیات کو الجھانے کے لیے۔ لوگ سادہ روٹی سالن کو ترس رہے ہیں اور یہ نت نئی ڈشز یوں سکھا رہے ہیں جیسے لوگوں کے گھروں میں اجناس کے ذخیرے لگے ہیں۔ ہاں ہوں گے بھی تو ذخیرہ

اندوزوں کے گھر......''

اسے ایک دم یاد آگیا۔ عادل بغیر ناشتہ کیے چلے گئے پتا نہیں کیا کھایا ہوگا حالانکہ پتا بھی ہے بازاری کھانے سے فوراً ان کا پیٹ خراب ہو جاتا ہے پھر بھی، وہ چائے پیتے ہوئے کڑھنے لگی۔ ٹی وی آف کر دیا۔

''آج تو ہے بھی جمعہ۔ بچوں نے بھی جلدی گھر آجانا ہے تو کیا پکاؤں۔'' کپ رکھتے ہی اس کی نظریں گھڑی پر پڑیں۔

''پہلے صفائی تو ہو جائے۔'' صبح کو اکیلی ہونے کی وجہ سے اسے خود سے باتیں کرنے اور ہدایتیں دینے کی عادت سی پڑ گئی تھی۔

صفائی میں پورا گھنٹہ لگ گیا۔ گھر تو چمک گیا مگر وہ خود جیسے پانی سے نہا گئی دھوپ اسی طرح چمک رہی تھی اور حبس میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

''یا اللہ کیسی گرمی ہے۔ کچھ کچن کا ہو جائے تو نہالوں۔'' خود کو پھونکیں مارتی وہ فرج کھول کر کھڑی ہوگئی۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے تھے اور تین چار پانی کی بوتلیں۔

سبزی کی دراز میں دو آلو، ایک ٹماٹر اور ایک بینگن پڑا تھا اس نے وہی باہر نکال لیے۔

جانتی تھی کل ڈبہ جھاڑ کر آٹا گوندھا ہے پھر ڈھکن کھول کر جھانکنے لگی۔

''کیا کروں اب۔'' اس نے بے بسی سے اس ایک پیاز، ٹماٹر ایک بینگن اور آلوؤں کو دیکھا۔ آٹے کا مسئلہ جوں کا توں تھا۔

کارنس پر ہاتھ مار کر کل والا پانچ روپے کا سکہ اٹھایا اور کمرے میں آگئی الماری میں عمیر کا باربی ڈول والا کلک پڑا تھا۔ کل ایک ایک روپے کے تیرہ سکے تھے۔

ان تیرہ سکوں کو نکالتے ہوئے وہ عجیب سے شرم ناک احساس جرم میں گھر گئی۔

''یہ احساس جرم اچھا ہے بجائے اس فاسد خیال کے ...... وہ کتنی دیر یونہی ان نسواری سکوں کو ہاتھ میں لیے بیٹھی رہی کہ وہ خیال اس کے دماغ میں کوندا۔

''اپنے دو بچوں کے ساتھ سیون اپ اسٹاپ کے پاس کھڑی وہ بشریٰ جس نے چلتی ٹرین کے آگے ان دو معصوموں کو کلیجے سے لگا کر ان کی اور اپنی جان لے لی اس بھوک، مفلسی کے ہاتھوں ......''

کتنے دن، کتنی راتیں وہ اس خبر کو پڑھ کر سو نہیں سکی تھی۔

اور پھر کتنے دن سوچتی رہی بشریٰ تیری قربانی کا کیا بنا؟ اس بے رحم معاشرے

میں تیری اس قربانی سے کسی ایک بشریٰ کی بھی تو تقدیر نہیں سنور سکی اخبار روزانہ...... روزانہ کی بنیاد پر خودکشیوں کی خبروں سے بھرے ہوتے تھے۔

''عادل! لوگ ایسے کیوں کر رہے ہیں۔'' اسے اخبار سے چڑ تھی۔ بڑی دہشت ناک زندگی سے مایوس کر دینے والی خبروں سے چڑ تھی، اس لیے وہ عادل کے اخبار گھر لے آنے پر لڑ پڑا کرتی تھی۔

''لوگ کل کی امید سے مایوس ہو گئے ہیں، شاید اس لیے۔'' عادل نے اس کے زرد ہراساں چہرے کو دیکھ کر ہولے سے کہا تھا۔

''سائرہ! ایک وعدہ کرو۔'' وہ بھی ان دِنوں (اور یہ کون سا بہت دِنوں پہلے کی بات ہے ابھی مہینہ ڈیڑھ پہلے کی) بہت پریشان، بہت ہراساں رہا کرتا تھا۔

''تم بشریٰ کی طرح اپنے کل سے، اپنے رب سے مایوس نہیں ہو گی۔ وعدہ کرو۔''

اس نے وعدہ نہیں کیا تھا مگر رو پڑی تھی اور اسے یاد ہے ان راتوں میں جب جب وہ زور سے کروٹ لیتی یا یونہی گرمی سے گھبرا کر اٹھ جاتی تو عادل سوتے سے چونک چونک جاتا تھا۔

کیا اسے خوف ہے کہ میں اپنی یا اپنے بچوں کی اس غربت تنگ دستی کے ہاتھوں جان لے لوں گی۔ وہ اس کے یوں چونکنے پر سوچنے لگی تھی اور پھر دل میں خود کو اپنے اس عہد سے باندھنے لگتی کہ وہ اپنے کل سے، اپنے رب سے کبھی مایوس نہیں ہو گی۔

آج کل ...... آج کل پھر اس کے ہاتھوں سے اپنے ہی اس عہد کی ڈوریاں چھوٹنے لگی تھیں۔

''افوہ اتنا ٹائم ہو گیا۔ میں کیا سوچنے لگی۔'' وہ ٹائم دیکھتے ہی گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

حسن کو بھی پیسے جمع کرنے کا شوق تھا۔ اس خیال سے اس نے کمرے کی الماریاں چھان ماریں مگر کچھ نہ ملا۔ ہاں ٹی وی ٹرالی کی دروازے سے دو دو روپے کے دو سکے مل گئے۔

''یہ ایک کلو آٹا اور پانچ کے روپے کے بینگن چاہے ایک ملے، لے آنا۔''

اس نے محلے کے بچے کو اپنی وہ اکٹھی کی ہوئی جمع پونجی تھمائی۔ شاپر میں تھوڑا سا آٹا اور اس آٹے پر پڑا وہ سکڑا سمٹا کا سی بینگن ...... وہ ششدر سی رہ گئی۔

''آنٹی! انکل کہہ رہے تھے آٹا پچیس روپے کلو ہے، اٹھارہ روپے کا نہیں دیتے۔

زبردستی لے کر آیا ہوں اور سبزی والے انکل بھی بینگن نہیں دے رہے تھے۔''

بچے نے اپنی بہادری اور زور آوری کا قصہ سناتے ہوئے داد طلب نظروں سے اسے دیکھا جو اپنی جگہ پانی پانی سی ہو گئی تھی، وہ ہلکا سا آٹے کا شاپر پکڑتے ہوئے۔

وہ نہا کر نماز پڑھ رہی تھی جب عادل کے سیڑھیاں چڑھنے کی آواز اسے سنائی دی۔

بچے ہاف ڈے ہونے کی وجہ سے پہلے ہی آ چکے تھے۔

''یہ کیا ہے پاپا؟'' وہ کمرے میں داخل ہوا تو بچوں کی آواز پر سائرہ نے سلام پھیرا۔

''یہ میرے بچے! تمہاری ماما کے موڈ کا علاج ہے بلکہ چڑ چڑے پن کا۔'' اس نے جوتے اتارتے ہوئے زمین پر رکھا کچھ اٹھایا۔

سائرہ نے اٹھ کر جائے نماز تہہ کی۔

''کیا مطلب؟''

بچوں کے چہروں پر حیرانی اور شوق سا تھا۔

''آؤ۔ انہیں چھت پر لے کر چلتے ہیں۔ چلو بیوی تم بھی۔'' وہ حیران سے آگے بڑھی۔

''دیکھو، اس گملے میں اگیں کی ہری مرچیں۔ اس میں لیموں اور تیسرے والے میں دھنیا۔ کیسا۔''

عادل کی باتوں پر اس کا دل چاہا، تینوں گملے اٹھا کر اپنے سر پر دے مارے۔

''یہ کیا مذاق ہے جب آپ کو پتا تھا، گھر میں کچھ پکانے کے لیے نہیں ہے پھر بھی صبح بغیر کچھ بتائے نکل گئے۔'' وہ ایک دم غصے میں آ گئی۔

''افوہ بھئی۔ دودھ تو دے کر گیا تھا۔'' وہ تینوں گملے بچوں کے ساتھ لے کر باہر چھت کی طرف بڑھ گیا۔

''یہ کیا بے کار چیزیں اٹھا لائے ہیں۔ ان ہی پیسوں کا آٹا یا سبزی لے آتے۔''

وہ فریج سے گوندھا ہوا آٹا روٹیاں پکانے کے لیے نکالنے لگی۔

''یہ بے کار نہیں ہے دیکھنا چند دِنوں میں ان میں کیسے سبزی اگتی ہے۔ نرسری والے سے یہ کھاد لے کر آیا ہوں اسپیشل قسم کی، صرف ڈیڑھ ماہ میں مکمل طور پر اگ آئیں گے اور......''

''مگر ان کا فائدہ کیا ہے، چند دنوں میں سوکھ سڑ جائیں گے۔'' وہ بڑبڑاتی ہوئی

کچن کی طرف بڑھ گئی۔

''اس وقت جبکہ مہنگائی عروج پر ہے۔ ہمیں اسی طرح کی بچتوں اور شارٹ کٹس کی ضرورت ہے، پتا ہے جب ہیروشیما پر امریکہ نے بمباری کی تو اس کے بعد سے ابھی تک جاپان کی بہت سی زمینیں قابل کاشت نہیں ہو سکیں۔ اس کے باوجود جاپانی لوگ اپنے گھروں میں اس طرح کے آرائشی گملے جا بجا رکھتے، دیواروں کھڑکیوں دروازوں سے لٹکاتے اپنی پھولوں، سبزیوں اور پھلوں کی چھوٹی موٹی ضرورتیں پوری کرتے ہیں۔ ہماری طرح واویلا نہیں کرتے۔''

وہ کچن میں آ کر توا چولہے پر چڑھاتے ہوئے روٹیاں بیلنے لگی۔ معلوم تھا اب عادل صاحب لمبا لیکچر دیں گے۔

''ایک گملا نوٹ اگانے کے لیے بھی لے آتے۔ اگلے ماہ کا کرایہ اس میں اگ آتا اسپیشل کھاد سے اور اس سے اگلے ماہ ان کی فیسیں۔'' وہ کچن کے دروازے پر آ کر غصے میں بولی اور پھر پلٹ گئی۔ عادل اور بچے ہنسنے لگے۔

''میں نماز پڑھ آؤں پھر کھانا کھاتا ہوں۔'' وہ روٹیاں پکا رہی تھی جب عادل کہہ کر نیچے اتر گیا۔

وہ بچوں کو کھانا کھلا چکی تھی جب وہ جمعہ کی نماز پڑھ کر واپس آیا۔

''اف! آج تو بہت تھکاوٹ ہو گئی۔ رات کو دو بار لائٹ گئی۔ نیند بھی پوری نہیں ہوئی۔'' کھانا کھاتے ہی عادل نے کہا، اور بیڈ کے ساتھ ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گیا۔

''اب شام کو کیا کروں گی میں۔'' اس سے پہلے کہ وہ خراٹے شروع کرتا سائرہ جلدی سے بولی۔

''ہوں۔ ہاں وہ میں۔'' وہ سیدھا ہو گیا۔ ''جاوید بھائی کو کرایہ دے آیا ہوں اور وہ بجلی کا بل بھی۔ پانی کا میں نے کہہ دیا۔ ابھی تھوڑے دنوں بعد دے دوں گا وہ بے چارے خود بڑے پریشان تھے اور جلسے جلوس اور ریلیاں نکل رہی ہیں۔ وکیلوں اور جرنلسٹس کا اس ملک میں ٹف ٹائم چل رہا ہے ویسے ہمارا چینل تو اسٹارٹ ہو گیا ہے اور اخبار سے پابندیاں بھی کافی حد تک اٹھ گئی ہیں۔ امید ہے چند دنوں تک حالات بہتر ہو جائیں گے۔''

وہ جمائی لیتے ہوئے پھر سے سونے کی تیاری کرنے لگا۔

''کرائے اور بل کے پیسے کہاں سے آئے؟'' وہ بے صبری سے بولی۔

''اکاؤنٹس سیکشن سے لیے تھے چھ ہزار، ہزار روپیہ پڑا ہے ابھی اٹھتا ہوں تو آتا، سبزی اور دوسری چیزیں لے آؤں گا۔''

اس نے کہہ کر تکیہ سر کے نیچے رکھا اور آنکھیں موند لیں۔

وہ بچوں کے بیگ اٹھا کر ان کی کاپیاں، کتابیں چیک کرنے لگی۔

رمنا کے ٹیسٹ میں مارکس آج بھی کم تھے۔ پتا نہیں اس نالائق کو سائنس کی سمجھ کیوں نہیں آتی۔ اس نے جھلا کر اس کی ڈائری نکالی۔

''چھٹیاں دس جون کو ہوں گی، ہوم ورک تین ماہ کی فیس جمع کروانے کے بعد دیا جائے گا۔ فیس یکم سے لے کر بیس تاریخ تک جمع کروائی جا سکتی ہے۔'' نوٹ پڑھتے ہی اسے آگ سی لگ گئی۔

''ایک تو پہلے ہی کھانے پینے کے لالے پڑے ہیں دوسرے یہ گلے کاٹنے کو تیار ہیں۔ بے حس معاشرے کے بے حس لوگ تعلیم دے رہے ہیں کہ بیچ رہے ہیں، کہ یہ بچوں کو انسان بنائیں گے، جو خود ابھی انسانیت کے پہلے درجے سے نابلد ہیں اور روا داری خلوص نیت، احساس ذمہ داری کچھ بھی تو نہیں ان کے پاس۔ یہ بچوں کو کیا دیں گے۔''

وہ جلتی بھنتی بچوں کے بیگ یونہی کھلے چھوڑ کر کچن کی طرف آ گئی۔ نیچے سے دونوں میاں بیوی کے اونچا اونچا بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

''ایک آپ ہی تو رہ گئے ہیں حق کے علم بردار چمپئن، لوگوں کو انصاف نہیں ملتا نہ ملے۔ بھاڑ میں جائے یہ عدل و انصاف کا ڈنکا۔ ہمارے بچوں کو روٹی تو ملے۔ کیا کروں ان کے پیٹوں پر پتھر باندھ کر انصاف کا جھنڈا اٹھا کر نعرے بازی کروں۔ ارے جو خود اپنے آپ کو۔ اپنے گھر کو، اپنے بچوں کو اس معاشرے کی بے انصافی سے نجات نہ دلا سکے۔ وہ دوسروں کو کیا انصاف دلائیں گے روز جاتے ہیں۔ خالی خولی نعرے بازی کر کے آ جاتے ہیں یا دو چار ڈنڈے کھا کر۔

جمہوریت آئے گی، سب سارے ولدر دور ہو جائیں گے۔ سارے زخم بھر جائیں گے۔ دیکھ لیے اس دوغلی جمہوریت کے ثمرات۔ پھر سے ''بڑوں'' کی جھولیاں بھرنے لگیں، اور آپ لوگ دھوپ میں لڑنے، ڈنڈے گولی کھانے کے لیے انصاف انصاف پکارتے ہیں۔ تنگ آ گئی ہوں میں اس تماشے سے۔ بس جا رہی ہوں آج ہی اوکاڑے اور جب تک اس منحوس وکالت کو لات مار کر کچھ اور روزی روٹی کا بندوبست نہیں کرتے، نہیں آؤں گی۔'' منزہ

بھابی شیرنی کی طرح گرج رہی تھیں۔

آخر کوئی کب تک برداشت کرے بے چاری سوا سال سے یہ عذاب جھیل رہی ہے۔ آج تو پھٹنا ہی تھا۔

وہ بے دلی سے چائے کا کپ بنا کر باہر نکلی تو دھوپ کے آگے جیسے کسی نے مٹیالی سی چادر بچھا دی۔ آندھی کا سا غبار شمال سے اٹھ رہا تھا۔ نیچے اب مکمل خاموشی تھی۔

وہ چائے لے کر پچھلے کمرے کی طرف آ گئی۔ باہر ہوا سی چلنے لگی تھی۔ اس نے چھت کی طرف کا دروازہ کھول دیا۔

سامنے بیرونی دیوار کے ساتھ دیوار کے سائے میں تین گملے اور ان میں نازک سے پودے پل رہے تھے۔ اسے چائے پیتے ہوئے ہنسی سی آ گئی۔

''کیا انقلابی سوچ کا بندہ ہے۔ ہر بات کو مثبت انداز میں لینا۔ آج کل کے سخت پریشانیوں کے دور میں ایسے مثبت سوچ والے لوگ ہی ٹھیک ہے۔ کم سے کم میری طرح ہر وقت جلتے کڑھتے تو نہیں۔''

ابھی اس کا چائے کا کپ ختم بھی نہیں ہوا تھا کہ آندھی کا غبار آسمان کے چاروں کناروں تک پھیل کر دھوم مچانے لگا۔

دروازے، کھڑکیاں زور زور سے بجنے لگے جس کے شور سے بچے بھی اٹھ گئے۔

اسی وقت لائٹ بھی چلی گئی مگر اب اس کی پروا کسے تھی۔ تھوڑی دیر میں آندھی کے غبار سے بادلوں کے جھنڈ سے نکلے تھے۔

''اوہو بھئی۔ مجھے سامان لکھ دو، میں لے آؤں پھر موسم جانے کیسا ہو جائے۔''

عادل کے جلدی مچانے پر اس نے آٹا چاول اور دو چار ضروری سبزیاں کاغذ پر گھسیٹ دیں۔

''پاپا! ہم نے چپس اور پکوڑے کھانے ہیں، اس کا سامان بھی لے کر آئیں۔'' حسین تو عادل کے ساتھ ہی چلا گیا۔ حسن پیچھے سے پکارا تھا۔

جب عادل سامان لے کر آیا تو بارش کے موٹے موٹے چھینٹے پڑنے لگے تھے۔

اس نے پکوڑوں اور چپس کی پلیٹ بھر کر نیچے بھجوا دی۔ معلوم نہیں نیچے کی فضا کیسی تھی بظاہر تو مکمل خاموشی تھی۔

''تین مہینوں کی فیسیں اکٹھی جمع کروانے کا نوٹس بھیج دیا ہے اسکول والوں نے۔''

چائے کے دوران ہی اس نے وہ اطلاع دی جو دوپہر بھر اس کا خون جلاتی رہی تھی۔ بچے برستی بارش میں چھت پر نہا رہے تھے نیچے سے، ثنا ولید اور عائشہ بھی آ گئے تھے۔ لائٹ ابھی تک نہیں آئی تھی مگر اس کی کمی کسی کو بھی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

''ہوں۔'' عادل نے حسب عادت صرف ہوں کی تھیں۔

''تو کہاں سے کریں گے؟''

وہ حسب عادت بے چینی سے بولی معلوم نہیں یہ اتنے پُرسکون کیسے رہ لیتے ہیں۔

''ابھی تو یہ بارش رک جائے تو مجھے آفس پہنچنا ہے۔ پہلے ہی دوپہر ہو گئی ہے۔''

چائے کا خالی کپ رکھتے ہی عادل فکرمندی سے کہتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا تو وہ جھلا سی گئی۔

''اور جو میں نے پوچھا ہے۔'' وہ جھلاہٹ چھپا نہ سکی۔

''ہر بات کو لے کر نہ بیٹھ جایا کرو۔ اب اگر کسی مسئلے کو پکڑ کر اس کا ماتم کرنا شروع کر دو تو وہ جان نہیں چھوڑتا اور جان کو چمٹتا ہے۔ کچھ چیزیں اللہ پر اور وقت پر بھی چھوڑ دیا کرو۔ سارے جہان کی فکریں اپنے دماغ پر لاد کر کڑھتے رہو۔ اتنا اچھا موسم ہے، چائے پی ہے، پکوڑے کھائے ہیں، اللہ کا شکر ادا کرو ہر وقت منہ بسورنے سے کچھ نہیں ہوتا۔''

وہ جوتے پہنتے ہوئے، اسے تھوڑا ڈانٹتے تھوڑا سمجھاتے ہوئے بال بنانے لگا اور خدا حافظ کہہ کر مدھم پڑتی بارش میں سیڑھیاں اتر گیا۔

وہ بھی اٹھ کر چھت پر آ گئی۔ کمزور سے پودے سہانے موسم اور برستی بارش سے خوش ہو کر خوب جھوم رہے تھے۔ اسے پہلی بار ان پر پیار سا آیا۔ اپنائیت سی محسوس ہوئی جیسے بچوں کے بے فکر کھیلتے چہروں اور بے وجہ ہنسی اسے تازہ دم سی کر گئی تھی۔

''ٹھیک کہا عادل نے ...... یوں مسئلے کو پکڑ کر اس کی جان کھانے سے کچھ بھی نہیں ہونے والا الٹا یہ خوب صورت، سہانے لمحات گم ہو جائیں گے۔'' وہ ہاتھ پھیلا کر بارش کے قطروں کو محسوس کرنے لگی۔ اسی وقت سنزہ اوپر آ گئی۔

''میں نے کہا۔ ہم بھی تھوڑا موسم کا مزہ لے لیں، فارغ ہونا؟'' کرائے کی ادائیگی کے بعد مالک مکان عموماً اسی طرح کی خوش اخلاقی کا مظاہرہ کیا کرتے تھے۔ اسے سات آٹھ سال کا تجربہ تھا۔ وہ بھی مسکرانے لگی۔

آ جائیں، فارغ ہی ہوں۔" اس نے پچھلے کمرے سے کرسی گھسیٹ کر چھت کے قریب کردی۔

"چائے بنا کر لاؤں۔"

"نہیں۔ ابھی پی کر آ رہی ہوں تمہارے پکوڑوں کے ساتھ۔ کیا عادل بھائی کے اخبار کا مسئلہ حل ہوگیا؟" وہ تجسس میں آئی تھیں، وہ سر ہلا کر رہ گئی۔

☆

وہ اگلی صبح بچوں کو اسکول جانے کے لیے تیار کر رہی تھی جب عادل نہا کر تولیے سے سر رگڑتا باہر نکلا۔

"انہیں آج اسکول نہ بھیجو۔" اس کی انوکھی فرمائش پر وہ حیرانی سے عادل کا منہ تکنے لگی۔ عادل اور بچوں کو اسکول سے چھٹی کروانے کا کہے۔

"کیا مطلب؟ آج ہفتہ ہے۔ کل ویسے ہی سنڈے ہے تو چھٹی کیوں؟" وہ رمنا کی پونی بدستور بناتے ہوئے بولی۔

"بھئی۔ میں آج انہیں اپنے ساتھ لے کر جاؤں گا۔"

وہ الماری سے اپنے کپڑے نکالنے لگا۔

"کیا کوئی جلوس ہے جس میں بچے اسکول کی کتابیں اور دودھ کی بوتلیں ہاتھ میں لے کر احتجاجی ریلی نکالیں گے۔" وہ چڑ کر بولی۔

"ایسا بھی ہو جائے تو کوئی حیرانی کی بات نہیں، جس طرح کے حالات جا رہے ہیں۔ بچوں عورتیں سب کو نکلنا پڑے گا، خواہ احتجاج کے لیے نکلیں یا اپنا وجود منوانے۔" وہ کپڑے اٹھائے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

"کیا صبح صبح اپنی فلاسفی جھاڑنی شروع کردی ہے۔ کیا آج اخبار کی ڈیوٹی گھر کرنے کا ارادہ ہے۔" وہ بچوں کا آدھا ادھورا بنا ناشتہ تیار کرنے کچن کی طرف بھاگی۔

"دیکھو میری بات غور سے سنو۔" وہ عادل اور بچوں کا ناشتہ لے کر کچن سے آئی تو عادل اور بچے تیار تھے۔

"میں ان چاروں کو گھر کے پاس گورنمنٹ کے جو بوائز اور گرلز اسکول ہیں۔ ادھر داخل کروانے جا رہا ہوں۔" وہ بولا ہی تھا کہ سائرہ کے ہاتھ سے ٹرے چھوٹتے چھوٹتے رہ گئی۔

"کیا مطلب؟ کیا مذاق ہے یہ صبح صبح۔" وہ برا مان کر بولی۔

"بیوی! جتنی چادر ہو اتنے پیر پسار نے چاہئیں اور تم بھول رہی ہو، میں اور تم بھی ان ہی ٹاٹوں والے سرکاری اسکولوں سے پڑھے ہوئے ہیں۔ اب ہم لوگوں کے دماغ میں جانے کون سا انگریزی کا کیڑا سمایا ہے۔ اپر کلاس کی نقالی کے چکر میں ہم اپنی چال بھی بھول رہے ہیں، محض انگریزی سیکھنے کے لیے تو تم فکر نہ کرو ان شاء اللہ میرے بچے انگریزی میں نہ تو کبھی فیل ہوں گے نہ بولنے میں کسی سے پیچھے رہیں گے، ان کی انگلش کی ذمہ داری میری۔"

وہ ناشتے کی ٹرے اپنی طرف کھسکا کر ناشتہ شروع کرنے لگا۔ بچے دلچسپی سے باپ کی باتیں سن رہے تھے۔

"مگر کیوں؟ کیوں ان ٹاٹوں والے خستہ حال، ڈنڈا بردار استادوں والے اسکولوں میں مَیں اپنے بچوں کو بھیجوں پھر وہاں کا ماحول۔ ہرگز نہیں، میں یہ نہیں ہونے دوں گی۔" وہ ایک دم سے مشتعل ہوگئی۔

"تو کیا اَن پڑھ رکھو گی انہیں؟" وہ سنجیدگی سے بولا۔

"حسین! دیکھو بیچے انکل تیار ہو گئے ہیں تو کہو، میں آ رہا ہوں۔" اس نے بچوں کو اِدھر اُدھر کرنے کی غرض سے کہا۔

"کیوں اَن پڑھ رکھوں گی۔" وہ چمک کر بولی۔

"اتنی فیس ہم افورڈ نہیں کر سکتے پھر وین کا کرایہ بچے گا، یہ اسکول گھر کے قریب بھی ہے اور اب وہاں بھی آکسفورڈ اور کیمبرج کا سلیبس پڑھایا جاتا ہے۔ انگلش میڈیم اردو میڈیم دونوں ہیں اور دیکھو جو لوگ سرکاری اسکولوں میں پڑھتے ہیں وہ خدانخواستہ عیب دار ہو جاتے ہیں نالائق بدمعاش یا بے کار ہو جاتے ہیں۔ یہ صرف ہماری غلط سوچ ہے جس نے ان انگلش اسکولوں والے مگرمچھوں کو شیر کیا ہے انگریزی کا ہوا، بہترین ماحول کا جھانسا، شاندار ڈگری کا لالچ، اور کھپت یہاں کیا ہے۔ معلوم ہے نا تمہیں، ایم بی اے شاندار پرائیویٹ کالجز اور اداروں سے ماسٹرز ڈگری لینے والے چار چار ہزار کی نوکری کے لیے جوتیاں چٹخاتے پھر رہے ہیں۔"

"کیا اس خوف سے کہ کل ان کو اچھی جاب نہیں ملے گی، انہیں اچھی تعلیم سے محروم کر دیں۔" وہ شکستہ لہجے میں بولی۔

تم سے کس نے کہا کہ گورنمنٹ اسکولوں میں اچھی تعلیم نہیں اچھا چلو یوں کہتے ہیں، انہیں ان اسکولوں میں ڈال دیتے ہیں۔ ساتھ تمہاری اپنی تسلی کے لیے اچھی ٹیوشن مشکل سبجیکٹس کی رکھوا دیتے ہیں پھر کالج تو آگے جا کر بھی گورنمنٹ کے انڈر ہی آجاتے ہیں۔ میں اور جاوید بھائی کل جا کر سکول میں بات کر آئے تھے۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں اول تو کورس اتنا مختلف ہے نہ مشکل، انہیں ہم کور کروالیں گے۔ کم سے کم ان عفریت جیسی فیسوں سے تو نجات ملے گی۔"

وہ سب کچھ طے کیے بیٹھا تھا۔ سائرہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ نظروں کے سامنے گورنمنٹ اسکولوں کے بڑے بڑے سال خوردہ بوسیدہ کمرے، ٹوٹا پھوٹا فرنیچر، جالے لگی اونچی دیواریں اور چھتیں، سیلن اور بو، ٹوٹے پھوٹے فرش پر بچھے پھٹے پرانے ٹاٹ اور ان پر بیٹھے اس کے نازک مزاج بچے اور ہیبت ناک شکل اور تیور والے غصیلے استاد...... بات بات پر مولا بخش کا بے دریغ استعمال کرنے والے۔

"دیکھو ہر بات کے لیے حکومت پر قناعت کرنا، ہاتھ پیر چھوڑ کر صرف آسمانی امداد کا منتظر رہنا درست نہیں۔ حالات جو جا رہے ہیں اس کی روشنی میں ہمیں کچھ جرأت مندانہ فیصلے کرنے ہوں گے۔ انگلش اسکولوں کے ان منہ زور اخراجات والے دیوؤں کو ہم نے خود ہی بے لگام کر رکھا ہے، خود کو گریڈز اور انگلش میں عبور حاصل کرنے کی کمزوری ان کے ہاتھ دے کر تمام دنیا اور یورپی ممالک میں امراء، وزراء، صدور اور وزیر اعظموں کے بچے گورنمنٹ کے اسکولوں میں پڑھتے ہیں۔ ہمارے ہاں اگر ان اسکولوں کا ویسا معیار نہیں تو کیا ہوا ہمیں کوشش تو کرنی چاہیے پھر اس روز تم ہی کہہ رہی تھیں۔ حسن حسین کو میتھس اور انگلش کے لیے ٹیوشن کی ضرورت ہے اگر اتنے مہنگے اسکولوں میں ڈال کر بھی انہیں ٹیوشن ہی پڑھانی ہے تو پھر کیا فائدہ، تم فکر نہ کرو ان شاء اللہ نہ تو یہ بگڑیں گے نہ نالائق ہوں گے اور جب نالائق ہی نہیں ہوں گے تو استاد کیوں ان پر تشدد کریں گے۔ ابھی پندرہ بیس دن انہیں بھیج کر دیکھتے ہیں نہ مائنڈ بنا تو چھٹیوں کے بعد سوچ لیں گے۔ چلو بچو......" اس نے چائے کا آخری گھونٹ بھرا اور بچوں کو لے کر سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔

وہ حیران پریشان، گم صم سی چند قدم ان کے پیچھے چلی اور پھر رک گئی۔

اسی وقت نیچے سے منزہ باجی اسے آوازیں دینے لگیں تو وہ دل برداشتہ سی نیچے اتر گئی۔

ان کا اور اس کا غم صدمہ مشترکہ تھا۔

ان دونوں انقلابیوں کے اس اچانک فیصلے نے دونوں کی ممتا کو تڑپا کر رکھ دیا تھا مگر بے بسی ایسی تھی کہ کھل کر احتجاج بھی نہیں کر سکتی تھیں۔ احتجاج کی صورت میں اتنی موٹی فیسوں کا انتظام کہاں سے کیا جاتا۔

اور مزے کی بات بچے جب لوٹے تو خوش تھے ان کے خدشات کے برعکس۔

"ماما اتنا برا اسکول تو نہیں تھا اور وہ جو آپ کہے جا رہی تھیں؟" حسن بھول گیا۔

"ٹاٹ۔" حسین نے لقمہ دیا۔

"نہیں ٹاٹ۔" وہ آہستگی سے بولی۔

"کچھ بھی نہیں تھا۔ ڈیسک تھے اور چیئرز تھیں۔ ٹیچرز تو اچھی ہیں بس کلاسز تھوڑی گندی تھیں اور بچے بہت زیادہ مگر ادھر کھیل کا گراؤنڈ اتنا بڑا ہے ہمارے اسکول میں تو بالکل چھوٹا تھا، وہ بھی دو دو کلاسوں کی بریک ملتی تو تھوڑا نکل سکتے تھے ورنہ تو وہ اسکول اس اسکول کے مقابلے میں بہت تنگ اور چھوٹا تھا، نیچی چھتوں والا اور ماما۔"

حسن سانس لینے کے لیے رکا۔

"وہاں لائٹ گئی تو پتا بھی نہیں چلا۔ اتنے بڑے بڑے کمرے اور کھڑکیاں خوب ہوا آ رہی تھی اور ہمارے سائنس اور میتھس کے ٹیچرز پاپا اور انکل جاوید کے دوست بھی ہیں اور ان دونوں کی تعریف بھی کر رہے تھے کہ سب لوگوں کو ان بڑے اسکولوں کی بڑی بڑی فیسوں سے بچنے کے لیے بچوں کو ان ہی اسکولوں میں داخل کرانا چاہیے تو ماما آپ ٹینس نہ ہوں۔ ہم پڑھ لیں گے پھر وہ اسکول اتنا دور تھا وین والے انکل ہمیں مرغوں کی طرح وین میں ٹھونستے تھے اور ایک گھنٹہ پہلے نکلو صبح اور ایک گھنٹہ چھٹی کے بعد لیٹ پہنچو ادھر تو ہم سات منٹ میں گھر بھی پہنچ گئے۔" بچے بہت پُرجوش تھے۔ وہ چپ ہی رہ گئی۔

"دیکھو میری جان! اگر اپنا گھر بنانا ہے، ان بچوں کو اچھا فیوچر دینا ہے ایک باعزت زندگی تو تھوڑی سمجھ بوجھ سے چلنا پڑے گا۔ ہمارے معاشرے میں بھیڑ چال کا رواج ہے۔ ایک طرف جو چلتا ہے، سارا معاشرہ اس کے پیچھے دوڑنے لگتا ہے چاہے وہ رستہ اسے سوٹ کرے یا نہ کرے...... ٹھیک ہے، ہم انگلش اسکولوں کی فیس افورڈ نہیں کر سکتے تو غمگین ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ بچوں کو گھر بٹھا لیں یا ورکشاپوں میں ڈال دیں۔ جہالت میں رکھنے سے اچھا ہے انہیں تعلیم تو دیں۔ پانچ ہزار فیسیں اور وین کا کرایہ میں

افورڈ نہیں کرسکتا۔"

وہ اس کا لحہ بہ لحہ غمگین سے سنگین ہوتا چہرہ دیکھ کر آخر میں کچھ بے لحاظ سا ہو کر بولا تھا۔

منزہ کا اور اس کا یہ والا غم ایک تھا اور دونوں ہی بے بس تھیں۔ کس ماں کی خواہش نہیں ہوتی کہ اس کے بچے اعلیٰ ترین تعلیمی اداروں میں تعلیم حاصل کریں مگر جہاں سوال فرد ہی نہیں خاندان کی بقا کا آجائے وہاں کچھ تھوڑے "کم" پر سر تسلیم خم کرنا ہی پڑتا ہے۔

یہ ایک ناقابل برداشت کڑوا گھونٹ تھا جو اسے بالآخر پینا ہی پڑا۔ پانچ ہزار کی بچت سے ان کے گھر کا بجٹ کتنا متوازن ہوسکتا تھا۔ یہ احساس تو خوش گوار تھا مگر بچے سرکاری اسکول میں، یہ خیال ہی کسی گالی کی مانند محسوس ہو رہا تھا۔

"ضروری ہے کہ ہم ہر خاص و عام کو مطلع کرتے پھریں کہ ہمارے بچے سرکاری اسکول میں پڑھ رہے ہیں۔ عادل کی بات درست ہے۔ چھٹیاں ہیں اس دوران کیا پتا حالت بہتر ہو جائیں تو ہم جلد ہی انہیں اچھے اسکولوں میں دوبارہ سے داخل کروادیں۔"

اس نے اس آخری خیال سے خود کو بہلایا۔

"سائرہ! یہ سرمایہ دار طبقہ ہمارا استحصال کر رہا ہے کس طرح، ہم سمجھ ہی نہیں سکتے۔ اچھی تعلیم، روشن دماغ، بہترین زبان کا لالچ دے کر۔ میں اپنے کتنے ایسے دوستوں کو جانتا ہوں جو اعلیٰ تعلیمی اداروں میں بڑی بڑی فیسیں دے کر پڑھے ہیں مگر زبان و بیان پر عبور تو کیا انہیں اپنا مدعا بھی ڈھنگ سے بیان نہیں کرنا آتا نہ بولنا آتا ہے نہ لکھنا۔ اردو سے انگلش میڈیم کے چکر نے دور کردیا اور انگلش کا وہ حال ہے آدھا تیتر آدھا بٹیر...... کوا چلا ہنس کی چال، اپنی چال بھی بھول گیا۔ کیا یہ بہتر نہیں ہم اپنی حیثیت کو اپنی چادر میں رہتے ہوئے اپنے بچوں کو اسی میڈیم کے ذریعے تعلیم دیں اور گھر کے بہترین ماحول سے ان کو بیدار مغز کریں۔ باشعور بنائیں۔ سلجھے ہوئے مہذب اور یہ ایک جنگ ہے لوئر مڈل کلاس کی اور ہم اس کلاس کے نمائندے ہیں اور ہمیں آگے بڑھ کر اس جنگ کے خلاف علم بلند کرنا ہوگا۔ خود انحصاری کا ہتھیار اٹھانا ہوگا۔ کیا اس میں میرا ساتھ دوگی؟"

اور وہ سر جھکائے ان گھڑیوں کو کوس رہی تھی جب ابا نے ایک رپورٹر، محض اخباری رپورٹر سے اس کی گریجویٹ ڈگری اور مہذب سلجھا ہوا شریف ہونے کی بنا پر بطور داماد قبول کرلیا تھا۔

مگر عادل کی باتیں ایسی غلط بھی نہ تھیں، اس کا اندازہ اسے آنے والے چند دنوں میں ہوگیا جب وین والے کے آنے کی ٹینشن اور اس سے پہلے بچوں کو تیار کرنا، ناشتہ کروانا، لنچ باکسز تیار کرنا بھاگم بھاگ سیڑھیوں سے ان کے بیگ گھسیٹتے نیچے گیٹ تک چھوڑ کر آنا۔

ایکدم سے سب کچھ پُرسکون ہوگیا۔

بچے اسکول ٹائم سے بیس منٹ پہلے ہی خود تیار ہو جاتے۔ ناشتہ کرتے۔ وہ ان کے لنچ تیار کرتی اور وہ عادل کے ساتھ پیدل ہی نکل جاتے اور دوپہر میں پہلے کے مقابلے میں پون گھنٹہ پہلے ہی گلی کے چند اور بچوں کے ساتھ واپس آجاتے کوئی ساتھ نہ بھی ہوتا تو جاوید بھائی کے بچے بھی تھے اور وہ تو ابھی بھی اکثر دوپہر میں جلدی آجاتے تھے، سو خود ہی انہیں اسکول سے جاکر لے آتے تھے۔ اچھی بھلی سردردی سے نجات مل گئی۔

برملا دونوں منزہ اور وہ اس کا زبان سے اظہار تو نہ کرتیں مگر اس کا احساس دونوں کو ہو چکا تھا۔

"واقعی ہمارا معاشرہ سخت بھیڑ چال کا شکار ہے۔ ہمیں اپنے بہت سے فیصلے محض نمود و نمائش کے چکر میں کرنے پڑ جاتے ہیں ورنہ اس دکھاوے سے ہٹ کر بھی بہت سے راستے ہوتے ہیں۔ صرف ہمیں اپنی سوچ کو تھوڑا معیار" دکھاوے کے معیار" سے نیچے لانا پڑتا ہے۔"

وہ ان تین تیزی سے اُگتے ہوئے پودوں کو پانی دیتے ہوئے سوچ رہی تھی اگرچہ ابھی عادل کو بقایا جات نہیں ملے تھے مگر اس بار بچوں کی فیسیں نہیں جانی تھیں، اس خیال نے ہی اس کی بہت سی پریشانیوں کو ختم کردیا تھا۔

"ارے یہ تو واقعی ہری مرچیں اُگ رہی ہیں۔"

وہ جھک کر اونچی ہوتی ٹہنی کے پتوں میں چھپی ننھی ننھی کونپلوں کو دیکھنے لگی۔

☆

جاوید بھائی کو آج جلسے کے دوران بہت سے وکلاء کے ساتھ گرفتار کرلیا گیا تھا۔

منزہ باجی اور بچوں کا رو رو کر برا حال تھا۔

وہی ان کے لیے کھانا بنا کر نیچے لے کر گئی اور زبردستی منتیں کر کے دو دو لقمے کھلائے۔ عادل تو چند دوسرے کولیگز کے ساتھ ان کی رہائی کے لیے نکلے ہوئے تھے۔

رات کیسی سخت تھی۔

بار بار لائٹ چلی جاتی۔ گرمی، حبس، پریشانی، بے بسی اور بحیثیت عوام اپنی بے وقعتی کا شدید احساس۔

''شاید جاوید ٹھیک ہی کہتے ہیں، انصاف سب کو ملے گا تو سب گھروں میں خوشیاں ہوں گی۔ روشنی ہوگی آج ...... آج ہمارے گھر میں اندھیرا ہوا ہے تو سائرہ! مجھے احساس ہوا ہے کہ یہ لوگ کس کاز، کس مقصد کے لیے اپنی جانوں کی بازی لگا رہے ہیں ہم سب نے دوسروں کے متعلق سوچنا چھوڑ دیا ہے صرف اپنے متعلق سوچتے ہیں۔ اپنی ہی حاجتیں اپنی ہی ضرورت ہمارے مدنظر ہوتی ہیں۔ اسی لیے تو ہمارے معاشرے میں اندھیرا، حبس اور گھٹن بڑھتی جا رہی ہے۔ آگ دور سے اس وقت تک ہی روشنی لگتی ہے جب تک یہ ہمارے گھروں تک نہ آ پہنچے۔ معاشرہ بے انصافی کا ظلم سہتے سہتے اس آخری حد کو چھو ہی گیا کہ اس آگ کی لپٹوں میں ہمارے گھر بھی آ گئے تو سوچو جن کے گھر والے، پیارے بیٹے، شوہر، باپ، بھائی برسوں سے مہینوں سے لاپتہ ہیں جن کا کچھ علم ہی نہیں زندہ بھی ہیں کہ نہیں۔ سوچو ان کی صبح کیسی ہوتی ہوگی۔ ان کی رات کیسی ہوتی ہوگی یا خدا ہمیں معاف کر دے ہمیں بخش دے ہماری کوتاہیوں اور کوتاہ بینیوں کو۔ ہماری خود غرضی اور نفسا نفسی کو کہ ان لوگوں کے درد کو ہم نے محسوس نہیں کیا تو آج اس درد کی چبھن ہمارے بدنوں میں اترنے لگی ہے۔ معاف کر دے میرے مولا۔''

پہلے تو وہ سمجھی شاید صدمے سے باجی منزہ کے دماغ کی کوئی رو بھٹک گئی ہے مگر پھر ان کی سچی، حقیقت بھری باتوں سے اس کی سوچوں کو بھی جھٹکا سا ہوا۔

وہ کتنا دوسروں کے متعلق سوچتی ہے۔ اسے بھی تو ہر گھڑی اپنے کچن، اس میں پکنے والی ہانڈی آٹے اور چاول کے پورے ہونے کی فکر ہوتی ہے۔ اس نے کبھی نہیں سوچا، ساتھ والے گھر میں آج چولہا بھی جلا ہے یا نہیں۔

دیواریں گھروں کے بیچ نہیں اٹھیں۔ دلوں میں بھی اٹھ گئی ہیں، اور یہ دیواریں دن بدن موٹی ہوتی جا رہی ہیں موٹی ......

''ماما! چھپکلی دیکھیں کتنی موٹی؟''

رمنا نے اسے گہری سوچ سے چونکایا تھا۔ وہ گہرا سانس لے کر رہ گئی۔

جاوید بھائی تیسرے دن گھر آ گئے تھے۔ بہت کمزور بیمار سے وہ تین ہی دنوں میں کتنے بدلے ہوئے لگ رہے تھے مگر ان کا عزم جیسے اور بھی توانا ہو گیا تھا۔

''نہ ہم جھکیں گے نہ بکیں گے، چیف کو بحال کرا کے دم لیں گے۔''

وہ پُرجوش سے ملنے آنے والوں سے خوب اونچا اونچا کہہ رہے تھے اور پہلی بار سائرہ کو منزہ کے چہرے پر انوکھی سی فخریہ چمک پھوٹتی محسوس ہوئی۔

وہ عورتیں خوش قسمت ہوتی ہیں جن کے مرد کسی اعلیٰ مقصد کے لیے کھڑے ہو جائیں اور ہم اپنی اس خوش بختی کو سمجھ نہیں پاتیں اسے مسلسل اپنی بدقسمتی گردانتی رہتی ہیں اور ان کے حوصلے پست کرتی رہتی ہیں، اسی لیے تو ہمارا معاشرہ تنزلی کی طرف جا رہا ہے کہ ہم حق کی آواز بلند کرنے والوں کا نہ تو ساتھ دیتے ہیں نہ ان کی ہمت بندھاتے ہیں۔ لڑائی کے خلاف کوئی آواز نہیں اٹھاتا۔ سب کولہو کے بیل کی طرح آنکھوں پر خول چڑھائے ایک ہی محور کے گرد گھومنا چاہتے ہیں تو نتیجہ کیا نکلے گا یہی ابتری، بے سکونی، سب کچھ غلط سلط، الٹا سیدھا، مکس ہونے لگے گا تو مشکلات بڑھتی جائیں گی۔ پہلے افراد پھر غول کے غول ان مشکلات کے چنگل میں پھنستے جائیں گے۔''

بیرسٹر ریاض کی مسز عورتوں کے درمیان بیٹھی بڑے مدبرانہ انداز میں کہہ رہی تھیں اور عورتیں عقیدت بھرے انداز میں انہیں سن رہی تھیں۔

سائرہ چپکے سے اٹھ کر اوپر آ گئی۔ اسے ابھی رات کا کھانا بھی تیار کرنا تھا شاید نیچے بھی بھیجنا پڑے۔

عادل کا کچھ پتا نہیں تھا۔ جاوید بھائی کو گھر چھوڑ کر فوراً ہی باہر چلے گئے تھے۔ اب تک تو انہیں آ جانا چاہیے تھا، وہ اوپر آ کر گھڑی دیکھتے ہوئے متفکر سی ہوئی۔

حسن اوپر بیٹھا اپنا ہوم ورک کر رہا تھا۔ عبیر اس کے پاس ہی کھیل رہی تھی۔

''ماما! لائٹ کتنے بجے جانی ہے میرے ابھی دو کام باقی ہیں۔''

اسے دیکھتے ہی حسن نے پوچھا تو وہ بھی، ہڑبڑا کر کچن کی طرف بھاگی لائٹ جانے میں فقط پچیس منٹ تھے۔

''یہ کر لو گی؟''

وہ بیٹھی بچوں کو ہوم ورک کروا رہی تھی، اس ہفتے ان کے اسکول میں چھٹیاں ہو جانی تھیں۔

''کیا ہے؟''

عادل نے ایک پیپر سا اس کے آگے کیا۔

''سروے ہے۔ خواتین سے کرنا ہے کہ انہیں پہلے مہنگائی اور دوسرے مسائل کا حل چاہیے یا آزاد عدلیہ کی بحالی؟''

''چلو مجھے بھی اپنے دھندے میں لگا لیں۔'' اس نے سروے ایک نظر دیکھ کر منہ بنا کر کہا۔

''پیسے ملیں گے۔ دیکھ لو۔''

عادل نے اسے چمکارا اور وہ چمک بھی گئی۔

''کتنے؟''

''یہ تو کام پر ڈیپنڈ کرتا ہے۔ اصل میں ہمارے ویکلی میگزین کی عارفہ بھٹی ایک ماہ کی چھٹی پر چلی گئی ہیں۔ کچھ کام تو بانٹ لیے گئے۔ یہ مڈل کلاس کا سروے میرے حصے میں آیا۔ میگزین کا یہ صفحہ چونکہ خواتین کا ہے، اس لیے میں نے سوچا تم سے کروا لیتا ہوں۔''

''کتنے لوگوں سے سروے کرنا ہے؟''

اسے کچھ دلچسپی محسوس ہوئی۔

''جتنے زیادہ سے کر سکو۔''

''کتنے دنوں میں؟''

''دو یا تین دنوں میں۔''

''چلیں۔ ٹھیک ہے میں کرلوں گی یوں بھی بچوں کی چھٹیاں پرسوں ہو جائیں گی۔ حسن اور حسین بھی میرے ساتھ چلیں گے۔''

اسے اس کام میں تھرل سی محسوس ہوئی تھی تب ہی ذمہ داری لے لی۔

اور نتائج اس کی توقع کے بالکل برعکس تھے۔

وہ تو یہ سمجھی تھی کہ زیادہ تر خواتین اس کی مانند ہی کہیں گی۔

کہ پہلے مہنگائی اور دوسرے مسائل حل کیے جائیں عدلیہ وغیرہ بعد میں آزاد ہوتی رہے گی، مگر ایسا نہیں تھا......

لوگوں کی سوچ اتنی تیزی سے اور اتنی زیادہ تبدیل ہوگئی ہے، اسے اندازہ نہیں تھا۔

لوگ غنڈوں اور ڈاکوؤں کے ہراس سے اپنی جان کے خوف سے اتنے پریشان تھے کہ وہ مہنگائی کے ہاتھوں مرنے پر بھی تیار تھے کہ آزاد عدلیہ کی بحالی پہلے چاہتے تھے جو انہیں اپنے گھروں میں مطمئن زندگی بسر کرنے کی ضمانت دے سکے۔ پہلی بار...... پہلی بار تو

ان ساٹھ سالوں میں لوگوں نے حقیقی اور سچے انصاف کی جھلک دیکھی تھی، جس نے انہیں دیوانہ سا کر دیا تھا صرف ایک جھلک نے۔

جیسے کوہ طور پر جلوہ نور کی ایک جھلک نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بے تاب کر دیا تھا، بے ہوش...... اس طرح سچے انصاف کی ایک جھلک سے لوگوں کو اپنے ملک کی قسمت بدلتی نظر آرہی تھی تو وہ ہر قربانی دینے کو تیار تھے، اور اگلے ہفتے جب عادل نے اسے پانچ ہزار روپے لا کر دیے تو وہ حیران سی ہوگئی۔

''یہ کس بات کے؟''

''تمہاری محنت کے جو تم نے سروے کے لیے کی۔''

عادل کے جواب پر اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔

''کیا واقعی!'' اسے یقین نہیں آرہا تھا۔

''میں مذاق نہیں کر رہا ہوں اور دیکھو، تم نے صرف سروے نہیں کیا بلکہ اپنے دل کی کھولن بھی تند و تیز جملوں کی صورت تبصرے میں کی ہے۔ ایڈیٹر صاحب تو محظوظ ہوئے اور لوگ خوش کہ ان کے دل کی جلن کو تم نے زبان دے دی سروے کی محنت کے تو چار ہزار تھے۔ ایک ہزار اس تبصرے کے علیحدہ سے دیے ہیں ایڈیٹر صاحب نے اور کہا ہے اس طرح کا ایک سروے کسی بھی ہاٹ ٹاپک پر ہر ہفتے کیا جائے جیسے آج کل اسکولوں میں چھٹیاں ہونے والی ہیں تو کیا بچوں کو سمر کیمپ جوائن کرنا چاہیے یا گھر پر ان چھٹیوں کو کارآمد بنانے کی کوشش کرنے میں والدین کو ان کی مدد کرنی چاہیے۔''

''یہ کیا ہے؟'' وہ روپے مٹھی میں دبا کر گھومی۔

''تمہارے اگلے سروے کا موضوع۔'' وہ بے نیازی سے بولا۔

''ہرگز نہیں۔ میں نہیں کروں گی، ڈور ٹو ڈور جانا آسان ہے پھر ایسی بدماغ خواتین بھی ہوتی ہیں۔ دروازہ کھولتے ہی ہاتھ میں کاغذ فائل دیکھ کر ٹھک سے دروازہ ہمارے منہ پر بند کر جاتی ہیں۔''

اسے پچھلے سروے کے دوران ہونے والی عزت افزائی، کے دن یاد آنے لگے۔

''دیکھ لو گھر بیٹھے...... میرا مطلب ہے، باس کی گرم و ترش جھیلے بغیر ایک اچھی رقم کما لو گی۔''

عادل کا تیر ٹھیک نشانے پر بیٹھا۔ وہ اگلے ہی لمحے ہتھیار ڈال چکی تھی۔

اسے تو رات بھر اس خوشی میں ڈھنگ سے نیند بھی نہیں آئی کہ وہ پانچ ہزار روپیہ یکمشت کما چکی ہے۔

وہ جو بی اے کے بعد ہر قسم کے تعلیمی کام سے خود کو فارغ سمجھ چکی تھی۔ اس ذرا سی حوصلہ افزائی سے بہت آگے تک کا سوچنے لگی تھی۔

اپنا گھر، جس مقصد کو پانے کے لیے وہ دونوں یہ جدوجہد بھری زندگی گزار رہے تھے، منزل اسے پاس آتی دکھائی دینے لگی تھی۔

"کیا ہو رہا ہے بھئی؟"

وہ نہا کر بال برش کر رہی تھی کہ عادل اندر داخل ہوا۔

"کچھ نہیں۔ ابھی چھت دھو کر آئی ہوں۔ گرد سے بھتنی بن گئی تھی۔ چھٹیوں میں یہ عذاب ہوتے ہیں، سارا دن چڑیا گھر کے بندروں کی طرح گھر میں اچھل کود مچاتے ہیں۔ چھت پر بیٹ بال کھیل رہے تھے۔ ایک ساتھ دونوں گملے توڑ دیے جس میں ابھی ......"

وہ غصے اور صدمے سے بولتی چلی گئی۔

"جس میں ہری مرچیں اور دھنیا لگ رہا تھا۔"

عادل جلدی سے بولا تو وہ پلکیں جھپکنے لگی۔

"تو اور کیا۔ مرچیں تو اچھی خاصی بڑی ہو رہی تھیں اور ان بدتمیزوں نے ...... کیا کرتی سوائے چیخنے چلانے کے۔"

وہ گیلے بال برش کر کے کرسی پر بیٹھ گئی۔

"چلو تم ریڈی ہو تو ذرا باہر کا چکر لگا آئیں۔"

عادل کی آفر پر وہ بے ہوش ہوتے ہوئے بچی۔

"ہاں بچے تو نیچے کھیل رہے ہیں۔ ہم دونوں چلتے ہیں۔"

عادل نے کچھ ایسے محبوبانہ انداز میں کہا کہ اس نے اٹھنے اور ساتھ چلنے میں ذرا دیر نہ کی۔

"جانا کہاں ہے؟"

اگرچہ ابھی شام زیادہ نہیں ہوئی تھی پھر بھی کچھ موسم بہتر ہو رہا تھا۔ ہلکے بادلوں کے ساتھ ہوا بھی اڑتی پھر رہی تھی۔

"آؤ تو سہی۔"

وہ اسے اولین دنوں کی طرح بائیک پر اڑائے لے جا رہا تھا۔

"ایں یہ ہم اپنے پلاٹ پر آگئے، ادھر کیوں لے کر آئے؟"

گند کا ڈھیر دیکھ کر دل خراب ہو گیا۔ "لوگوں نے ہمارے تین مرلے کے پلاٹ کو کوڑا دان بنا لیا ہے۔ کتنی مشکلوں سے تو یہ پلاٹ لے سکے ہیں اور چار سال گزر گئے۔ ابھی بننے کا کوئی امکان نظر نہیں آتا۔" پلاٹ کی چار دیواری دیکھ کر اس کے دل میں دبا زخم ہرا ہو گیا۔

"اب وہ دن زیادہ دور نہیں۔ معلوم ہے نا تمہیں۔"

گیٹ کے آگے بائیک روک کر عادل نے کہا اور تالا کھولنے لگا۔

اسے پہلا قدم رکھتے ہی زوردار جھٹکا سا لگا تھا۔

اس نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ کسی اور کے کسی پلاٹ میں تو نہیں آگئے۔ چھوٹی سی چار دیواری میں رنگوں کی بہار تھی۔

گیٹ کے دونوں جانب پیڑ لہلہا رہے تھے تو دیواروں کے ساتھ پنیریاں بچھی تھیں۔

"یہ بینگن کا پیڑ ہے اور یہ امرود کا۔ یہ آم کا اور یہ لیموں کا۔ ادھر ٹینڈے اُگے گے اور ادھر آلو اور گوبھی۔ دیکھو، جب تک ہم گھر نہیں بناتے یہ زمین ہمارے کام آئے گی اور جب اتنے تنگ حالات ہوں تو آدمی کو اپنے وسائل کو بہتر طریقے سے استعمال کرنے کی کوشش کرنی چاہیے کیسا؟"

عادل کی بات پر اس نے سرخ تمتماتے مشکور چہرے کے ساتھ اسے دیکھا ورنہ تو جب بھی ادھر آتی تھی، ناک اور منہ کے آگے دوپٹے کا گولا بنانے کے باوجود ابکائی آتی تھی۔

"اب تمہیں تاج دین سے مرچیں مہنگی بیچنے پر چخ چخ نہیں کرنا پڑے گی بلکہ راز کی بات بتاؤں، اپنی منزہ باجی کو اِدھر سے کوئی نہ کوئی سبزی گفٹ کر کے انہیں زیر بار کر سکتی ہو، اور ہم چھٹی کا دن ادھر کتنے مزے میں گزار سکتے ہیں۔"

عادل نے ایک آئیڈیل ہم سفر کے خاکے میں جیسے رنگ بھر دیے تھے ورنہ تو وہ اس کے بحیثیت رپورٹر بہت عاجز تھی۔

"میری جان! مسائل اتنے گمبھیر ہوتے نہیں جتنے ہم سوچ سوچ کر بنا لیتے ہیں ورنہ تو ایک ہنسی ایک مسکراہٹ سے ان مسائل کو ہلکا پھلکا بنایا جا سکتا ہے بلکہ میرے نزدیک تو

دور بھگایا جاسکتا ہے۔"

وہ واپسی پر اس سے کہہ رہا تھا وہ سر ہلائے گئی۔ اسے اب لگ رہا تھا مشکلوں کے دن تھوڑے ہیں۔

"افوہ! یہ چائے کی پتی کہاں ہے؟"

گھر آ کر وہ کپڑے استری کرنے لگ گئی جبکہ عادل دونوں کے لیے چائے بنانے لگا۔ وہ جب بھی مہربان ہوتا تو اسی انداز میں ہوتا تھا۔ وہ اندر آ کر جھنجلا کر پوچھ رہا تھا۔ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"میں کیا پوچھ رہا ہوں۔ چائے کی پتی ......"

وہ اس کی ہنسی پر چڑ کر بولا۔

"عادل ڈیئر! ہر مسئلے کا حل ایک ہنسی ایک مسکراہٹ سے نہ صرف مسئلے کو ہلکا پھلکا بنایا جاسکتا ہے بلکہ دور بھگایا جاسکتا ہے۔ میں اس لیے تو ہنس رہی ہوں کہ پتی ہے نہیں اور پیسے بھی ختم ہیں تو۔"

وہ پھر سے ہنس دی تو عادل اسے گھورتے ہوئے سیڑھیاں اتر گیا تو وہ خود ہی ہنسنے لگی۔

❀